اسلام اور ہماری زندگی

(مجموعہ خطبات و تحریرات)

جلد نمبر ۵

اسلام اور خاندانی نظام

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے ہم افراط و تفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

ادارہ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

اسلام اور ہماری زندگی

اسلام اور خاندانی نظام

جلد ۵

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات وتحریرات

جلد ۵

اسلام اور خاندانی نظام

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز، بکسیلرز، ایکسپورٹرز

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور
فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ ۳۷۳۲۳۴۱۲ فیکس ۳۷۳۲۲۷۸۵-۴۲-۹۲

★ ۱۹۰، انارکلی، لاہور پاکستان
فون ۳۷۲۴۳۹۹۱، ۳۷۳۵۳۲۵۵

★ موہن روڈ، چوک اُردو بازار، کراچی
فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

نام کتاب

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعۂ خطبات و تحریرات

جلد ۵

اسلام اور خاندانی نظام

اشاعت اول

جمادی الثانی ۱۴۳۱ھ — جون ۲۰۱۰ء

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

۱۴- دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور فون ۳۷۳۵۳۲۵۵-۳۷۲۳۳۹۹۱ فیکس ۳۷۳۲۴۷۸۵-۴۲-۹۲+

۱۹۰- انارکلی، لاہور- پاکستان ___ فون ۳۷۲۳۳۹۹۱ - ۳۷۳۵۳۲۵۵

موہن روڈ، چوک اردو بازار، کراچی- پاکستان ___ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

www.idaraeislamiat.com

E-mail:idara.e.islamiat@gmail.com

ملنے کے پتے

ادارۃ المعارف، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر۱۴

مکتبہ معارف القرآن، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر۱۴

مکتبہ دار العلوم، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر۱۴

ادارۃ القرآن و العلوم الاسلامیہ، اردو بازار، کراچی

دار الاشاعت، اردو بازار، کراچی نمبر۱

بیت القرآن، اردو بازار، کراچی نمبر۱

بیت العلوم، نابھہ روڈ، لاہور

فہرست مضامین

نکاح کے آداب واحکام

خاندانی اختلافات کا پہلا حل باہمی الفت و محبت ۲۵۹

نکاح کے آداب واحکام ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ، وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَنَبِيَّنَا وَحَبِيْبَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

الحمدللہ ابھی ایک عزیز دوست کے نکاح کی تقریب میں ہم سب کو شمولیت کی سعادت حاصل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اس نکاح کو مبارک فرمائے، آمین۔ اس نکاح کا خطبہ پڑھتے وقت خیال یہ ہوا کہ آج اس موقع کی مناسبت سے بھی اور معاشرے کی ضرورت کے لحاظ سے بھی آج کچھ باتیں نکاح کے خطبہ سے متعلق بیان ہو جائیں۔ کیونکہ یہ خطبہ جو ہر نکاح کے وقت پڑھا جاتا ہے، اس کا ایک بڑا عظیم مقصد ہے، اور ہم عام طور پر اس مقصد کو بھلائے ہوئے ہیں، بلکہ خطبہ نکاح کا پڑھنا ایک رسم بن کر رہ گیا ہے، جس میں نکاح کے وقت ایک نکاح خواں کو بلایا جاتا ہے۔ وہ خطبہ کے الفاظ پڑھ لیتا ہے۔ لوگ سن لیتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سارے خطبہ کا اور جو آیات کریمہ اس خطبہ میں تلاوت کی جاتی ہیں، ان کا ایک عظیم مقصد ہے جس میں ہم سب کے لئے نکاح سے متعلق بھی اور عام زندگی کے بارے میں بھی بہت بڑا سبق اور بہت بڑا پیغام دیا گیا ہے۔

عہد نبوی ﷺ میں نکاح کے وقت نصیحت

حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں طریقہ یہ تھا کہ جب آپ ﷺ خطبہ نکاح دیتے، تو اس

☆ اصلاحی خطبات (۱۱/۵۲ تا ۸۱)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی، حضرت شیخ الاسلام مدظلہٗ نے یہ بیان جناب حنیف کمال صاحب کے نکاح کی تقریب کے موقع پر فرمایا۔

وقت آپ کچھ نصیحت کی باتیں بھی ارشاد فرمایا کرتے تھے، اب نصیحت کا وہ طریقہ متروک ہو گیا ہے، اور صرف خطبہ کی مسنون آیات تلاوت کرنے پر اکتفاء کر لیا جاتا ہے، لہٰذا اس خطبۂ نکاح کی روح کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

نکاح کے وقت خطبہ

نکاح دو افراد کے درمیان ایک سماجی معاہدہ ہے، جس میں طرفین سے ایجاب و قبول ہوتا ہے، مثلاً نکاح خواں جو بیوی کا وکیل اور نمائندہ ہوتا ہے، وہ شوہر سے کہتا ہے کہ میں نے فلاں خاتون کا نکاح تم سے کیا، شوہر کہتا ہے کہ میں نے قبول کیا۔ لہٰذا جیسے خرید و فروخت کے معاہدات میں ایجاب و قبول ہوتا ہے۔ اسی طرح نکاح کے اندر بھی ایجاب و قبول ہوتا ہے۔ لیکن خرید و فروخت میں ایجاب و قبول کرتے وقت خطبہ پڑھنے کی اور قاضی کی ضرورت نہیں، لیکن نکاح کے وقت ایجاب و قبول سے پہلے حضور اقدس ﷺ نے خطبہ پڑھنے کو مسنون قرار دیا۔ اگرچہ اس خطبہ کے بغیر بھی نکاح ہو جاتا ہے، لیکن خطبہ پڑھنا سنت ہے۔

نکاح ایک عبادت ہے

نکاح کے معاہدے میں اللہ تعالیٰ نے دو شانیں رکھی ہیں۔ ایک شان تو ''سماجی معاہدے'' کی ہے، اور دوسری شان ''عبادت'' کی ہے، کیونکہ نکاح بذات خود ایک عبادت ہے، بلکہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نکاح میں معاملے کی شان مغلوب ہے، اور عبادت کی شان غالب ہے۔ بہر حال، اللہ تعالیٰ نے اس نکاح کو ایک عبادت قرار دیا، اور اس کے عبادت ہونے کی وجہ سے اس میں خطبہ پڑھنے کو حضور اقدس ﷺ نے مسنون قرار دیا۔

خطبہ نکاح کی تین جامع آیات

خطبۂ نکاح میں تین آیات پڑھنا مسنون ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ نظر آئے گا کہ ان آیات میں براہ راست نکاح کا کوئی ذکر موجود نہیں، حالانکہ قرآن کریم کی بہت سی آیات ایسی ہیں، جن میں نکاح کا ذکر بھی ہے، اور نکاح کے الفاظ بھی ہیں۔

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے دوسری آیات کو چھوڑ کر ان تین آیات کا خاص طور پر کیوں انتخاب

فرمایا؟ اس کو سمجھنے کے لئے پہلے ان آیات کا ترجمہ دیکھنا مناسب ہے۔

پہلی آیت کا سبق: حقوق ادا کیجئے

پہلی آیت جو تلاوت کی جاتی ہے وہ سورۃ ''نساء'' کی پہلی آیت ہے:

﴿یٰاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا﴾(۱)

اے لوگو! تم اپنے اس پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا، ایک جان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں، اور اسی ایک جان سے ان کی بیوی یعنی حضرت حوا علیہا السلام کو پیدا کیا، اور ان دونوں کے باہمی تعلق سے بہت سے مرد اور عورتیں دنیا میں پھیلائے۔ اور اس اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے حقوق کا مطالبہ کرتے ہو۔ اگر کسی کو دوسرے سے اپنا حق مانگنا ہوتا ہے، تو وہ یہ کہتا ہے کہ اللہ کے واسطے مجھے میرا حق دے دو۔ اس لئے فرمایا کہ جس اللہ کا واسطہ دے کر تم اپنا حق مانگتے ہو، اس سے ڈرو کہ کہیں ان حقوق کی ادائیگی میں اس کے حکم کی کوئی خلاف ورزی نہ ہو جائے۔ اور پھر فرمایا کہ رشتہ داریوں کے باہمی حقوق سے ڈرو۔ تاکہ رشتہ داریوں کے حقوق پامال نہ ہوں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر نگہبان ہے، اور تمہاری ہر نقل و حرکت کو دیکھ رہا ہے۔

دوسری آیت کا سبق: اللہ کو راضی کیجئے

دوسری آیت سورۃ آل عمران کی آیت ہے:

﴿یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾(۲)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، جیسے اللہ سے ڈرنے کا حق ہے۔ اور تمہیں موت نہ آئے مگر اس حالت میں کہ تم مسلمان ہو۔''

اللہ کے فرمانبردار اور اطاعت گزار ہو۔ یعنی ساری زندگی اطاعت گزاری میں صرف کرو۔ تاکہ جب موت آئے تو اس وقت تم اللہ تعالیٰ کے مطیع اور فرمانبردار ہو۔

---

(۱) النساء: ۱

(۲) آل عمران: ۱۰۲

تیسری آیت کا سبق: باہمی معاملہ درست رکھئے

تیسری آیت سورہ احزاب کی ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا﴾(۱)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، تقویٰ اختیار کرو اور سیدھی بات کرو، اگر ایسا کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے لئے تمہارے اعمال میں اصلاح کر دیں گے۔ اور تمہارے سب کام بنا دیں گے، اور تمہارے گناہ معاف فرما دیں گے، اور جو شخص اللہ کی اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرے اس نے بہت بڑی کامیابی حاصل کی''

حضور اقدس ﷺ خطبۂ نکاح میں ان تین آیتوں کو پڑھنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ آپ نے خاص نکاح کے موقع پر ان تین آیات کا کیوں انتخاب فرمایا، جبکہ نکاح سے متعلق اور بہت سی آیات قرآن کریم میں موجود ہیں، اور ان تین آیات میں نکاح کا کہیں ذکر بھی نہیں ہے۔

تینوں آیات میں ''تقویٰ'' کا ذکر

لیکن ان تین آیات میں غور کیا جائے تو یہ نظر آئے گا کہ ان تین آیتوں میں جو چیز قدرے مشترک ہے۔ جس کا تینوں آیتوں میں ذکر ہے۔ وہ ''تقویٰ'' ہے، اور تینوں آیتیں ''تقویٰ'' کے بیان سے شروع ہو رہی ہیں، نکاح کے موقع پر خاص طور پر ''تقویٰ'' کی تاکید اس لئے کی جا رہی ہے کہ لوگ عموماً نکاح کے معاملے کو دین سے خارج سمجھتے ہیں۔ اور اس بارے میں شریعت کے احکام کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ نکاح سے پہلے بھی اور نکاح کے وقت اور نکاح کے بعد بھی ان احکام کی طرف دھیان نہیں کرتے۔ اس وجہ سے نکاح کے موقع پر خاص طور پر اس بات کی تاکید کی جا رہی ہے کہ تقویٰ اختیار کرو۔ کیونکہ اگر غور کیا جائے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ درحقیقت یہ نکاح کا رشتہ اس وقت تک صحیح معنی میں خوشگوار نہیں ہو سکتا جب تک دلوں میں تقویٰ نہ ہو تقویٰ کے بغیر ایک دوسرے کے حقوق صحیح معنی میں ادا ہی نہیں کیے جا سکتے۔

ازدواجی زندگی کے تین مواقع، یعنی ایک نکاح سے پہلے، ایک نکاح کے وقت، ایک نکاح کے بعد۔ ان تینوں مواقع پر ہم نے دین کو پس پشت ڈالا ہوا ہے، بس اتنا ضرور کر لیتے ہیں کہ نکاح

(۱) الاحزاب: ۷۰۔۷۱

کے وقت کسی مولوی صاحب کو بلا کر ان سے آیتیں پڑھوالیں، خطبہ پڑھوا کر نکاح کر لیا۔ لیکن اس نکاح سے پہلے کیا کام کیا، اور عین اس نکاح کے وقت کیا عمل کر رہے ہیں؟ اور نکاح کے بعد کیا کریں گے؟ ان تمام اعمال سے نہ خدا کا کوئی تعلق، اور نہ خدا کے رسول کا کوئی تعلق۔ حالانکہ یہ نکاح ایک عبادت ہے، اور ایک ثواب کا کام ہے۔

نکاح، فطری خواہش پوری کرنے کا آسان راستہ

پھر اللہ تعالیٰ نے شریعت اسلامیہ میں نکاح کو اتنا آسان بنا دیا کہ اس سے زیادہ آسان کوئی دوسرا معاملہ نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ جو دین اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمایا ہے اس میں ہماری نفسیات کی پوری رعایت ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کے دل میں عورت کی طرف اور عورت کے دل میں مرد کی طرف ایک کشش رکھی ہے، اس کشش کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کی فطرت یہ تقاضا کرتی ہے کہ زندگی مرد اور عوت دونوں کے باہمی اشتراک سے بسر ہو۔ بعض مذہب وہ ہیں جنہوں نے یہ کہہ دیا کہ یہ کشش شیطانی خواہش ہے، لہٰذا جب تک اس شیطانی خواہش کو نہیں مٹاؤ گے، اس وقت تک اللہ کا قرب حاصل نہیں ہوگا، چنانچہ ان مذاہب نے ''رہبانیت'' کی بنیاد ڈالی۔ اور یہ کہہ دیا کہ نکاح اور شادی نہ کرو، مجرد زندگی گزارو۔ لیکن اسلام جو دین فطرت ہے، وہ جانتا تھا کہ یہ کشش انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اگر فطرت سے بغاوت کی جائے گی تو یہ فطرت غلط اور ناجائز اور حرام راستے تلاش کرے گی۔ چنانچہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلاً مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً﴾(۱)

''اے نبی ﷺ ہم نے آپ سے پہلے بھی انبیاء بھیجے، اور ہم نے ان کو بیویاں بھی عطا کیں، اور اولاد بھی عطا کی''

لہٰذا بیوی بچوں سے الگ زندگی نہیں گزارنی، بلکہ بیوی بچوں کے ساتھ زندگی گزارنی ہے اس لئے کہ یہ فطرت کا ایک تقاضہ ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس فطری تقاضے کو پورے کرنے کا جائز راستہ اتنا آسان کر دیا کہ اس میں کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں لگائی۔

خطبہ نکاح شرط نہیں، سنت ہے

چنانچہ نکاح کے وقت خطبہ پڑھنا بھی کوئی لازمی شرط نہیں، واجب اور فرض نہیں، البتہ سنت

(۱) الرعد: ۳۸

ضرور ہے۔ اگر دو مرد و عورت بیٹھ کر ایجاب و قبول کر لیں، اور دو گواہ اس مجلس میں موجود ہوں، یا تو دو مرد گواہ ہوں، یا ایک مرد اور دو عورتیں بطور گواہ موجود ہوں۔ تو بس نکاح ہو گیا، اور وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے حلال ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس نکاح کو اتنا آسان کر دیا، تاکہ انسان کی جو فطری خواہش ہے، اس کو پورا کرنے کا جائز راستہ اتنا آسان ہو جائے کہ اس میں کوئی دشواری نہ ہو۔ نکاح کے لئے نہ منگنی شرط ہے نہ مہندی شرط ہے، نہ تقریب شرط ہے، نہ اجتماع شرط ہے، نہ کسی کو بلانا شرط ہے۔

نکاح میں برکت کیسے آئے گی؟

ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَعْظَمُ النِّکَاحِ بَرَکَةً اَیْسَرُہٗ مُؤْنَةً))(۱)

"یعنی سب سے زیادہ برکت والا نکاح وہ ہے جس میں مشقت کم سے کم ہو"

زیادہ مشقت نہ اٹھائی گئی ہو، بلکہ سادگی کے ساتھ، بغیر کسی تکلیف کے نکاح کر لیا گیا ہو۔ ایسے نکاح میں اللہ تعالیٰ زیادہ برکت عطا فرماتے ہیں۔

عہد نبوی ﷺ کی شادیاں

شریعت نے اس نکاح کو جتنا آسان بنایا تھا، ہم نے اس کو اتنا ہی مشکل بنا دیا، آج نکاح کرنا ایک عذاب ہے سالوں اور مہینوں پہلے سے جب تک اس کی تیاری نہ کی جائے، اور اس پر لاکھوں روپیہ خرچ نہ کیا جائے، اس وقت تک نکاح نہیں ہو سکتا۔ دیکھئے کہ حضور اقدس ﷺ کے عہد مبارک میں کس طرح نکاح ہوتے تھے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں۔ اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، یعنی ان دس خوش نصیب صحابہ میں سے ہیں، جن کے بارے میں حضور اقدس ﷺ نے صراحت کے ساتھ خوشخبری دے دی ہے کہ یہ جنت میں جانے والے ہیں۔ یوں تو تمام صحابہ کرام کا حضور اقدس ﷺ سے بہت زیادہ تعلق تھا، لیکن عشرہ مبشرہ وہ دس صحابہ ہیں جو اخص الخواص ہیں، ان میں سے ایک حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ہیں۔

حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ یہ حضور اقدس ﷺ کی مجلس میں حاضر ہوئے، آپ

(۱) مسند أحمد بن حنبل، حديث سيدة عائشة رضي الله عنها، رقم: ۲۳۳۸۸

نے دیکھا کہ ان کی قمیص پر ایک زرد نشان لگا ہوا ہے، حضور اقدس ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تمہاری قمیص پر یہ پیلا نشان کیسے لگ گیا؟ جواب میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یا رسول اللہ! میں نے نکاح کیا ہے، نکاح کی وجہ سے میں نے خوشبو لگائی تھی، یہ اس خوشبو کا نشان ہے، آپ نے ان کو دعا دیتے ہوئے فرمایا:

((بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ وَعَلَيْكَ))

''اللہ تعالیٰ تمہیں برکت عطا فرمائے''

پھر فرمایا:

((أَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاةٍ))

''ولیمہ کر لینا، چاہے ایک بکری کے ذریعہ ہو''(۱)

یہ سادگی آپ بھی اختیار کیجئے

اب آپ ملاحظہ فرمائیں کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف مہاجر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہیں، اور حضور اقدس ﷺ سے آپ کا دور کا رشتہ بھی ہے، عشرہ مبشرہ میں ہیں۔ لیکن اپنے نکاح میں حضور اقدس ﷺ کو بھی نہیں بلایا، بلکہ نکاح کے بعد آپ کے پوچھنے پر بتایا کہ میں نے نکاح کر لیا ہے۔ اور پھر خود حضور اقدس ﷺ نے بھی شکایۃً یہ نہیں کہا کہ تم نے اکیلے اکیلے نکاح کر لیا ہمیں بلایا بھی نہیں، بلکہ برکت کی دعا دی:

((بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ وَعَلَيْكَ))

البتہ یہ ضرور فرمایا کہ ولیمہ کر لینا، چاہے اس کے لئے ایک بکری ہی ذبح کرنی پڑے۔
اب دیکھئے کہ نکاح کی مجلس میں حضور اقدس ﷺ تک کو بھی دعوت دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اتنی سادگی کے ساتھ نکاح فرمالیا۔
آج اگر کوئی شخص اس طرح نکاح کر لے کہ اپنے خاص لوگوں کو بھی نہ بلائے۔ تو پھر دیکھئے گا

(۱) صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب ماجاء فی قول الله تعالیٰ فإذا قضیت الصلاۃ، رقم: ۱۹۰۷، صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب الصداق وجواز و تعلیم القرآن و خاتم حدیث، رقم: ۲۵۵۶، سنن الترمذی، کتاب النکاح عن رسول الله، باب ماجاء فی الولیمة، ۱۰۱٤، سنن النسائی، کتاب النکاح، باب التزویج علی نواة من ذهب، رقم: ۳۲۹۰، سنن أبی داؤد، کتاب النکاح، باب قلة المهر، رقم: ۱۸۰٤، سنن ابن ماجه، کتاب النکاح، باب الولیمة، رقم ۱۸۹۷، مسند أحمد، رقم: ۱۲۲۲٤

کہ اس سے لوگوں کو کتنی شکایتیں ہوں گی، کتنے شکوے اور گلے ہوں گے کہ یہ صاحب تو اکیلے اکیلے نکاح کر کے بیٹھ گئے، ہمیں پوچھا تک نہیں، لیکن حضور اقدس ﷺ نے کوئی شکایت نہیں کی۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کا قصہ

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ انصاری صحابی ہیں، اور حضور اقدس ﷺ کے محبوب صحابی ہیں۔ حضور اقدس ﷺ کا ان کے ساتھ محبت کا بڑا خصوصی تعلق تھا۔ ان کا واقعہ روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ غزوہ بنی مصطلق سے جہاد کر کے واپس آ رہے تھے، ان کا اونٹ بہت سست رفتار تھا اور اڑیل تھا۔ یہ اس کو تیز چلانے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر وہ نہیں چلتا تھا۔ پورا قافلہ آگے نکل جاتا۔ اور یہ پیچھے رہ جاتے تھے، جب حضور اقدس ﷺ نے ان کو دیکھا کہ یہ بار بار پیچھے رہ جاتے ہیں تو آپ ان کے پاس گئے اور ان سے پوچھا کہ تم قافلہ کے ساتھ ساتھ کیوں نہیں چلتے؟ انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ، یہ اونٹ چل کر نہیں دیتا، میں اس کو تیز چلانے کی کوشش کرتا ہوں مگر یہ پھر پیچھے رہ جاتا ہے۔ آپ نے قریب کی جھاڑی سے ایک لکڑی توڑی۔ اور ہلکی سے وہ لکڑی چابک کے طور پر اس اونٹ کو لگائی جیسے ہی آپ نے وہ لکڑی لگائی، بس وہ اونٹ تو ہوا ہو گیا، اور بہت تیزی سے دوڑنے لگا، یہاں تک کہ تمام قافلے سے آگے نکل گیا، آنحضرت ﷺ پھر ان کے قریب پہنچے، اور آپ نے ان سے فرمایا: اب تو تمہارا یہ اونٹ بہت تیز دوڑ رہا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ یہ آپ کی برکت سے اتنا تیز ہو گیا کہ سب سے آگے ہو رہا ہے۔

آپ نے ان سے فرمایا کہ یہ تو بہت شاندار اونٹ ہے، کیا تم یہ اونٹ مجھے بیچو گے؟ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یا رسول اللہ، بیچنے کی کیا بات ہے، اگر آپ کو پسند ہے تو آپ میری طرف سے ہدیہ قبول فرمالیں، آپ نے فرمایا: ہدیہ نہیں۔ بلکہ میں تو قیمتاً لوں گا، اگر بیچنا چاہتے ہو تو بیچ دو۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر آپ خریدنا چاہتے ہیں تو آپ جس قیمت پر چاہیں خرید لیں۔ آپ نے فرمایا: نہیں تم بتاؤ کہ کس قیمت پر بیچتے ہو؟ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! میں اس کو ایک اوقیہ چاندی کے عوض فروخت کرتا ہوں، (اوقیہ چاندی کا ایک وزن ہوتا تھا، جو تقریباً چالیس درہم کے برابر ہوتا تھا) آپ نے فرمایا: تم نے تو بہت زیادہ قیمت لگا دی۔ اس قیمت میں تو بڑے بڑے اونٹ آ جاتے ہیں انہوں نے کہا: یا رسول اللہ۔ آپ جتنی قیمت لگانا چاہیں لگا دیں، آپ نے فرمایا: چلو میں ایک اوقیہ میں خریدتا ہوں۔ اور میں اس کے پیسے مدینہ منورہ پہنچ کر دوں گا۔

اس کے بعد حضرت جابر رضی اللہ عنہ اونٹ سے اتر کر کھڑے ہو گئے، حضور اقدس ﷺ نے ان سے

پوچھا کہ اونٹ سے کیوں اتر گئے؟ انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ! یہ اونٹ تو آپ نے خرید لیا، اب یہ آپ کا ہو گیا۔ آپ نے فرمایا: تم مدینہ منورہ تک پیدل جاؤ گے، ایسا کرو کہ تم اسی پر سواری کر کے مدینہ منورہ تک پہنچ جاؤ، وہاں جا کر تم سے یہ اونٹ لے لیں گے، اور پیسے ادا کر دیں گے۔

جب مدینہ منورہ پہنچے تو انہوں نے وہ اونٹ حضور اقدس ﷺ کے پاس بھیج دیا۔ لیکن آنحضرت ﷺ نے وہ اونٹ بھی ان کو واپس کر دیا، اور ایک اوقیہ چاندی بھی ان کو دے دی۔ یہ درحقیقت ان کو نوازنے کا ایک بہانہ تھا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا نکاح

حدیث شریف میں ہے جس وقت وہ اونٹ تیز چل رہا تھا، اور حضور بھی ان کے ساتھ چل رہے تھے۔ اس وقت آپ نے ان سے پوچھا کہ بھائی تم نے شادی بھی کی یا نہیں؟ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ میں نے غزوہ میں آنے سے پہلے نکاح کر لیا تھا۔ آپ نے پھر سوال کیا کہ تم نے کسی کنواری سے نکاح کیا ہے یا ثیبہ (شادی شدہ) عورت سے نکاح کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ! میں نے ایک ثیبہ عورت سے نکاح کیا ہے، جو پہلے ایک شخص کے نکاح میں تھیں، جب ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا تو میں نے ان سے نکاح کر لیا۔ آپ نے پھر سوال کیا کہ تم نے کنواری سے کیوں نکاح نہیں کیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ دراصل میرے والد صاحب کا انتقال ہو گیا، اور میری چھوٹی چھوٹی بہنیں ہیں، اس لئے مجھے ایک ایسی عورت کی تلاش تھی جو ان کی بھی دیکھ بھال کر سکے، اس لئے اگر میں نو عمر لڑکی سے نکاح کرتا تو وہ ان کی صحیح دیکھ بھال نہ کر سکتی، اس لئے میں نے ثیبہ عورت سے نکاح کیا۔ چنانچہ یہ سن کر حضور اقدس ﷺ نے ان کو دعا دی اور فرمایا:

((بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ وَعَلَيْكَ وَجَمَعَ بَيْنَكُمَا بِخَيْرٍ))

''اللہ تعالیٰ تمہیں برکت دے اور الفت و محبت کے ساتھ دونوں کو جمع کرے''(۱)

اب آپ اندازہ لگائیں کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے غزوہ میں جانے سے پہلے مدینہ منورہ میں نکاح کیا، اور حضور اقدس ﷺ مدینہ منورہ میں ہی تشریف فرما ہیں، اور اس کے بعد غزوہ میں حضور اقدس ﷺ کے ساتھ رہے، پھر جب اس غزوہ سے واپس ہوئے تو آپ کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ میں نے ایک عورت سے نکاح کیا ہے۔ اور انہوں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی کہ حضور

(۱) صحیح البخاری، کتاب النفقات، باب اعون المرأة زوجها في ولدها، رقم: ٤٩٤٨، صحيح مسلم، كتاب الرضاع، باب استحباب نكاح البكر، رقم: ٢٦٦٤، مسند أحمد، رقم: ١٤٤٨٢

اقدس ﷺ کو مجلس نکاح میں بلائیں نہ ہی حضور اقدس ﷺ نے یہ شکایت کی کہ تم نے چپکے چپکے نکاح کرلیا، مجھے کیوں نہیں بلایا۔

دوسروں کو بلانے کا اہتمام

حضور اقدس ﷺ کی پوری سیرت طیبہ میں نکاح کی سادگی کا یہ انداز نظر آتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس نکاح کو آسان رکھا تھا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کو اتنا ہی آسان اور سادہ رکھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اپنے بڑوں کو اور رشتہ داروں کو نکاح کے موقع پر بلانا حرام اور ناجائز ہے، جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح ہوا تو آپ ﷺ نے اس موقع پر فرمایا کہ ابوبکر و عمر کو بلا لاؤ، نکاح ہونے والا ہے، اس طرح خاص خاص لوگوں کو آپ نے بلا لیا، لہٰذا بلانا بھی جائز ہے۔ لیکن نکاح کے اندر اہتمام کہ جب تک فلاں شخص نہیں آجائے گا اور جب تک فلاں شرائط پوری نہیں ہوں گی، اور جب تک فلاں فلاں رسمیں نہیں ہوں گی، اس وقت تک نکاح منعقد نہیں ہوگا، شریعت میں ایسے اہتمام کی گنجائش نہیں۔

آج ہم نے آسان کو مشکل بنادیا

آج ہم نے نکاح کو مشکل بنادیا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب حلال کے دروازے بند کر دیئے تو حرام کے دروازے کھل رہے ہیں، آج اگر حلال کا راستہ کوئی شخص اختیار کرنا چاہے تو اس کے راستے میں پابندیاں اور رکاوٹیں ہیں، اور جب تک لاکھوں روپیہ نہ ہو وہ حلال راستہ اختیار نہیں کرسکتا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ حرام کی طرف جارہے ہیں، اور اس کے دروازے چوپٹ کھلے ہیں۔ اس کے ذریعہ معاشرے میں فساد پھیل رہا ہے۔

تین چیزوں میں تاخیر مت کیجیے

ایک حدیث جو یاد رکھنے کی ہے وہ یہ کہ حضور اقدس ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

((ثَلَاثًا لَا تُؤَخِّرُهَا، اَلصَّلَاةُ إِذَا دَخَلَ وَقْتُهَا، اَلْجَنَازَةُ إِذَا حَضَرَتْ، وَالْاَيِّمُ إِذَا وَجَدَتْ لَهَا كُفُوًا))(۱)

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الصلاۃ، باب ماجاء فی الوقت الأول من الفضل، رقم: ۱۵۶، مسند أحمد، رقم: ۷۸۷

تین چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے میں تاخیر اور دیر نہ کرو:

① جب جنازہ تیار ہو کر آ جائے تو نماز جنازہ پڑھنے میں دیر نہ کرو۔ نماز جنازہ کو جلدی پڑھنے کا حکم اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر ایسے وقت میں جنازہ آئے جب کہ جماعت تیار ہو، تو فرض تو پہلے ادا کر لئے جائیں، فرضوں کے بعد پہلے جنازہ کی نماز ادا کی جائے، اس کے بعد سنتیں ادا کی جائیں۔ بعض فقہاء کا کہنا یہ ہے کہ فرضوں کے بعد سنتیں پڑھنا تو جائز ہے لیکن نفلیں پڑھنا جائز نہیں، جب تک نماز جنازہ نہ پڑھ لیں، فتویٰ بھی اسی قول پر ہے۔ عام لوگوں کو یہ مسئلہ معلوم نہیں ہے، چنانچہ نماز جنازہ کا اعلان ہونے کے باوجود لوگ فرض نماز کے بعد نوافل پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ نفلوں کی وجہ سے نماز جنازہ میں تاخیر کرنا جائز نہیں۔

② دوسری چیز یہ بیان فرمائی کہ جب نماز کا وقت مستحب شروع ہو جائے تو اس کے بعد نماز میں تاخیر نہ کرو۔ بلکہ جتنی جلدی ہو سکے نماز پڑھ لو۔ بعد میں پھر وقت ملے یا نہ ملے۔ پھر حالات سازگار رہیں یا نہ رہیں۔

③ تیسری چیز یہ بیان فرمائی کہ جب بے شوہر کی لڑکی کا مناسب رشتہ مل جائے تو اس کے نکاح میں تاخیر نہ کرو۔

لہٰذا ان تینوں چیزوں میں تاخیر نہ کرنی چاہئے۔ ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا:

((إِذَا جَآءَ كُمْ مَنْ تَرْضَوْنَ دِيْنَهٗ وَخُلُقَهٗ فَزَوِّجُوْهُ اِلَّا تَفْعَلُوْا تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ)) (۱)

"اگر تم ایسا نہیں کرو گے، یعنی مناسب رشتہ ملنے پر لڑکی کا رشتہ نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بہت فساد پھیلے گا۔ وہ فساد یہ ہوگا کہ جب آپ نے حلال کا راستہ روک دیا تو پھر حرام کا راستہ کھل جائے گا"

ان فضول رسموں کو چھوڑ دیجیے

لہٰذا شریعت نے نکاح کو جتنا آسان بنا دیا تھا آج ہم نے اس کو اتنا ہی مشکل بنا دیا، اور اس کو ایک عذاب بنا دیا، اور پر تکلف بنا دیا، خدا جانے کیا کیا رسمیں اس کے اندر ہم نے اپنی طرف سے

(۱) سنن الترمذی، کتاب النکاح عن رسول اللہ، باب ماجاء اذا جاء کم من ترضون دینه فزوجوه، رقم: ۱۰۰۵

گھڑ لیں کہ پہلے منگنی ہونی چاہئے، اور منگنی کے اندر فلاں فلاں رسمیں ہونی چاہئیں، شادی سے پہلے مہندی ہونی چاہئے، ان رسموں کے بغیر نکاح نہیں ہوسکتا، یہ سب ہم نے اپنی طرف سے اضافے کر رکھے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج نکاحوں میں بے برکتی ہو رہی ہے۔

علی الاعلان نکاح کیجیے

دوسرے نکاح کے وقت انجام دیئے جانے والے امور ہیں، جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ نکاح ایک عبادت ہے حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((أَعْلِنُوْا هٰذَا النِّكَاحَ وَاجْعَلُوْهُ فِي الْمَسَاجِدِ)) (۱)

یعنی نکاح کا اعلان کرو، علی الاعلان نکاح ہونا چاہئے، حلال اور حرام میں یہی فرق ہے کہ حرام کام چوری چھپے ہوتا ہے، اور خفیہ طریقے سے ہوتا ہے، اس لئے نکاح میں شریعت نے یہ ضروری قرار دیا کہ علی الاعلان ہو، لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ فلاں کا نکاح فلاں کے ساتھ ہو گیا ہے۔ آگے فرمایا: اس نکاح کو مسجد میں انجام دو، اس کو بھی حضور اقدس ﷺ نے سنت قرار دیا۔ اس لئے کہ نکاح ایک عبادت ہے، اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل ہے اور حضور اقدس ﷺ کی سنت پر عمل ہے، لہٰذا جس طرح نماز عبادت ہے۔ اسی طرح نکاح بھی عبادت ہے، اس لئے اس کو مسجد میں انجام دینے کی تاکید فرمائی ہے۔

نکاح کے بعد مسجد میں شور وشغب

لیکن یہاں ایک مسئلہ اور سن لیجیے۔ اور حضور اقدس ﷺ کے نبی ہونے کی حیثیت سے آپ ہی کی نگاہ وہاں تک پہنچ سکتی ہے، وہ یہ کہ ایک دوسری حدیث میں جہاں آپ نے یہ ارشاد فرمایا: نکاح مسجدوں میں انجام دو، وہاں ساتھ ہی آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

((وَاِيَّاكُمْ وَهَيْشَاتِ الْأَسْوَاقِ))(۲)

(۱) سنن الترمذی، كتاب النكاح عن رسول الله، باب ماجاء في إعلان النكاح، رقم: ۱۰۰۹، سنن ابن ماجه، كتاب النكاح، باب إعلان النكاح، رقم: ۱۸۸۵، مسند أحمد بن حنبل، رقم: ۱۵۵٤۵

(۲) صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب تسوية الصفوف وإقامتها وفضل الأول فالأول منها، رقم: ٦۵۵، سنن الترمذی، كتاب الصلاة، باب ماجاء ليلينى منكم أولو الأحلام والنهى، رقم: ۲۱۱، سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب من يستحب أن يلي الإمام في الصف وكراهية التأخر، رقم: ۵۷۷

یعنی بازاروں کی طرح کے شور وشغب سے بچو۔ اب ہمارے ہاں اس کا رواج تو ہو رہا ہے کہ نکاح مسجد میں ہوتے ہیں لیکن اس حدیث کے ذریعہ حضور اقدس ﷺ اس طرف توجہ دلا رہے ہیں کہ ایسا نہ ہو کہ نکاح تو مسجد میں کر لیا، لیکن نکاح کے نتیجے میں مسجد کے اندر شور وشغب شروع ہو گیا۔ آج کل اس کا لحاظ نہیں کیا جاتا، بلکہ نکاح کی محفل کے بعد شور وشغب شروع ہو جاتا ہے۔ چونکہ حضور اقدس ﷺ کی نگاہ مبارک اس طرف دیکھ رہی تھی کہ جب لوگ اس حکم پر عمل کریں گے تو کہیں اس گناہ کے اندر مبتلا نہ ہو جائیں، اس لئے آپ نے پہلے ہی خبردار فرما دیا کہ مسجدوں کو بازاروں کی طرح کے شور وشغب سے بچاؤ۔

عبادت میں گناہ کی آمیزش

لہٰذا جب نکاح عبادت ہے تو عبادت کو گناہ کی آمیزش سے پاک ہونا چاہئے، یہ عجیب بات ہے کہ عبادت بھی ہو رہی ہے، اور ساتھ ساتھ حرام کام بھی ہو رہا ہے، گناہ بھی ہو رہا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص نماز بھی پڑھے، اور نماز کے دوران ریکارڈنگ بھی لگا دے، اب نماز بھی ہو رہی ہے، اور فلمی گانے بھی چل رہے ہیں۔ کوئی شخص کتنا ہی گیا گزرا کیوں نہ ہو، لیکن وہ کم از کم نماز کے وقت گناہ سے پرہیز کرنے کی کوشش کرے گا، نماز پڑھتے وقت اگر سامنے تصویر ہو گی تو اس تصویر کو ہٹا دے گا، اگر موسیقی بج رہی ہو گی تو اس کو بند کر دے گا۔

ہندوستان میں یہ ہوتا تھا کہ اگر کسی کافر نے نماز کے وقت مسجد کے سامنے باجا بجا دیا تو اس پر فساد ہو جاتا تھا، اور مسلمان اس پر اپنی جان دے دیتے تھے۔ اور اب ماشاء اللہ مسجدوں کے سامنے خود گانے بجانے شروع کر دیئے۔ لہٰذا عین نماز کے وقت اور عین عبادت کے وقت کم از کم انسان اس بات کا اہتمام کرتا ہے کہ کوئی گناہ کا کام نہ ہو۔

نکاح کی محفل گناہوں سے پاک ہو

لہٰذا نکاح کے عبادت ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ نکاح کی محفل جو عبادت کی محفل ہے، جو سنت کی ادائیگی کی محفل ہے، اور جو ایک ثواب کی محفل ہے، اور جس محفل پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہو رہی ہیں، کم از کم اس محفل کو تو گناہوں سے پاک کیا جائے۔ آج ہم نے اس محفل کو ہر طرح کے گناہوں کا ملغوبہ بنا دیا ہے، مرد وعورت کا آزادانہ میل ہو رہا ہے، عورتیں بن سنور کے محفل کے اندر آ رہی ہیں ساتھ میں نکاح کی عبادت بھی ہو رہی ہے، یہ کیسی عبادت ہو رہی ہے، یہ کیسی حضور

اقدس ﷺ کی سنت کی ادائیگی ہو رہی ہے۔

حکم تو یہ دیا جا رہا ہے کہ اللہ سے ڈرو، تو اگر اس نکاح کو انجام دیتے ہوئے نافرمانیوں کا ارتکاب کرو گے تو اس نکاح کے اندر برکت نہیں ہوگی۔ برکت اس وقت ہوگی جب نکاح کے موقع پر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جائے، اور اس کو سادگی کے ساتھ انجام دیا جائے، اس میں کوئی گناہ کا کام نہ ہو۔ اگر لوگوں کا اجتماع بلا لیا، تو یہ کوئی ناجائز اور حرام کام نہیں ہے، دعوت بھی کر دی۔ لیکن گناہ کا کوئی کام نہ کیا جائے۔ اس لئے کہ نکاح تو اس لئے کیا جا رہا ہے کہ انسان کی فطری خواہش کی تسکین کے لئے جائز طریقہ نکالا جائے۔ اگر گناہ کے کام اس کے اندر کیے جائیں گے تو نکاح کے مقصد کے خلاف ہے۔ اس لئے نکاح کی محفل میں گناہ کے کاموں سے پرہیز کیا جائے۔

خوشگوار ازدواجی تعلق کے لئے تقویٰ کی ضرورت

تیسری بات نکاح کے بعد تقویٰ اختیار کرنے کی ہے، میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میاں بیوی کے تعلقات اس وقت تک خوشگوار نہیں ہو سکتے، جب تک دونوں کے دل میں تقویٰ نہ ہو، اللہ کا خوف نہ ہو۔ دیکھئے دونوں میاں بیوی کے درمیان اتنا قریبی تعلق ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ قریبی تعلق کسی اور کے درمیان نہیں ہوسکتا، دونوں ایک دوسرے کے محرم راز ہوتے ہیں، دونوں ایک دوسرے کے اتنے زیادہ قریب ہوتے ہیں اس سے زیادہ قرب کا تصور اس دنیا میں نہیں کیا جا سکتا، دونوں کے آپس کے تعلقات ایسے ہیں کہ وہ کبھی بھی دوسروں کے سامنے مکمل طور پر نہیں آ سکتے، لہٰذا تنہائی کے اس عالم میں جب کہ ایک دوسرے کے ساتھ خلوت ہے، اس وقت ایک دوسرے کو تکلیف پہنچائیں، یا حق تلفی کریں تو کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔ بہت سے حقوق تو ایسے ہیں کہ اگر کوئی شخص آپ کی حق تلفی کرے تو پولیس کے ذریعہ وہ حق وصول کیا جا سکتا ہے۔ یا عدالت میں دعویٰ دائر کر کے عدالت کے ذریعہ وہ حق وصول کیا جا سکتا ہے۔ لیکن میاں بیوی کے بیشتر حقوق ایسے ہیں کہ ان کو نہ تو پولیس کے ذریعہ وصول کیا جا سکتا ہے، اور نہ عدالت کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے، عدالت زیادہ سے زیادہ یہ کرے گی کہ بیوی کو نان نفقہ دلا دے گی، اور مہر دلا دے گی، لیکن اگر شوہر گھر میں آ کر منہ چڑھا کر بیٹھ جاتا ہے، اور جب بات کرتا ہے تو جلی کٹی سناتا ہے، تو اب یہ جلی کٹی سنانے کا اور منہ چڑھا کر بیٹھ جانے کا جو دکھ ہے، اس کا ازالہ کون سی عدالت اور کون سی پولیس کرے گی؟

''اللہ کا خوف'' حقوق کی ادائیگی کرا سکتا ہے

اگر کوئی چیز اس دکھ کا ازالہ کر سکتی ہے تو وہ صرف ایک چیز ہے، وہ ہے ''اللہ کا خوف'' جب شوہر کے دل میں اس بات کا احساس ہو کہ بیوی کا وجود اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ وابستہ کر دیا ہے، اس کے میرے ذمہ کچھ حقوق ہیں جو مجھے ادا کرنے ہیں، اگر میں ادا نہیں کروں گا تو اللہ تعالیٰ کے ہاں میری پکڑ ہوگی۔ جب تک یہ احساس دل میں نہ ہو، انسان اس کے تمام حقوق ادا نہیں کر سکتا۔ یہ حقوق نہ عدالت دلوا سکتی ہے نہ پولیس دلوا سکتی ہے۔

یہ تو درندے کا وصف ہے

میرے ایک ہم سبق تھے۔ ایک مرتبہ وہ فخریہ انداز میں یہ بیان کرنے لگے کہ جب میں گھر میں داخل ہوتا ہوں تو میری بیوی اور بچوں کی جرأت نہیں ہوتی کہ مجھ سے کوئی بات کریں، یا میرے حکم سے سرتابی کر سکیں۔ وہ اپنی مردانگی ظاہر کرنے کے لئے یہ بات بیان کر رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ جو آپ اپنا وصف بیان کر رہے ہیں یہ کسی درندے کا وصف تو ہو سکتا ہے انسان کا تو یہ وصف نہیں ہو سکتا۔

انسان کا وصف تو وہ ہے جو حضور اقدس ﷺ کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ جب کبھی آپ ﷺ گھر کے اندر تشریف لاتے تو اس طرح تشریف لاتے کہ آپ کا چہرہ انور کھلا ہوا تھا، اور آپ کے چہرہ مبارک پر تبسم ہوتا تھا، اور جتنا عرصہ میں نے حضور اقدس ﷺ کے ساتھ گزارا، اس عرصہ میں آپ نے مجھے کوئی بڑی سرزنش نہیں فرمائی۔ (۱)

آج تک لہجہ بدل کر بات نہیں کی

یہ ہے انسان کا کام، جو حضور اقدس ﷺ نے کر کے دکھایا۔ یہ کام اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک دل میں تقویٰ نہ ہو، اللہ کا خوف نہ ہو۔ میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبد الحئی صاحب قدس سرہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ اپنا معمول بیان فرماتے تھے کہ آج میری شادی کو پچپن سال ہو گئے، لیکن آج تک گھر والوں سے غصہ کی حالت میں لہجہ بدل کر بات کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

(۱) سبل الهدى والرشاد في سيرة خير العباد، باب في ضحكه صلى الله عليه وسلم وتبسمه (۱۲۱/۷)، كنز العمال، رقم: ۱۸۷۱۹ (۲۲۲/۷)

لوگ کرامت اس کو سمجھتے ہیں کہ کوئی ہوا میں اڑنے لگے، یا جلتی ہوئی آگ میں سے گزر جائے۔ لیکن حقیقی کرامت یہ ہے کہ میاں بیوی کے درمیان اتنا قریبی تعلق ہونے کے باوجود پچپن سال اس طرح گزارے کہ کبھی اہلیہ سے لہجہ بدل کر غصہ کی حالت میں بات کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

خود حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ محترمہ فرمایا کرتی تھیں کہ ساری عمر حضرت نے مجھے کسی کام کے کرنے کا حکم نہیں دیا، مثلاً کبھی یہ نہیں کہا کہ پانی پلا دو، یا یہ کام کر دو، بلکہ میں نے اپنے شوق سے کوئی کام کر لیا تو کر لیا یہ اہتمام کہ کبھی بیوی سے لہجہ بدل کر بات نہ کروں، یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک دل میں خدا کے خوف کا پہرا نہ ہو، تقویٰ کا پہرا نہ ہو، اس لئے کہ یہ کام نہ تو پولیس کرا سکتی ہے، اور نہ عدالت کرا سکتی ہے۔

بیوی کا ہاتھ کون روک سکتا ہے؟

اسی طرح اگر بیوی شوہر کو تکلیف پہنچانے پر اتر آئے تو کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں، کوئی عدالت کوئی پولیس اس کو نہیں روک سکتی۔ بس ایک چیز بیوی کو اس چیز سے روک سکتی ہے۔ وہ ہے تقویٰ اور اللہ تعالیٰ کا خوف۔ اس لئے اس نازک موقع پر جب زندگی کا دوراہا شروع ہو رہا ہے، اس وقت جو خطبہ مسنون قرار دیا، اس میں ایسی آیات کا انتخاب فرمایا جن میں اس بات کی تاکید فرمائی کہ تقویٰ اختیار کرو، اور اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں پیدا کرو اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا احساس دل میں پیدا کرو، اس کے ذریعہ ہی تم ایک دوسرے کے حقوق ادا کر سکو گے، اس کے بغیر ایک دوسرے کے حقوق ادا نہیں ہو سکتے۔

ہر کام کی درستگی ''تقویٰ'' میں ہے

سچی بات یہ ہے کہ ''تقویٰ'' کے بغیر اور اللہ کے خوف کے بغیر دنیا کا کوئی کام صحیح نہیں ہو سکتا۔ خاص طور پر نکاح کے معاملات اور میاں بیوی کے باہمی حقوق تقویٰ کے بغیر درست نہیں ہو سکتے۔ اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ پر انسان کی نگاہ ہو، اور اتباع سنت کا جذبہ دل میں ہو، اور اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں ہو، اور آخرت میں جواب دہی کا احساس دل میں ہو، تب ایک دوسرے کے حقوق ادا ہو سکتے ہیں۔ اسی لئے فرمایا کہ رشتہ داریوں کے حقوق ادا کرتے ہوئے اللہ سے ڈرو۔ ان میں سے ہر ہر چیز کے بارے میں تم سے سوال ہوگا کہ تم نے کس کے ساتھ کس قسم کا معاملہ کیا تھا۔

نکاح کرنا سنت ہے

نکاح کے خطبہ میں ان آیات کے علاوہ کچھ احادیث بھی تلاوت کی جاتی ہیں، چنانچہ میں نے ایک حدیث یہ تلاوت کی کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِي)) (۱)

یعنی نکاح میری سنت ہے، اس کے ذریعہ اس بات کی طرف اشارہ فرما دیا کہ یہ محض دنیاداری کا کام نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ثواب کا کام بنایا ہے۔ اسی سے یہ بات نکلتی ہے کہ دنیا کے تمام کام جن کو ہم دنیا سمجھتے ہیں، اگر ذرا سی نیت بدل لو، ذرا سا زاویہ نگاہ بدل لو، اور اس کا طریقہ کار بدل لو تو حقیقت میں یہ سب دین ہیں۔ چنانچہ یہ نکاح بھی دین ہے بیع و شراء بھی دین ہے یہ تجارت بھی دین ہے، یہ زراعت بھی دین۔ یہ ملازمت بھی دین، بیوی بچوں کے ساتھ ہنسنا بولنا بھی دین ہے، بس شرط یہ ہے کہ ان سب کاموں میں تمہاری نیت اللہ کو راضی کرنا ہو، اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کی نیت ہو تو پھر کھانا پینا، تجارت و صنعت سب چیزیں دین بن جاتی ہیں۔

نکاح خاندانوں کو جوڑنے کا ذریعہ

دوسری حدیث یہ تلاوت کی تھی کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَمْ تُرَ لِلْمُتَحَابَّيْنِ مِثْلُ النِّكَاحِ)) (۲)

یعنی اگر دو خاندانوں میں آپس میں محبت ہے، تو اس محبت کو پختہ کرنے والی نکاح سے زیادہ مؤثر کوئی چیز نہیں۔ لہٰذا اگر دو خاندانوں میں آپس میں محبت ہے تو اس محبت کو پائیدار کرنے کے لئے ان خاندانوں کے بعض افراد کے درمیان آپس میں رشتہ قائم ہو جائے تو اس محبت کو مزید تقویت حاصل ہو جاتی ہے، اور اللہ تعالیٰ اس محبت میں مزید برکت عطا فرماتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ دونوں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہوں، اور دونوں ایک دوسرے کے حقوق کی رعایت کرنے والے ہوں۔ اور حضور اقدس ﷺ کا متعدد نکاح کرنے کا بہت بڑا سبب یہ تھا کہ بہت سے قبائل سے تعلقات قائم کرنے منظور تھے، اس لئے آپ نے ان قبائل کی خواتین سے نکاح فرمایا۔ اس زمانے

---

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب النكاح، باب ماجاء في فضل النكاح، رقم: ۱۸۳٦

(۲) سنن ابن ماجه، كتاب النكاح، باب ماجاء في فضل النكاح، رقم: ۱۸۳۷، مصنف ابن أبي شيبة (۱۲۸/٤)

میں بھی اس کا رواج تھا کہ جن کے درمیان باہمی قریبی تعلقات ہوتے تو ان تعلقات کو نکاح کے ذریعہ مزید پختہ بنا دیا جاتا تھا۔

دنیا کی بہترین چیز ''نیک خاتون''

تیسری حدیث جو میں نے تلاوت کی اس میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلدُّنْیَا کُلُّھَا مَتَاعٌ، وَخَیْرُ مَتَاعِ الدُّنْیَا الْمَرْأَۃُ الصَّالِحَۃُ)) (۱)

یعنی یہ ساری دنیا متاع ہے، نفع اٹھانے کی چیز ہے، کیونکہ یہ دنیا اللہ تعالیٰ نے انسان کے نفع اٹھانے کے لئے بنائی ہے، تاکہ انسان اس سے جائز طریقے سے نفع اندوز ہو۔ اور دنیا کے اندر سب سے بہتر نفع اٹھانے کی چیز نیک خاتون ہے، نیک خاتون کو حضور ﷺ نے سب سے بڑی نعمت قرار دیا۔

خوشحال گھرانہ، زمین پہ جنت

شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ دنیا کی جنت یہ ہے کہ زوجین ایک ہوں اور نیک ہوں۔ یعنی اگر دو باتیں جمع ہو جائیں کہ دونوں کے درمیان اتحاد اور محبت بھی ہو، اور دونوں نیک بھی ہوں تو یہ دنیا کی جنت ہے۔ اگر ان میں سے ایک چیز بھی مفقود ہو جائے تو دنیا ہی جہنم ہے۔ اس لئے کہ اس صورت میں دنیا بے کیف اور بے مزہ ہو جاتی ہے، اور اس میں کدورت پیدا ہو جاتی ہے۔

تین چیزوں کا حصول، نیک بختی کی علامت

اسی لئے حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تین چیزیں انسان کو دنیا میں حاصل ہو جائیں تو اس کی سعادت کا حصہ ہے، اس کی نیک بختی کی علامت ہے:

① کشادہ گھر

② نیک بیوی

③ خوشگوار سواری

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الرضاع، باب خیر متاع الدنیا المرأۃ الصالحۃ رقم: ۲۶۶۸، سنن النسائی، کتاب النکاح، باب المرأۃ الصالحۃ، رقم: ۳۱۸۰، مسند أحمد، رقم: ۶۲۷۹

اگر یہی تین چیزیں خراب ہو جائیں تو پھر یہ شوم ہیں، یعنی پوری زندگی کے لئے نحوست اور وبال ہے۔ اس حدیث کے ذریعہ حضور اقدس ﷺ نے اس طرف اشارہ فرمایا کہ شوہر کو بیوی کا انتخاب کرتے ہوئے اور بیوی کو شوہر کا انتخاب کرتے ہوئے یہ بات مدنظر رکھنی چاہئے کہ اس میں خدا کا خوف کتنا ہے، اور دین پر چلنے کا جذبہ کتنا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر نکاح کے فوائد حاصل نہیں ہوتے۔

برکت والا نکاح

چوتھی حدیث یہ تلاوت کی تھی کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَعْظَمُ النِّکَاحِ بَرْکَةً اَیْسَرُہٗ مُؤْنَةً))(۱)

یعنی سب سے زیادہ برکت والا نکاح وہ ہے جس میں محنت، مشقت اور خرچ کم ہو۔ نکاح جتنی سادگی سے کیا جائے گا اتنی زیادہ اس کی برکتیں حاصل ہوں گی۔

بہرحال! نکاح کے بارے میں حضور اقدس ﷺ کے یہ ارشادات ہیں، اگر حقیقت میں ان پر عمل ہو جائے تو دین و دنیا کی صلاح وفلاح حاصل ہو جائے۔ آج ہمارے معاشرے میں چاروں طرف جو خرابیاں پھیلی ہوئی ہیں اور جو فساد پھیل رہا ہے، اس کی بنیادی وجہ ان ارشادات سے غفلت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان ارشادات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

☆☆☆

(۱) مسند أحمد بن حنبل، حديث سيدة عائشة رضى الله عنها، رقم: ۲۳۳۸۸

نکاح جنسی تسکین کا جائز ذریعہ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ﴾(۱)

بزرگانِ محترم و برادران عزیز! یہ سورۃ مؤمنون کی ابتدائی آیات ہیں جو میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہیں، ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان مؤمنوں کی صفات بیان فرمائی ہیں جن کو فلاح نصیب ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ایک مؤمن کی فلاح کا دارومدار ان صفات پر ہے جو ان آیات میں بیان کی گئی ہیں، لہٰذا ہر مومن کو یہ صفات حاصل کرنے کی فکر اور کوشش کرنی چاہئے۔ ان صفات میں سے تین صفات کا بیان پچھلے جمعوں میں متفرق طور پر ہوا ہے:

① نماز میں خشوع اختیار کرنا۔

② لغو باتوں سے پرہیز کرنا۔

③ زکوٰۃ ادا کرنا اور اپنے اخلاق کو درست کرنا۔

ان تینوں کا بیان الحمدللہ بقدر ضرورت ہو چکا ہے۔

نکاح، اہل ایمان کا وصف خاص

چوتھی صفت قرآن کریم نے یہ بیان فرمائی کہ فلاح یافتہ مومن وہ ہیں جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیوی اور سوائے کنیزوں کے کہ ان کے ذریعہ اگر لوگ اپنی خواہش پوری

☆ اصلاحی خطبات (۱۵/۱۳۶ تا ۲۵۳) بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرّم، کراچی

(۱) المؤمنون: ۱۔۸

کریں تو ان پر کوئی ملامت نہیں اور جو لوگ ان کے علاوہ کسی اور طریقے سے اپنی جنسی خواہش پوری کرنا چاہیں تو وہ حد سے گزرنے والے ہیں اور اپنی جان پر ظلم کرنے والے ہیں۔ یہ آیات کا ترجمہ تھا۔

جنسی جذبہ انسان کی فطرت میں داخل ہے

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک بہت اہم مسئلہ کی طرف تمام مسلمانوں کو توجہ دلائی ہے، وہ مسئلہ "انسان کی جنسی خواہش کی تسکین" کا مسئلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اس طرح پیدا فرمایا کہ ہر انسان میں ایک جنسی جذبہ موجود ہے اور یہ جنسی جذبہ انسان کی فطرت کے اندر داخل ہے۔ یعنی ہر انسان کو اپنی مخالف سمت کی طرف رغبت ہوتی ہے اور اس کے ساتھ اپنی جنسی خواہش کی تسکین کا جذبہ اس کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔

جنسی تسکین کے دو حلال راستے

اللہ تعالیٰ نے اس جذبے پر کوئی پابندی اور قدغن نہیں لگائی، لیکن اس کے لئے دو راستے قرآن کریم نے بیان فرمائے کہ یہ دو راستے تو حلال ہیں اور ان دو کے علاوہ جنسی خواہش پوری کرنے کے سارے راستے حرام ہیں اور ایک مومن کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان سے پرہیز کرے۔ دو حلال راستوں میں سے ایک تو نکاح کا راستہ کہ انسان نکاح کر کے اپنی بیوی کے ذریعہ جنسی خواہش کی تسکین کرے، یہی راستہ اس کے لئے حلال ہے بلکہ باعث اجر و ثواب بھی ہے۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ کسی زمانے میں کنیزیں ہوا کرتی تھیں جن کو باندی اور لونڈی بھی کہا جاتا ہے، پہلے زمانے میں جنگ کے دوران جو لوگ قیدی ہو جاتے تھے تو ان کے مردوں کو غلام اور عورتوں کو کنیز اور باندی بنا لیا جاتا تھا۔ حضور اقدس ﷺ جب دنیا میں تشریف لائے تو ساری دنیا میں یہ طریقہ جاری تھا اور آپ کے بعد بھی صدیوں تک جاری رہا، ان کنیزوں کو اللہ تعالیٰ نے ان کے آقاؤں کے لئے حلال کر دیا تھا، بشرطیکہ وہ کنیز مسلمان ہو یا اہل کتاب میں سے ہو۔ قرآن کریم نے فرمایا کہ جنسی خواہش پوری کرنے کے یہ دو طریقے تو حلال ہیں، ان کے علاوہ انسان جنسی خواہش کی تکمیل کے لئے جو بھی طریقہ اختیار کرے، وہ حرام ہے اور جو ان طریقوں کو اختیار کرے وہ حد سے گزرنے والا ہے اور اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے۔

اسلام اعتدال کا درس دیتا ہے

اللہ تعالیٰ نے جو دین عطا فرمایا ہے، اس کی ہر چیز میں اعتدال اور توازن کو مدنظر رکھا

ہے، ایک طرف انسان کی ایک فطری خواہش ہے اور کوئی انسان اس خواہش سے مستثنیٰ نہیں ہے، کوئی بڑے سے بڑا پیغمبر، بڑے سے بڑا بزرگ، بڑے سے بڑا ولی، اس خواہش سے مستثنیٰ نہیں، ہر ایک کے دل میں یہ خواہش پائی جاتی ہے، کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس انسانی خواہش کو نسل انسانی کی بڑھوتری کا ذریعہ بنایا ہے کہ انسان کی نسل اسی خواہش کے نتیجے میں بڑھتی ہے، لہٰذا یہ خواہش فطری ہے اور جب یہ خواہش فطری ہے تو شریعت نے یہ نہیں کہا کہ یہ جنسی جذبہ خراب ہے، یا گندہ ہے، یا ناپاک ہے، یا حرام ہے، اس جذبہ کو حرام قرار نہیں دیا، البتہ اس جذبہ کو تسکین دینے کے لئے ایک جائز راستہ مقرر کر دیا، اس جائز راستے سے اس جذبے کی جتنی تسکین چاہو کرو، وہ تمہارے لئے حلال ہے، لیکن اس کے علاوہ جو راستے ہیں، وہ چونکہ دنیا میں فساد پھیلانے والے ہیں، وہ انسان کو انسانیت کے جامے سے نکال دینے والے ہیں، اور حیوانیت کے راستے ہیں، اس لئے شریعت نے ان پر پابندی عائد کر دی ہے، ان کو ناجائز قرار دیا ہے اسلام میں یہ اعتدال اور توازن ہے۔

عیسائیت میں رہبانیت کا تصور

''عیسائیت'' کو آپ دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ عیسائی مذہب میں راہبوں اور تارک الدنیا لوگوں کا ایک نظام مشہور ہے جس کو ''رہبانیت'' کہا جاتا ہے۔

عیسائی راہبوں کا کہنا یہ تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور خوشنودی حاصل کرنی ہے تو اس کا اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے کہ دنیا کی ساری لذتوں کو چھوڑ دو اور ان کو خیر باد کہہ دو، جب تک دنیا کی ساری لذتیں نہیں چھوڑو گے، اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل نہیں ہوگا لہٰذا اگر کھانا کھانا ہے تو بس بقدر ضرورت روکھا پھیکا اور بدمزہ کھانا کھاؤ، مزے کی خاطر اور لذت کی خاطر کوئی اچھا کھانا مت کھاؤ، اور اگر کھانے میں لذت حاصل کرو گے تو پھر اللہ تعالیٰ نہیں مل سکتے، اسی طرح تمہیں اس جنسی خواہش کو بھی دبانا پڑے گا، اگر جنسی خواہش کی تکمیل کے لئے نکاح کا راستہ اختیار کرو گے تو پھر اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ اس وقت تک راضی نہیں ہوں گے جب تک تم شادی کو نہیں چھوڑو گے، بیوی بچوں کو نہیں چھوڑو گے اور دنیا کے سارے کاروبار کو نہیں چھوڑو گے، چنانچہ انہوں نے خانقاہیں بنائیں، ان خانقاہوں میں راہبوں کی کھیپ کی کھیپ آکر مقیم ہوئی اور ان کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم دنیا کو چھوڑ کر آئے ہیں۔

عیسائی راہبہ عورتیں

آپ نے عیسائی ''نَن'' کا نام سنا ہوگا، ''نَن'' وہ عورتیں ہوتی تھیں جو اپنی زندگی خانقاہ کے لئے وقف کر دیتی تھیں اور شادی سے کنارہ کشی اختیار کر لیتی تھیں کہ ساری عمر وہ شادی نہیں کریں گی۔ ایک طرف ''راہب'' مرد ہیں جنہوں نے یہ قسم کھا رکھی ہے کہ وہ شادی نہیں کریں گے اور کیونکہ اگر شادی کریں گے تو اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائیں گے، دوسری طرف ''نَن'' خواتین ہیں جنہوں نے قسم کھائی ہے کہ شادی نہیں کریں گی، کیونکہ شادی کرنے سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائیں گے، اور ان کا کہنا یہ تھا کہ جب تک نفس کو نہیں کچلیں گے اور جب تک خواہشات کو نہیں دبائیں گے، اللہ تعالیٰ اپنا قرب عطا نہیں کریں گے۔ عیسائیت میں یہ نظام جاری تھا۔

رہبانیت فطرت سے بغاوت ہے

لیکن یہ نظام فطرت سے بغاوت کا نظام تھا، جب اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر جنسی جذبہ رکھا ہے اور کوئی انسان اس جذبے سے مستثنیٰ نہیں تو پھر اللہ تعالیٰ یہ کیسے کر سکتے ہیں کہ جذبہ تو رکھ دیں اور اس کی تسکین کا کوئی حلال اور جائز راستہ نہ بتائیں۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کی رحمت اور ان کی حکمت سے بعید ہے۔ چنانچہ فطرت سے بغاوت کا انجام یہ ہوا کہ وہ عیسائی خانقاہیں جن میں راہب مرد اور نن عورتیں رہتی تھیں رفتہ رفتہ یہ خانقاہیں فحاشی کے اڈے بن گئے، اس لئے کہ وہ مرد اور عورتیں انسان اور بشر تھے، ان کے دل میں جنسی خواہش کا جذبہ پیدا ہونا لازم تھا۔ اس جذبے کو پورا کرنے کے لئے شیطان نے ان کو راستے سجھائے۔

شیطان کی پہلی چال

چنانچہ شیطان نے ان کو یہ راستہ سمجھایا کہ اپنے نفس کو جتنا کچلو گے اور جتنا اپنے نفس پر ضبط کرو گے اتنا ہی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوگی، اور جب خواہش بہت زیادہ شدید ہو رہی ہو اس وقت میں اس نفس کو کچلو گے تو اللہ تعالیٰ بہت راضی اور خوش ہوں گے، لہٰذا ایسا کریں کہ راہب مرد اور راہب عورت دونوں ایک کمرے میں رہیں۔ ایک کمرے میں رہنے کے نتیجے میں خواہش زیادہ ابھرے گی، اور اس کو زیادہ سختی سے دبانا پڑے گا، اور زیادہ سختی سے دبائیں گے تو اللہ تعالیٰ اور زیادہ راضی ہوں گے، چنانچہ مرد عورتیں ایک کمرے میں رہنا شروع ہو گئے۔

شیطان کی دوسری چال

اس کے بعد شیطان نے یہ سمجھایا کہ ابھی اور زیادہ نفس کو کچلنے کی ضرورت ہے لہٰذا راہب مرد اور راہب عورت ایک چارپائی پر سوئیں، اس کے نتیجے میں جب خواہش زیادہ پیدا ہو تو ان کو دبائیں اور کچلیں تو اللہ تعالیٰ اس سے اور زیادہ خوش اور راضی ہوں گے۔ چنانچہ جب ایک ساتھ چارپائی پر سوئے تو نتیجہ ظاہر ہے اس کے نتیجے میں بالآخر یہ ساری خانقاہیں فحاشی کے اڈے بن گئے، عام زندگی میں اتنی بدکاری نہیں تھی جتنی بدکاری ان راہبوں کی خانقاہوں میں پیدا ہوئی۔ یہ سب فطرت سے بغاوت کا نتیجہ تھا۔

اسلامی نکاح سہولت بخش ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں اور آپ کو جو دین عطا فرمایا اس میں اس انسانی فطرت کی رعایت رکھی گئی ہے۔ چونکہ یہ جنسی خواہش انسان کی فطرت کا ایک جذبہ ہے لہٰذا اس تسکین کا ایک حلال راستہ ہونا چاہئے۔ اور وہ حلال راستہ ''نکاح'' ہے، پھر اس نکاح کو شریعت نے اتنا آسان کر دیا کہ اس میں کوئی پائی پیسے کا خرچ نہیں ہے، کسی تقریب کی ضرورت نہیں ہے، یہاں تک کہ مسجد جانا اور کسی سے نکاح پڑھوانا بھی شرط نہیں ہے۔ بلکہ نکاح کے لئے بس اتنی شرط ہے کہ میاں بیوی اور دو گواہ مجلس کے اندر موجود ہوں، اور اس مجلس میں دو گواہوں کے سامنے لڑکا یہ کہہ دے کہ میں نے تم سے نکاح کیا اور لڑکی جواب میں یہ کہے کہ میں نے قبول کیا یا لڑکی یہ کہے کہ میں نے تم سے نکاح کیا اور لڑکا جواب میں یہ کہے کہ میں نے قبول کیا، بس نکاح ہو گیا۔

عیسائی مذہب میں نکاح کی مشکلات

جبکہ عیسائیوں کے یہاں ''کلیسا'' کے باہر نکاح کرنا ممکن نہیں، لہٰذا اگر مرد عورت دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول کر لیں تو عیسائی مذہب میں وہ نکاح نہیں ہو گا، بلکہ عیسائی مذہب میں نکاح اس وقت منعقد ہو گا جب مرد و عورت کلیسا میں جائیں اور وہاں کے پادری کی خوشامد کریں اور اس پادری کو فیس ادا کریں، وہ پادری اپنی فیس وصول کرنے کے بعد نکاح پڑھنے کے لئے خاص وقت مقرر کرے گا اس وقت میں جب پادری نکاح پڑھائے گا تب نکاح منعقد ہو گا ورنہ نکاح نہیں ہو سکتا۔ شریعت اسلامیہ نے ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی کہ نکاح کسی اور سے پڑھوایا جائے بلکہ دو مرد و عورت دو گواہوں کے سامنے ایجاب وقبول کر لیں اور مہر مقرر کر لیں بس نکاح منعقد ہو گیا۔

نکاح کا خطبہ واجب نہیں

البتہ سنت یہ ہے کہ نکاح سے پہلے خطبہ پڑھ لیا جائے اگر شوہر پڑھ سکتا ہے تو وہ خطبہ پڑھ لے، کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں، لیکن عام طور پر شوہر کو خطبہ نہیں آتا اس لئے قاضی صاحب کو بلا کر خطبہ پڑھوایا جاتا ہے اور اس کے ذریعہ ایجاب وقبول کرایا جاتا ہے، تاکہ سنت کے مطابق نکاح ہو جائے، ورنہ اسلام میں نہ خطبہ پڑھنا شرط ہے نہ مسجد میں جانا شرط ہے، نہ کسی قاضی سے نکاح پڑھوانا شرط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس نکاح کو اتنا آسان کر دیا تاکہ انسان کی فطری خواہش غلط راستے تلاش نہ کرے اور جب فطری خواہش پیدا ہو تو انسان کے پاس اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے حلال راستہ موجود ہو۔

ہم نے شادی کو عذاب بنالیا

آج ہم نے نکاح کو معاشرے میں ایک طومار بنالیا ہے، شادی کو ایک عذاب بنالیا ہے، آج کوئی شخص اس وقت تک شادی نہیں کر سکتا جب تک اس کے پاس ہزاروں لاکھوں روپے موجود نہ ہوں، کیونکہ اس کو تقریب کے لئے پیسے چاہئیں، مہندی کی رسم کے لئے پیسے چاہئیں، منگنی کی رسم کے لئے پیسے چاہئیں اور ان تمام کاموں میں اتنے آدمی بلانا ضروری ہے اور شادی کے لئے اتنا زیور چاہئے اتنے کپڑے چاہئیں، ولیمہ کی دعوت ہونی چاہئے، اس طرح نکاح میں رسم و رواج نے ہزار طومار بنا دیئے ہیں، جس نے نکاح کو ایک عذاب بنا دیا ہے، جبکہ شریعت میں اس طرح کی کوئی پابندی نہیں۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا نکاح

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مشہور صحابی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، اور سابقین اولین جو بالکل ابتداء اسلام میں ہی اسلام لے آئے یہ ان میں سے ہیں۔ اور ان دس خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خوشخبری سنائی کہ یہ جنت میں جائیں گے۔ ایک دن یہ مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کے لئے آئے۔ یہ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ آ گئے ایک دن یہ مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کے لئے آئے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوئی تو آپ نے دیکھا کہ ان کے کپڑوں پر زرد رنگ کی خوشبو لگی ہوئی ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ یہ تمہارے کپڑے پہ زرد رنگ کیسے لگا؟ انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ! میں نے ایک خاتون

سے نکاح کیا ہے، اس نکاح کے وقت خوشبو لگائی تھی۔ یہ اس خوشبو کا نشان ہے۔ اب دیکھئے کہ نکاح کرلیا اور اس نکاح کی تقریب میں حضور اقدس ﷺ کو بلایا تک نہیں اور حضور اقدس ﷺ نے بھی ان سے کوئی شکایت نہیں کی کہ واہ بھائی! تم نے اکیلے اکیلے نکاح کر لیا، ہمیں بلایا بھی نہیں، کیوں؟(۱)

اس لئے کہ یہ ساری شرطیں اور قیدیں جو ہم نے لگا رکھی ہیں کہ جب تک ہزار آدمی نہ بلائے جائیں جب تک شامیانہ نہ لگایا جائے جب تک ہال بک نہ کرایا جائے اس وقت تک شادی نہیں ہو گی، اسلام میں اور حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں ان چیزوں کا تصور نہیں تھا، تا کہ نکاح کو اتنا آسان کر دیا جائے کہ انسان جنسی خواہش کی تسکین کے لئے غلط راستے تلاش نہ کرے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا نکاح

ایک اور انصاری صحابی حضرت جابر رضی اللہ عنہ جو حضور اقدس ﷺ کے بے حد چہیتے صحابی اور لاڈلے صحابی تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ سے برسبیل تذکرہ ذکر کر دیا کہ یا رسول اللہ! میں نے نکاح کرلیا ہے، آپ ﷺ نے پوچھا کہ تم نے کسی کنواری سے نکاح کیا یا بیوہ سے نکاح کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ! میری چھوٹی چھوٹی ۶ بہنیں ہیں۔ ان کو ایسی عورت کی ضرورت تھی جو سمجھدار ہو، اور ان کی تربیت بھی کر سکے اب اگر میں کسی کنواری سے نکاح کرتا تو وہ ان کی پوری دیکھ بھال نہ کر سکتی، اس لئے میں نے ایک بیوہ سے نکاح کیا ہے، حضور ﷺ نے ان کو دعا دی کہ اللہ تعالیٰ تمہارے نکاح میں برکت دے۔(۲)

یہاں بھی نہ تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے حضور اقدس ﷺ کو بلایا، اور نہ ہی حضور اقدس ﷺ نے یہ شکایت کی کہ تم نے اکیلے اکیلے نکاح کر لیا اور ہمیں نہیں پوچھا۔ نکاح کے بارے میں اسلام کا یہ

(۱) صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب ماجاء فی قول الله تعالیٰ فإذا قضیت الصلاة، رقم: ۱۹۰۷ صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب الصداق وجواز تعلیم القرآن و خاتم حدیث، رقم: ۲۵۵۶، سنن الترمذی، کتاب النکاح عن رسول الله، باب ماجاء فی الولیمة، ۱۰۱٤، سنن النسائی، کتاب النکاح، باب التزویج علی نواة من ذهب، رقم: ۳۲۹، سنن أبی داؤد، کتاب النکاح، باب قلة المهر، رقم: ۱۸۰٤، سنن ابن ماجه، کتاب النکاح، باب الولیمة، رقم ۱۸۹۷، مسند أحمد، رقم: ۱۲۲۲٤

(۲) صحیح البخاری، کتاب النفقات، باب عون المرأة زوجها فی ولدها، رقم: ٤٩٤٨، صحیح مسلم، کتاب الرضاع، باب استحباب نکاح البکر، رقم: ۲٦٦٤، مسند أحمد، رقم: ۱٤٤٨۲

مزاج تھا جو حضور اقدس ﷺ نے ہمیں بتایا۔ آج ہم نے ہندوؤں اور غیر مسلموں کے ساتھ رہنے کے نتیجے میں اپنے نکاح اور شادی میں اتنی رسمیں بڑھالی ہیں کہ نکاح ایک عذاب بن کر رہ گیا ہے اور ایک عام آدمی کے لئے نکاح کرنا بڑا مشکل ہو گیا ہے۔

بہر حال! شریعت نے نکاح کا راستہ آسان کر دیا کہ اس طرح نکاح کرلو اور اس نکاح کے ذریعے اپنی جنسی خواہش جائز ذریعہ سے پوری کرلو۔ اسلام نے رہبانیت کی دعوت نہیں دی کہ تم نکاح کو بالکل چھوڑ دو۔

جائز تعلقات پر اجر و ثواب

پھر نہ صرف یہ کہ نکاح کی اجازت دی بلکہ یہ بھی فرمایا کہ میاں بیوی کے درمیان جو باہمی تعلقات ہوتے ہیں وہ نہ صرف جائز ہیں بلکہ وہ تعلقات ثواب کا ذریعہ ہیں۔

ایک مرتبہ ایک صحابی نے حضور اقدس ﷺ سے پوچھا "یا رسول اللہ! ہم اپنی بیوی کے ساتھ جو ازدواجی تعلق قائم کرتے ہیں وہ تو ہم اپنی ذاتی لذت حاصل کرنے کی خاطر کرتے ہیں۔ اس میں ثواب کیوں دیا جاتا ہے؟"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اگر تم یہ لذت حرام طریقے سے حاصل کرتے تو گناہ ہوتا یا نہیں؟"

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فرمایا "بے شک گناہ ہوتا"

آپ نے فرمایا "جب تم حرام طریقے کو چھوڑ دیا اور اللہ تعالیٰ کے حکم پر حلال طریقہ اختیار کر رہے ہو، تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس حلال طریقے پر ثواب عطا فرماتے ہیں، اور یہ عمل تمہارے لئے اجر کا سبب بنتا ہے"(۱)

نکاح میں تاخیر مت کیجیے

اور پھر اس حلال طریقے میں اللہ تعالیٰ نے اتنی آزادی دے دی کہ میاں بیوی پر اس بارے میں اوقات کی کوئی پابندی نہیں، مقدار کی اور عدد کی کوئی پابندی نہیں اور طریقوں کی بھی کوئی خاص پابندی نہیں، اس طرح سے اس میں آزادی دے دی تاکہ انسان ناجائز راستے تلاش نہ کرے۔ اسی لئے حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا "اگر تمہارے پاس تمہاری لڑکی کا رشتہ آئے

(۱) مسند أحمد (۶۷/۵)

اور ایسے لڑکے کا رشتہ آئے جو تمہیں پسند ہو، تمہیں ظاہری اعتبار سے بھی اور دین کے اعتبار سے بھی اچھا لگتا ہو، اور تمہارا کفو بھی لگتا ہو تو اس رشتے کو قبول کرلو اور اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں بڑا فتنہ اور فساد پھیلے گا'' (۱)

چنانچہ وہ فتنہ اس طرح پھیل رہا ہے کہ گھر میں لڑکیاں رشتوں کے انتظار میں بیٹھی ہوئی ہیں اور رشتے بھی موجود ہیں، لیکن جہیز کا انتظار ہے اور اس بات کا انتظار ہے کہ باپ کے پاس لاکھوں روپے آجائیں تو پھر وہ اپنی بیٹی کی شادی کر کے اس کو رخصت کرے۔ لیکن وہ لڑکیاں بھی تو انسان ہیں، ان کے دلوں میں بھی جذبات ہیں، ان کے دلوں میں بھی خواہشات ہیں۔ جب وہ خواہشات جائز طریقے سے پوری نہیں ہوں گی تو شیطان ان کو ناجائز طریقے کی طرف لے جائے گا، اور اس سے فتنہ وفساد پھیلے گا۔ معاشرے کے اندر آج دیکھ لیجیے کہ رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد سے روگردانی کے نتیجے میں کیسا فتنہ اور فساد پھیلا ہوا ہے۔

ان کے علاوہ سب حرام راستے ہیں

بہر حال! شریعت نے ایک طرف اس خواہش کی تسکین کا جائز طریقہ بتا دیا اور دوسری طرف یہ کہہ دیا کہ اس کے علاوہ جو راستے ہیں وہ انسان کو تباہی کی طرف لے جانے والے ہیں۔ بربادی کی طرف لے جانے والے ہیں ان سے بچو اور جو لوگ ان راستوں کی طرف جائیں گے وہ لوگ اپنی حد سے گزرنے والے ہیں اور عذاب کو دعوت دینے والے ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے فرمایا کہ جو لوگ اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ یعنی عفت وعصمت کی زندگی گزاریں اور جنسی خواہش کو پورا کرنے کے جو حلال طریقے ہیں صرف ان پر اکتفا کریں ان پر عمل کیے بغیر ان کو نہ دنیا میں فلاح حاصل ہوسکتی ہے اور نہ آخرت میں فلاح حاصل ہوسکتی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس عفت اور عصمت کو حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ اور اس کے لئے قرآن وسنت نے کیا تفصیلی احکام عطا فرمائے ہیں، یہ ایک مستقل موضوع ہے، اب وقت ختم ہو چکا ہے ان شاء اللہ اگر زندگی رہی تو اگلے جمعہ کو اس کی تفصیل عرض کروں گا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے فضل وکرم سے عفت وعصمت کی دولت عطا فرمائے، اپنی رضا کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب النکاح عن رسول اللہ، باب ماجاء اذا جاء کم من ترضون دینه فزوجوه، رقم: ۱۰۰۵

خطبہ نکاح کی اہمیت☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

ابھی ان شاء اللہ پرمسرت تقریب کا آغاز ہونے والا ہے، جس میں تقریب کے دولہا اور دلہن ان شاء اللہ نکاح مسنون کے رشتے میں منسلک ہونے والے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے لئے اس رشتے کو مبارک فرمائے۔

شادی کی تقریبات

مجھ سے فرمائش کی گئی کہ نکاح پڑھانے سے پہلے کچھ گزارشات آپ حضرات کی خدمت میں پیش کروں، اگرچہ شادی بیاہ کی تقریبات آج کل کے ماحول کے لحاظ سے کسی وعظ ونصیحت کی مجلس کے لئے موزوں نہیں، لیکن تقریب کو منعقد کرنے والے حضرات کی فرمائش ہے کہ اکثر حاضرین بھی اس موقع پر کوئی دین کی بات سننا چاہتے ہیں۔ اس لئے حکم کی خاطر چند کلمات آپ حضرات کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔

خطبہ نکاح کی تین آیات

ابھی ان شاء اللہ نکاح کے خطبے کا آغاز ہوگا، اور یہ خطبہ نبی کریم ﷺ کی سنت ہے، نکاح بھی حضور اقدس ﷺ کی سنت ہے، آپ نے ارشاد فرمایا:

((اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِى)) (۱)

شرعی اعتبار سے تو نکاح دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول سے منعقد ہو جاتا ہے، لیکن

☆ اصلاحی خطبات (۱/۲۴۸-۲۵۳)، ۲۶ دسمبر ۱۹۹۱ء بروز جمعرات، بعد از نماز عشاء، فاران کلب، گلشن اقبال کراچی، حضرت مفتی صاحب مدظلہ نے یہ بیان حاجی محمد نسیم انبالوی صاحب کے فرزند کی تقریب نکاح کے موقع پر فرمایا۔

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب النكاح، باب ماجاء في فضل النكاح، رقم: ۱۸۳٦

حضور ﷺ نے اس کے لئے جو مسنون طریقہ مقرر فرمایا، وہ یہ ہے کہ ایجاب وقبول سے پہلے ایک خطبہ دیا جائے، اس خطبہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی حمد ہوتی ہے، حضور نبی کریم ﷺ پر درود بھیجا جاتا ہے، اور عموماً قرآن کریم کی تین آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں، حضور اقدس ﷺ نے نکاح کے موقع پر یہ تین آیتیں تلقین فرمائیں کہ نکاح کے خطبہ میں ان آیات کی تلاوت کی جائے، سب سے پہلے سورۃ نساء کی پہلی آیت تلاوت کی جاتی ہے:

﴿يَآيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِي تَسَآءَلُونَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا﴾(۱)

اس آیت کا ترجمہ یہ ہے:

''اے لوگو! اپنے اس پروردگار سے ڈرو، اور تقویٰ اختیار کرو، جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا، (یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے) اور اسی جان سے اس کی بیوی کو پیدا کیا (یعنی حضرت حوا علیہا السلام کو) اور ان دونوں (آدم اور حوا) کے ذریعہ دنیا میں بہت سے مرد اور عورت پھیلا دیئے (کہ ساری دنیا کی آبادی انہیں دو مقدس میاں بیوی کی اولاد ہیں) اور اس سے ڈرو جس کے نام کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے (اپنے حقوق کا) مطالبہ کرتے ہو (جب کسی کو دوسرے سے اپنا حق مانگنا ہوتا ہے تو وہ اکثر اللہ کا واسطہ دے کر مانگتا ہے کہ خدا کے واسطے میرا یہ حق دے دو) اور رشتہ داریوں (کے حقوق) سے بھی ڈرو (یعنی اس کا خیال رکھو کہ رشتہ داریوں کے حقوق پامال نہ ہونے پائیں) اور اللہ تعالیٰ تمہارے تمام اعمال وافعال پر نگراں ہے'' (وہ دیکھ رہا ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اور کیا کر رہے ہو)

یہ پہلی آیت جو خطبہ نکاح میں تلاوت کی جاتی ہے، دوسری آیت سورۃ آل عمران کی ہے، وہ یہ ہے:

﴿يَآيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُونَ﴾(۲)

اس کا ترجمہ یہ ہے:

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو (جیسا کہ اس سے) ڈرنے کا حق ہے، اور تم نہ مرو

---

(۱) النساء: ۱

(۲) آل عمران: ۱۰۲

(موت نہ آئے) مگر اس حالت میں کہ تم اللہ کے فرماں بردار ہو"

تیسری آیت جو رسول اللہ ﷺ نے خطبہ نکاح میں تعلیم فرمائی، وہ یہ ہے:

﴿يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا﴾(۱)

اس کا ترجمہ یہ ہے:

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور (سیدھی) سچی بات کہو (اگر اللہ سے ڈرو گے، اور سیدھی سچی بات کہنے کی عادت ڈالو گے) تو اللہ تعالیٰ تمہارے تمام اعمال کو قبول فرمالیں گے، اور تمہارے گناہوں کو معاف فرما دیں گے، جو شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرے گا تو وہ بڑی کامیابی حاصل کرے گا۔"

تینوں آیتوں میں مشترک چیز

اس لئے خاص طور پر اس نکاح کی تقریب کے موقع پر جو خطبہ نبی کریم ﷺ نے مشروع فرمایا، اس میں ان تین آیتوں کو مقرر فرما کر تقویٰ کی تاکید فرمائی، یوں تو ہر انسان جب مسلمان ہوتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور تقویٰ کا عہد کرتا ہے۔

نئی زندگی کا آغاز

لیکن یہ موقع زندگی کا ایک دوراہا ہے، جس میں ایک نئی زندگی کا آغاز ہو رہا ہے، زندگی میں ایک انقلاب آرہا ہے، اس وقت میں تقویٰ کے اس عہد کو دوبارہ تازہ کریں، اور اس کی تجدید کریں، تو ان تین آیتوں کو تلاوت کرنے کا درحقیقت یہ مقصود ہے، اللہ تعالیٰ اس حقیقت کو ہمیں صحیح طور پر سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے، اور اس موقع پر تقویٰ حاصل کرنے کی فکر اور اس کی کوشش کو تازہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

☆☆☆

(۱) الاحزاب: ۷۰-۷۱

خطبۂ نکاح کا پیغام ☆

ہم میں سے شاید کوئی شخص بھی ایسا نہ ہو جس نے کبھی کسی نکاح کی تقریب میں حصہ نہ لیا ہو، آئے دن شادی کی تقریبات اور نکاح کی محفلیں منعقد ہوتی رہتی ہیں، اور تقریباً ہر محفل میں سینکڑوں افراد شریک ہوتے ہیں، ان محفلوں میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایجاب وقبول سے پہلے نکاح خواں ایک خطبہ پڑھتا ہے، اس کے بعد نکاح کی کارروائی ہوتی ہے، اگرچہ نکاح کی صحت کے لئے خطبہ کوئی لازمی شرط نہیں ہے، اس کے بغیر بھی دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول کرنے سے نکاح صحیح ہو جاتا ہے، لیکن یہ آنحضرت ﷺ کی سنت ہے کہ نکاح سے پہلے آپ ﷺ مختصر خطبہ دیتے تھے، اور اس کے ابتدائی الفاظ آپ ﷺ نے خود حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو سکھائے تھے، یہی وہ الفاظ ہیں جو ہم تقریباً ہر نکاح کی محفل میں نکاح خواں کی زبانی سنتے ہیں، عام طور سے خطبے کے یہ الفاظ، ان کا مقصد اور ان کی معنویت شادی کے طربیہ ہنگاموں میں گم ہو کر رہ جاتی ہے، انہیں بے توجہی کے ساتھ سنا جاتا ہے، اور اگر نکاح کی محفل بڑی ہو، اور لاؤڈ اسپیکر کا انتظام نہ ہو تو اکثر لوگ انہیں سن بھی نہیں پاتے، اور عین خطبہ کے وقت بھی باتیں کرتے نظر آتے ہیں، (اور یہ بھی اس بے توجہی کا شاخسانہ ہے کہ جو لوگ نکاح کی تقریب پر ہزاروں، بلکہ بعض اوقات لاکھوں روپے خرچ کرتے ہیں، وہ بعض اوقات اتنا بھی خیال نہیں کرتے کہ تھوڑے سے پیسے مزید خرچ کر کے لاؤڈ اسپیکر کا انتظام کر دیں، تاکہ خطبہ اور ایجاب وقبول جو پوری تقریب کی اصل روح ہے، وہ پرسکون اور باوقار طریقے سے انجام پا سکے اور حاضرین ان بابرکت کلمات کو ہاؤ ہو کے بجائے تقدس کی فضا میں سن سکیں)

بہرکیف! اگر خطبہ سننے میں آ بھی جائے تو عموماً اسے محض ایک تبرک سمجھا جاتا ہے، اور عام لوگوں کے ذہن میں اس کا مقصد صرف برکت کا حصول ہوتا ہے، اس سے آگے کچھ نہیں، لہٰذا شاید ہی کوئی صاحب ایسے ہوں جنہوں نے یہ جاننے سمجھنے کی کوشش کی ہو کہ ان الفاظ کا مطلب کیا ہے؟ وہ کیوں اس موقع پر پڑھے جاتے ہیں؟ اور ان کا نکاح سے کیا تعلق ہے؟ چونکہ خطبے کے یہ الفاظ خود آنحضرت ﷺ سے ثابت ہیں، بلکہ آپ نے باقاعدہ سکھائے ہیں، اس لئے ہمیں ان کا مفہوم، مقصد

☆ ذکر وفکر، ص: ۲۹۷

اور پس منظر ضرور سمجھنا چاہئے، تا کہ ہم اس بابرکت سنت کی معنویت سے واقعی آ گاہ ہوسکیں۔

ان الفاظ کی ابتداء تو اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا سے ہوتی ہے، اور بحیثیت مسلمان ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اپنے ہر اہم کام کا آغاز اللہ تعالیٰ کی حمد سے کیا جائے، اس لئے کہ اس کائنات میں کوئی بھی کام اس کی توفیق کے بغیر انجام نہیں پا سکتا، نکاح دو افراد کی زندگی کا اہم ترین دوراہا ہے، جس کے ذریعہ یہ دو افراد زندگی کے ایک نئے سفر کا آغاز کرتے ہیں، اس موقع پر ہمیں بطور خاص یہ سکھایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد اور دعا سے یہ سفر شروع کریں، حمد و ثناء اور دعا کے لئے جو الفاظ اس موقع پر آنحضرت ﷺ نے تلقین فرمائے ہیں وہ کتنے خوبصورت اور کتنے جامع ہیں، اس کا اندازہ ان کے ترجمے سے ہوسکتا ہے، اصل عربی الفاظ تو یہ ہیں:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ، وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَاَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا))

اور ان کا ترجمہ یہ ہے:

''تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، ہم اس کی حمد کرتے ہیں، اسی سے مدد مانگتے ہیں، اسی سے اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے ہیں، اسی پر ایمان لاتے اور اسی پر بھروسہ رکھتے ہیں، ہم اپنی نفسانیت کے شر سے اور اپنے اعمال کی برائیوں سے اسی کی پناہ مانگتے ہیں، جسے وہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا، اور جسے وہ گمراہ کردے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا، ہم گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اور ہم یہ بھی گواہی دیتے ہیں کہ محمد (ﷺ) اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں، اللہ تعالیٰ ان پر اور ان کے تمام آل واصحاب پر اپنی رحمتیں اور سلامتی نازل فرمائے''

نکاح کے موقع پر دولہا دلہن ہی نہیں ان کے دونوں خاندان اپنی زندگی کے بڑے نازک دوراھے پر ہوتے ہیں، اگر دل مل جائیں تو زندگی جنت کا نمونہ بن جاتی ہے، اور اگر خدانہ کرے دلوں میں ملاپ نہ ہو تو دونوں خاندانوں کے لئے ایک مستقل دردسر کھڑا ہو جاتا ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی حمد کے ساتھ اس سے مدد مانگنے کی تلقین کی گئی ہے، اور چونکہ بسا اوقات ازدواجی زندگی کے فتنے خود اپنی

بدطینتی یا بداعمالیوں سے پیدا ہوتے ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنی بداعمالیوں کے شر سے اسی کی پناہ مانگی گئی ہے، اور اسی سے اس بات کی توفیق طلب کی گئی ہے کہ وہ ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرمائے اور گمراہی سے محفوظ رکھے۔ اور یہ ساری حمد وثناء اور دعائیں چونکہ توحید و رسالت پر مستحکم ایمان کے بغیر بے معنی ہیں، اس لئے توحید اور آنحضرت ﷺ کی گواہی کی تجدید کرائی گئی ہے، اور آخر میں آنحضرت ﷺ پر درود وسلام بھیجا گیا ہے، کیونکہ آپ ﷺ ہی ہمارے لئے ہدایت کا یہ نور لے کر تشریف لائے۔

یہ ہیں خطبۂ نکاح کے تمہیدی الفاظ، اس کے بعد عموماً خطبے میں قرآن کریم کی تین آیتوں کی تلاوت کی جاتی ہے، پہلی آیت سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۱۰۲ ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ﴾ (۱)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے، اور تمہیں موت اسلام ہی کی حالت میں آنی چاہئے''

دوسری آیت سورۂ نساء کی پہلی آیت ہے:

﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَاءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَاءَلُوْنَ بِهٖ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا﴾ (۲)

''اے لوگو! اپنے اس پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان (یعنی آدم) سے پیدا کیا، اور اسی سے اس کی بیوی پیدا کی اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیئے، اور اس اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حقوق مانگتے ہو، اور رشتہ داریوں کا پاس کرو، بے شک اللہ تمہاری نگرانی کرنے والا ہے۔''

تیسری آیت سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۷۰، ۷۱ ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا يُّصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا﴾ (۳)

---

(۱) آل عمران: ۱۰۲

(۲) النساء: ۱

(۳) الأحزاب: ۷۰-۷۱

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور سیدھی بات کہا کرو، اللہ تمہارے کام سنوار دے گا، اور تمہارے گناہ معاف کردے گا، اور جس شخص نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرلی اس نے بڑی عظیم کامیابی حاصل کی''

۱۷ رجب ۱۴۱۶ھ/ ۱۰ دسمبر ۱۹۹۵ء

☆☆☆

نکاح اور برادری ☆

شادی بیاہ کے معاملے میں لوگ ابھی تک اپنے خود ساختہ خیالات کے بندھن میں کس بری طرح جکڑے ہوئے ہیں، اور اس معاملے میں اسلامی تعلیمات سے غفلت اور ناواقفیت کتنی عام ہو چکی ہے؟ اس کا اندازہ ان مختلف قضیوں سے ہوتا رہتا ہے جو لوگ شرعی حکم معلوم کرنے کے لئے بکثرت میرے سامنے لاتے رہتے ہیں، ابھی ایک خاتون نے امریکہ سے مجھے ایک طویل خط میں اپنی دردبھری داستان لکھی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کے والدین ایک کروڑ پتی آدمی ہیں، پڑھے لکھے ہیں، لیکن ان کو یہ اصرار تھا کہ وہ اپنی کسی بیٹی کی شادی اپنی برادری سے باہر نہیں کریں گے، خاتون نے لکھا ہے کہ میں ان کی بڑی بیٹی ہوں، اور شروع میں مجھ سے شادی کرنے کے لئے کئی رشتے آئے، لیکن میرے والد نے ہر رشتہ کو یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ برادری سے باہر کا رشتہ ہے، اس لئے ان کے لئے قابل قبول نہیں۔ یہاں تک کہ میری عمر زیادہ ہوتی چلی گئی، اور بالآخر رشتے آنے بند ہو گئے۔

پھر ایک روز میرے والد نے مجھ سے یہ کہا کہ اب میرے لئے تمہارا کوئی رشتہ اپنی برادری سے حاصل کرنا ممکن نہیں رہا، لہٰذا اب تم میرے سامنے یہ حلف اٹھاؤ کہ عمر بھر شادی نہیں کرو گی، میں چونکہ مالدار آدمی ہوں، لہٰذا جیتے جی تمہاری کفالت کروں گا، لیکن مجھے یہ کسی قیمت پر گوارا نہیں ہے کہ تمہاری شادی برادری سے باہر ہو، خاتون کہتی ہیں کہ والد صاحب نے مجھے یہ اقرار کرنے پر اتنا مجبور کیا کہ بالآخر میں نے یہ وعدہ کر لیا کہ تمام عمر شادی نہیں کروں گی، اور اس کے بعد واقعۃً میں نے یہ تہیہ بھی کر لیا کہ اپنے والد کی خواہش کے احترام میں زندگی اسی طرح گزاروں گی، لیکن میری چھوٹی بہن، ایک بھائی اور والدہ اس فیصلے پر راضی نہیں ہوئے، ایک صاحب جنہوں نے عرصہ دراز پہلے میرے لئے رشتہ مانگا تھا، اور والد صاحب نے انہیں سختی سے انکار کر دیا تھا، ابھی تک مجھ سے شادی کرنے پر آمادہ تھے، میرے بھائی بہن نے ان سے بات کی، اور والد صاحب کو بھی آمادہ کرنے کی کوشش کی، آخر کار والد صاحب نے اتنا کہہ دیا کہ اس کے بعد لڑکی کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہوگا، بہن

☆ ذکر و فکر، ص: ۳۱۵

نے مجھ سے والد صاحب کی یہ بات چھپائی اور صرف اتنا کہا کہ وہ ناراض تو ہیں، مگر نکاح پر آمادہ ہو گئے ہیں، چنانچہ یہ نکاح ہو گیا، اور میں اپنے شوہر کے ساتھ امریکہ چلی آئی، لیکن اب مجھے پتہ چلا ہے کہ والد صاحب نے عمر بھر کے لئے مجھ سے قطع تعلق کر لیا ہے، نہ وہ مجھ سے فون پر بات کرنے کے لئے تیار ہیں نہ مجھے اپنی بیٹی تسلیم کرنے پر آمادہ ہیں۔

یہ واقعہ تو انتہائی سنگین نوعیت کا ہے، لیکن یہ بات اکثر دیکھنے سننے میں آتی رہتی ہے کہ لوگ برادری میں نکاح کرنے کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیوں کا شکار ہیں، یہ درست ہے کہ شریعت نے نکاح کے معاملے میں ایک حد تک کفو کی رعایت رکھی ہے، لیکن اس کا مقصد یہ ہے کہ نکاح چونکہ زندگی بھر کا ساتھ ہوتا ہے اس لئے میاں بیوی اور دونوں خاندانوں کے درمیان طبعی ہم آہنگی ہو، ان کے رہن سہن، ان کے طرزِ فکر اور ان کے مزاج میں اتنی دوری نہ ہو کہ ایک دوسرے کے ساتھ نباہ کرنے میں مشکل پیش آئے، لیکن اول تو کفو کی اس رعایت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اگر کفو میں کوئی رشتہ نہ ملے تو یہ قسم کھالی جائے کہ اب زندگی بھر شادی ہی نہیں ہو سکے گی، دوسرے کفو کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خاص اپنی برادری ہی میں رشتہ کیا جائے، اور برادری کے باہر سے جو بھی رشتے آئیں، انہیں غیر کفو قرار دیا جائے۔

اس سلسلے میں مندرجہ ذیل باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہئیں جنہیں نظر انداز کرنے سے ہمارے معاشرے میں بڑی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں:

① ہر وہ شخص کسی لڑکی کا کفو ہے جو اپنے خاندانی حسب نسب، دین داری اور پیشے کے لحاظ سے لڑکی اور اس کے خاندان کا ہم پلہ ہو، یعنی کفو میں ہونے کے لئے اپنی برادری کا فرد ہونا ضروری نہیں، بلکہ اگر کوئی شخص کسی اور برادری کا ہے، لیکن اس کی برادری بھی لڑکی کی برادری کے ہم پلہ سمجھی جاتی ہے، تو وہ بھی لڑکی کا کفو ہے، کفو سے باہر نہیں ہے، مثلاً سید، صدیقی، فاروقی، عثمانی، علوی بلکہ تمام قریشی برادریاں آپس میں ایک دوسری کے لئے کفو ہیں، اسی طرح جو مختلف عجمی برادریاں ہمارے ملک میں پائی جاتی ہیں مثلاً راجپوت، خان وغیرہ وہ بھی اکثر ایک دوسری کے ہم پلہ سمجھی جاتی ہیں، اور ایک دوسری کے لئے کفو ہیں۔

② بعض احادیث و روایات میں یہ ترغیب ضرور دی گئی ہے کہ نکاح کفو میں کرنے کی کوشش کی جائے، تاکہ دونوں خاندانوں کے مزاج آپس میں میل کھا سکیں، لیکن یہ سمجھنا غلط ہے کہ کفو سے باہر نکاح کرنا شرعاً بالکل ناجائز ہے، یا یہ کہ کفو سے باہر نکاح شرعاً درست نہیں ہوتا، حقیقت یہ ہے کہ اگر لڑکی اور اس کے اولیاء کفو سے باہر نکاح کرنے پر راضی ہوں، تو کفو سے باہر کیا ہوا نکاح بھی شرعاً منعقد ہو جاتا ہے، اور اس میں نہ کوئی گناہ ہے، نہ کوئی ناجائز

بات، لہٰذا اگر کسی لڑکی کا رشتہ کفو میں میسر نہ آ رہا ہو، اور کفو سے باہر کوئی مناسب رشتہ مل جائے تو وہاں شادی کر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، کفو میں رشتہ نہ ملنے کی وجہ سے لڑکی کو عمر بھر بغیر شادی کے بٹھائے رکھنا کسی طرح جائز نہیں۔

(۳) شریعت نے یہ ہدایت ضروری ہے کہ لڑکی کو نکاح بغیر ولی کے نہیں کرنا چاہئے (خاص طور سے اگر کفو سے باہر نکاح کرنا ہو تو ایسا نکاح اکثر فقہاء کے نزدیک بغیر ولی کے درست نہیں ہوتا) لیکن ولی کو بھی یہ چاہئے کہ وہ کفو کی شرط پر اتنا زور نہ دے جس کے نتیجے میں لڑکی عمر بھر شادی سے محروم ہو جائے، اور برادری کی شرط پر اتنا زور دینا تو اور بھی زیادہ بے بنیاد اور لغو حرکت ہے جس کا کوئی جواز نہیں ہے۔

ایک حدیث میں حضور سرور کونین ﷺ کا ارشاد ہے:

((إِذَا جَاءَكُمْ مَنْ تَرْضَوْنَ دِينَهُ وَخُلُقَهُ فَزَوِّجُوهُ إِلَّا تَفْعَلُوا تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ)) (۱)

"جب تمہارے پاس کوئی ایسا شخص رشتہ لے کر آئے جس کی دینداری اور اخلاق تمہیں پسند ہوں تو اس سے (اپنی لڑکی کا) نکاح کر دو، اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں بڑا فتنہ و فساد برپا ہوگا"

(۴) اسی ضمن میں یہ غلط فہمی بھی بہت سے لوگوں میں عام ہے کہ سید لڑکی کا نکاح غیر سید گھرانے میں نہیں ہو سکتا، یہ بات بھی شرعی اعتبار سے درست نہیں ہے، ہمارے عرف میں "سید" ان حضرات کو کہتے ہیں جن کا نسب بنی ہاشم سے جا ملتا ہو، چونکہ حضور سرور کونین ﷺ بنی ہاشم سے تعلق رکھتے تھے، اس لئے بلاشبہ اس خاندان سے نسبی وابستگی ایک بہت بڑا اعزاز ہے، لیکن شریعت نے ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی کہ اس خاندان کی کسی لڑکی کا نکاح باہر نہیں ہو سکتا، بلکہ جیسا میں نے اوپر عرض کیا، نہ صرف شیوخ، بلکہ تمام قریشی نسب کے لوگ بھی شرعی اعتبار سے سادات کے کفو ہیں، اور ان کے درمیان نکاح کا رشتہ قائم کرنے میں کوئی شرعی رکاوٹ نہیں ہے، بلکہ قریش سے باہر کے خاندانوں میں بھی باہمی رضامندی کے ساتھ نکاح ہو سکتا ہے۔

۲۶ ذوالحجہ ۱۴۱۶ھ / ۱۵ مئی ۱۹۹۶ء

(۱) سنن الترمذی، کتاب النکاح عن رسول اللہ، باب ماجاء اذا جاء کم من ترضون دینہ فزوجوہ، رقم: ۱۰۰۵

شادی بیان کی رسمیں ☆

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ان دس خوش نصیب صحابہ میں سے ہیں جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی خوشخبری دی تھی، حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دیکھا تو ان کے کپڑوں پر ایک پیلا سا نشان نظر آیا، آپ نے پوچھا کہ یہ کیسا نشان ہے؟ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں نے ایک خاتون سے نکاح کیا ہے، (مطلب یہ تھا کہ نکاح کے موقع پر کپڑوں پر خوشبو لگائی تھی، اس کا یہ نشان باقی رہ گیا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں برکت کی دعا دی، اور فرمایا: ولیمہ کرنا چاہے ایک بکری ہی کا ہو۔(۱)

اندازہ لگایئے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتنے قریبی صحابی ہیں کہ دس منتخب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ان کا شمار ہوتا ہے، لیکن انہوں نے نکاح کیا تو نکاح کی مجلس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک کو دعوت دینے کی ضرورت نہیں سمجھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کپڑوں پر لگی ہوئی خوشبو کا نشان دیکھ کر سوال کیا تو انہوں نے بتایا کہ میں نے نکاح کیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کوئی شکایت نہیں فرمائی کہ تم اکیلے اکیلے نکاح کر بیٹھے اور ہمیں پوچھا بھی نہیں، شکایت کے بجائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دعا دی، البتہ ساتھ ہی یہ ترغیب بھی دی کہ ولیمہ کریں۔

دراصل اسلام نے نکاح کو اتنا آسان اور اتنا سادہ بنایا کہ جب دونوں فریق راضی ہوں، وہ کسی بے جا رکاوٹ کے بغیر یہ رشتہ قائم کر سکیں، شریعت نے یہ شرط بھی نہیں لگائی کہ کوئی قاضی یا عالم ہی نکاح پڑھائے، شریعت کی طرف سے شرط صرف اتنی ہے کہ نکاح کی مجلس میں دو گواہ موجود ہوں،

☆ ذکر وفکر، ص:۲۶۶

(۱) صحيح البخاری، كتاب البيوع، باب ماجاء فی قول الله تعالىٰ فإذا قضيت الصلاة، رقم: ۱۹۰۷ صحيح مسلم، كتاب النكاح، باب الصداق وجواز و تعليم القرآن و خاتم حديث، رقم: ۲۵۵٦، سنن الترمذی، كتاب النكاح عن رسول الله، باب ماجاء فی الوليمة، ۱۰۱٤، سنن النسائی، كتاب النكاح، باب التزويج على نواة من ذهب، رقم: ۳۲۹، سنن أبی داؤد، كتاب النكاح، باب قلة المهر، رقم: ۱۸۰٤، سنن ابن ماجه، كتاب النكاح، باب الوليمة، رقم: ۱۸۹۷، مسند أحمد، رقم: ۱۲۲۲٤

اگر دولہا دلہن عاقل و بالغ ہوں تو ان میں سے کوئی دوسرے سے کہہ دے کہ میں نے تم سے نکاح کیا، دوسرا جواب دے دے کہ میں نے قبول کیا، بس نکاح ہو گیا نہ اس کے لئے کسی عدالت میں جانے کی ضرورت ہے نہ کسی تقریب کی کوئی شرط ہے۔ نہ دعوت ضروری ہے، نہ جہیز لازمی ہے، ہاں! دلہن کے اکرام کے لئے مہر ضروری ہے، اور صحیح طریقہ یہی ہے کہ مہر کا تعین بھی نکاح ہی کے وقت کرلیا جائے، لیکن اگر بالفرض نکاح کے وقت مہر کا ذکر نہ آیا ہو تب بھی نکاح ہو جاتا ہے، اور مہر مثل لازم سمجھا جاتا ہے، نکاح کے وقت خطبہ بھی ایک سنت ہے، اور حتی الامکان اس سنت کی برکات ضرور حاصل کرنی چاہئیں، لیکن نکاح کی صحت اس پر موقوف نہیں، لہٰذا اگر خطبہ کے بغیر ہی ایجاب وقبول کرلیا جائے، تب بھی نکاح صحیح ہو جاتا ہے، نکاح میں کوئی نقص نہیں آتا۔

ولیمہ، جس کی ترغیب آنحضرت ﷺ نے مذکورہ بالا حدیث میں دی ہے وہ بھی سنت ہے، لیکن اول تو وہ بھی ایسا فرض یا واجب نہیں کہ اس کے بغیر نکاح نہ ہو سکتا ہو، دوسرے اس کی کوئی مقدار شریعت نے مقرر نہیں کی، نہ مہمانوں کی کوئی تعداد لازمی قرار دی ہے، ہر شخص اپنی مالی استطاعت کے اعتبار سے اس کا فیصلہ کرسکتا ہے، اس کے لیے قرض ادھار کرنے کی بھی نہ صرف کوئی حاجت نہیں، بلکہ ایسا کرنا شرعاً ناپسندیدہ ہے، کوئی شخص جتنے مختصر پیمانے پر ولیمہ کرسکتا ہے، اتنے ہی مختصر پیمانے پر کرلے، اور نہ کر سکے تب بھی اس سے نکاح میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔

اسلام نے نکاح کو اتنا آسان اس لئے کیا تھا کہ نکاح انسانی فطرت کا ایک ضروری تقاضا جائز طریقے سے پورا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے، اور اگر اس جائز ذریعے پر رکاوٹیں عائد کی جائیں، یا اس کو مشکل بنایا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ بے راہ روی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے، جب کوئی شخص اپنی فطری ضرورت پوری کرنے کے لئے جائز راستے بند پائے گا، تو اس کے دل میں ناجائز راستوں کی طلب پیدا ہوگی، اور اس طرح پورا معاشرہ بگاڑ کا شکار ہوگا۔

لیکن اسلام نے نکاح کو جتنا آسان بنایا تھا، ہمارے موجودہ معاشرتی ڈھانچے نے اسے اتنا ہی مشکل بنا ڈالا ہے، نکاح کے بابرکت معاہدے پر ہم نے لامتناہی رسموں، تقریبات اور فضول اخراجات کا ایسا بوجھ لاد رکھا ہے کہ ایک غریب، بلکہ متوسط آمدنی والے شخص کے لئے بھی وہ ایک ناقابل عبور پہاڑ بن کر رہ گیا ہے، اور کوئی شخص اس وقت تک نکاح کا تصور نہیں کرسکتا جب تک اس کے پاس (گری سے گری حالت میں بھی) لاکھ دو لاکھ روپے موجود نہ ہوں۔ یہ لاکھ دو لاکھ روپے کا نکاح حقیقی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے نہیں، بلکہ صرف فضول رسموں کا پیٹ بھرنے کے لئے درکار ہیں، جنہیں خرچ کرنے سے زندگی کی حقیقی ضروریات پوری کرنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔

شریعت کی طرف سے نکاح کے موقع پر لے دے کر صرف ایک دعوت ولیمہ مسنون تھی، اور وہ بھی ہر شخص کی استطاعت کے مطابق، لیکن اب تقریبات اور دعوتوں کا سلسلہ روز بروز بڑھتا ہی جا رہا ہے، منگنی کی تقریب ایک مستقل شادی کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے، اور عین نکاح کے موقع پر مہندی ابٹن سے لے کر چوتھی بھوڑے تک تقریباً ہر روز کسی نہ کسی تقریب کا اہتمام لازمی سمجھ لیا گیا ہے، جس کے بغیر شادی بیاہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ پھر تقریبات میں بھی زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ نت نئے اخراجات کا اضافہ ہو رہا ہے، نئے نئے مطالبے سامنے آ رہے ہیں، نئی نئی رسمیں وجود میں آ رہی ہیں غرض فضولیات کا ایک طومار ہے جس نے شادی کو خاص طور سے غریب اور متوسط آدمی کے لئے ایک ایسی ذمہ داری میں تبدیل کر دیا ہے جو عام طور پر صرف حلال آمدنی سے پوری نہیں ہو سکتی، لہٰذا اسے پورا کرنے کے لئے کہیں نہ کہیں ناجائز ذرائع کا سہارا لینا پڑتا ہے، اور اس طرح نکاح کا یہ کار خیر نہ جانے کتنی بدعنوانیوں اور کتنے گناہوں کا ملغوبہ بن کر رہ جاتا ہے، اور جس نکاح کا آغاز ہی بدعنوانی یا گناہ سے ہو، اس میں خیر و برکت کہاں سے آئے گی؟

خوشی کے مواقع پر اعتدال کے ساتھ خوشی منانے پر شریعت نے کوئی پابندی نہیں لگائی، لیکن خوشی منانے کے نام پر ہم نے اپنے آپ کو جن بے شمار رسموں میں جکڑ لیا ہے، ان کا نتیجہ یہ ہے کہ خوشی، جو دل کی فرحت کا نام تھا، وہ تو پیچھے چلی گئی ہے، اور رسموں کے لگے بندھے قواعد آگے آ گئے ہیں، جن کی ذرا خلاف ورزی ہو تو شکوے شکایتوں اور طعن و تشنیع کا طوفان کھڑا ہو جاتا ہے، لہٰذا شادی کی تقریبات رسموں کی خانہ پری کی نذر ہو جاتی ہیں، جس میں پیسہ تو پانی کی طرح بہتا ہی ہے، دل و دماغ ہر وقت رسمی قواعد کے بوجھ تلے دبے رہتے ہیں، شادی کے انتظامات کرنے والے تھک کر چور ہو جاتے ہیں پھر بھی کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی شکایت کا سامان پیدا ہو ہی جاتا ہے، جس کے نتیجے میں بعض اوقات لڑائی جھگڑوں تک بھی نوبت پہنچ جاتی ہے۔

زبان سے اس صورت حال کو ہم سب قابل اصلاح سمجھتے ہیں، لیکن جب عمل کی نوبت آتی ہے تو عموماً پرنالہ وہیں گرتا ہے، اور ایک ایک کر کے ہم تمام رسموں کے آگے ہتھیار ڈالتے چلے جاتے ہیں۔

اس صورت حال کا کوئی حل اس کے سوا نہیں ہے کہ اول تو بااثر اور خوش حال لوگ بھی اپنی شادیوں کی تقریبات میں حتی الامکان سادگی اختیار کریں، اور ہمت کر کے ان رسموں کو توڑیں جنہوں نے شادی کو ایک عذاب بنا کر رکھ دیا ہے، دوسرے اگر دولت مند افراد اس طریق کار کو نہیں چھوڑتے تو کم از کم محدود آمدنی والے افراد یہ طے کر لیں کہ وہ دولت مندوں کی حرص میں اپنا پیسہ اور توانائیاں

ضائع کرنے کے بجائے اپنی چادر کے مطابق پاؤں پھیلائیں گے، اور اپنی استطاعت کی حدود سے آگے نہیں بڑھیں گے۔

اس سلسلے میں اگر ہم مندرجہ ذیل باتوں کا خاص طور پر اہتمام کرلیں تو امید ہے کہ مذکورہ بالا خرابیوں میں ان شاء اللہ نمایاں کمی واقع ہوگی۔

① خاص نکاح اور ولیمہ کی تقریبات کے علاوہ جو تقریبات منگنی، مہندی، ابٹن اور چوتھی وغیرہ کے نام سے رواج پا گئی ہیں، ان کو یکسر ختم کیا جائے، اور یہ طے کرلیا جائے کہ ہماری شادیوں میں یہ تقریبات نہیں ہوں گی، فریقین اگر واقعی محبت اور خوش دلی سے ایک دوسرے کو کوئی تحفہ دینا یا بھیجنا چاہتے ہیں وہ کسی باقاعدہ تقریب اور لاؤلشکر کے بغیر سادگی سے پیش کردیں گے۔

② اظہار مسرت کے کسی بھی مخصوص طریقے کو لازمی اور ضروری نہ سمجھا جائے، بلکہ ہر شخص اپنے حالات اور وسائل کے مطابق بے تکلفی سے جو طرز عمل اختیار کرنا چاہے کرلے، نہ وہ خود کسی کی حرص کا شکار یا رسموں کا پابند ہو، نہ دوسرے اسے مطعون کریں۔

③ نکاح اور ولیمے کی تقریبات بھی حتی الامکان سادگی سے اپنے وسائل کی حد میں رہتے ہوئے منعقد کی جائیں، اور صاحب تقریب کا یہ حق تسلیم کیا جائے کہ وہ اپنے خاندانی یا مالی حالات کے مطابق جس کو چاہے دعوت دے، اور جس کو چاہے، دعوت نہ دے، اس معاملے میں بھی کسی کو کوئی سنجیدہ شکایت نہیں ہونی چاہئے۔

④ نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ہمیشہ ہمارے سامنے رہے:

((اَعْظَمُ النِّكَاحِ بَرَكَةً اَيْسَرُهُ مُؤْنَةً))(۱)

''سب سے زیادہ برکت والا نکاح وہ ہے جس میں زیر باری کم سے کم ہو''

یعنی جس میں انسان نہ مالی طور پر زیر بار ہو، اور نہ بیجا مشقت ومحنت کے کسی بوجھ میں مبتلا ہو۔

۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۶ھ

۱۵ اکتوبر ۱۹۹۵ء

☆☆☆

(۱) مسند أحمد بن حنبل، حديث سيدة عائشة رضي الله عنها، رقم: ۲۳۳۸۸

مہرِ شرعی کی حقیقت ☆

پچھلے دنوں ایک نکاح نامہ میری نظر سے گزرا جس میں ''مہر'' کے خانے میں یہ عبارت لکھی ہوئی تھی ''مبلغ بتیس روپیہ مہر شرعی'' اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ لوگوں سے بات چیت کے دوران یہ اندازہ ہوا کہ وہ خدا جانے کس وجہ سے بتیس روپے کو مہر شرعی سمجھتے ہیں اور یہ تاثر تو بہت زیادہ پھیلا ہوا ہے کہ مہر جتنا کم رکھا جائے، شریعت کی نگاہ میں اتنا ہی مستحسن ہے، اس کے علاوہ بھی مہر کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں لوگوں میں پائی جاتی ہیں، جن کا ازالہ ضروری ہے۔

''مہر'' دراصل ایک اعزازیہ (Honorarium) ہے جو ایک شوہر اپنی بیوی کو پیش کرتا ہے، اور اس کا مقصد عورت کا اعزاز و اکرام ہے، نہ تو یہ عورت کی قیمت ہے جسے ادا کر کے یہ سمجھا جائے کہ وہ شوہر کے ہاتھوں بک گئی، اور اب اس کی حیثیت ایک کنیز کی ہے، اور نہ یہ محض ایک فرضی کارروائی ہے جس کے بارے میں یہ سمجھا جائے کہ اسے عملاً ادا کرنے کی ضرورت نہیں، شوہر کے ذمے بیوی کا مہر لازم کرنے سے شریعت کا منشا یہ ہے کہ جب کوئی شخص بیوی کو اپنے گھر میں لائے تو اس کا مناسب اکرام کرے، اور اسے ایک ایسا ہدیہ پیش کرے جو اس کے اعزاز و اکرام کے مناسب ہو، لہٰذا شریعت کا تقاضا یہ ہے کہ مہر کی رقم نہ تو اتنی کم رکھی جائے جس میں اعزاز و اکرام کا یہ پہلو بالکل مفقود ہو، اور نہ اتنی زیادہ رکھی جائے کہ شوہر اسے ادا کرنے پر قادر نہ ہو، اور بالآخر یا تو مہر ادا کیے بغیر دنیا سے رخصت ہو جائے یا آخر میں بیوی سے معاف کرانے پر مجبور ہو۔

شرعی نقطہ نظر سے ہر عورت کا اصل حق یہ ہے کہ اسے ''مہر مثل'' ادا کیا جائے، ''مہر مثل'' کا مطلب مہر کی وہ مقدار ہے جو اس عورت کے خاندان میں عام طور سے اس جیسی خواتین کے نکاح کے وقت مقرر کی جاتی رہی ہو، اور اگر اس عورت کے خاندان میں دوسری عورتیں نہ ہوں تو خاندان سے باہر اس کے ہم پلہ خواتین کا جو مہر عام طور سے مقرر کیا جاتا ہو، وہ اس عورت کا مہر مثل ہے، اور شرعی اعتبار سے بیوی مہر مثل وصول کرنے کی حق دار ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر نکاح کے وقت باہمی رضامندی سے مہر کا تعین نہ کیا گیا ہو، یا مہر کا ذکر کیے بغیر نکاح کر لیا گیا ہو تو مہر مثل خود بخود لازم سمجھا جاتا ہے، اور شوہر

☆ ذکر و فکر، ص:

کے ذمے شرعاً ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ بیوی کو اس کا مہر مثل ادا کرے، البتہ اگر بیوی خود مہر مثل سے کم پر خوش دلی سے راضی ہو جائے یا شوہر خوش دلی سے مہر مثل سے زیادہ مہر مقرر کر لے تو باہمی رضامندی سے مہر مثل سے کم یا زیادہ مہر مقرر کر لینا بھی شرعاً جائز ہے، لیکن یہاں بھی شریعت نے زیادہ سے زیادہ مہر کی تو کوئی حد مقرر نہیں کی، البتہ کم سے کم مہر کی حد مقرر کر دی ہے، اور وہ حد (حنفی موقف کے مطابق) دس درہم ہے، دس درہم کا مطلب دو تولہ ساڑھے سات ماشہ چاندی ہے جو آج کل کی قیمتوں کے لحاظ سے دو سو روپے کے لگ بھگ بنتی ہے، اس کم سے کم مقدار کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اتنا مہر رکھنا شرعاً پسندیدہ ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس سے کم مہر پر اگر خود عورت بھی راضی ہو جائے تو شریعت راضی نہیں ہے، کیونکہ اس سے مہر کا مقصد، یعنی عورت کا اعزاز و اکرام پورا نہیں ہوتا، یہ کم سے کم حد بھی ان لوگوں کا خیال کر کے رکھی گئی ہے جو مالی اعتبار سے کمزور ہیں، اور زیادہ رقم خرچ کرنے کے متحمل نہیں، ان کے لئے یہ گنجائش پیدا کر دی گئی ہے کہ اگر عورت راضی ہو تو کم از کم اس مقدار پر نکاح ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب لینا کسی طرح درست نہیں ہے کہ شریعت کو منظور ہی یہ ہے کہ مہر کی مقدار سو روپے رکھی جائے، اور اسے اس معنی میں مہر شرعی قرار دیا جائے، جن لوگوں نے آج کے دور میں بتیس روپیہ مہر باندھ کر اسے مہر شرعی قرار دیا، انہوں نے دو غلطیاں کیں، ایک غلطی تو یہ کی کہ دس درہم کی قیمت کسی زمانے میں بتیس روپیہ رہی ہوگی، انہوں نے اسے ہمیشہ کے لئے بتیس روپیہ ہی سمجھ لیا، دوسری غلطی یہ کی کہ شریعت نے مہر کی جو کم سے کم مقدار مقرر کی تھی، اس کا مطلب یہ سمجھ لیا کہ شرعاً پسندیدہ ہی یہ ہے کہ اس سے زیادہ مہر مقرر نہ کیا جائے، حالانکہ یہ تصور قطعی طور پر بے بنیاد ہے۔

اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا مہر پانچ سو درہم مقرر فرمایا تھا (۱)، جو ۱۳۱ تولہ تین ماشہ چاندی کے برابر ہوتا ہے، اور آج کل کے لحاظ سے اس کی قیمت نو دس ہزار روپیہ کے قریب بنتی ہے، خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی متعدد ازواجِ مطہرات کا مہر بھی اس کے قریب قریب ہی مقرر فرمایا، جو اوسط درجے کے لحاظ سے ایک قابل لحاظ مقدار ہے۔

بعض حضرات اس مہر فاطمی ہی کو مہر شرعی کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، اور غالباً ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ شرعی اعتبار سے اس سے کم یا زیادہ مہر مقرر کرنا پسندیدہ نہیں، یہ تصور بھی صحیح نہیں ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر فریقین مہر فاطمی کے برابر مہر مقرر کریں اور نیت یہ ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مقرر کی ہوئی مقدار بابرکت اور معتدل ہوگی، نیز یہ کہ اس سے اتباع سنت کا اجر

(۱) کنز العمال، رقم: ۳۷۷۴۳ (۱۳/۶۵۷)

ملنے کی توقع ہے، تو یقیناً یہ جذبہ بہت مبارک اور مستحسن ہے، لیکن یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ یہ مقدار اس معنی میں مہر شرعی ہے کہ اس سے کم یا زیادہ مقرر کرنا شرعاً ناپسندیدہ ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس سے کم یا زیادہ مہر مقرر کرنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، ہاں یہ اصول مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ مہر اتنا ہو جس سے بیوی کا اعزاز واکرام بھی ہو، اور وہ شوہر کی استطاعت سے باہر بھی نہ ہو، جن بزرگوں نے بہت زیادہ مہر باندھنے سے منع کیا، ان کا مقصد یہی تھا کہ اگر استطاعت سے زیادہ مہر مقرر کرلیا جائے تو وہ محض ایک کاغذی کارروائی ہو کر رہ جاتی ہے، حقیقت میں اسے دینے کی کبھی نوبت ہی نہیں آتی، اور مہر ادا نہ کرنے کا گناہ شوہر کی گردن پر رہ جاتا ہے، دوسرے بعض اوقات بہت زیادہ مہر مقرر کرنے کے پیچھے دکھاوے کا جذبہ بھی کارفرما ہوتا ہے، اور لوگ محض اپنی شان وشوکت کے اظہار کے لئے غیر معمولی مہر مقرر کر لیتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں اسلام کے مزاج کے بالکل خلاف ہیں، اس لئے متعدد بزرگوں نے غیر معمولی مہر مقرر کرنے سے منع فرمایا ہے، لیکن اس سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ یاد رکھنے کے لائق ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانے میں ایک مرتبہ تقریر کے دوران لوگوں سے کہا کہ وہ نکاح میں بہت زیادہ مہر نہ باندھا کریں اس پر ایک خاتون نے اعتراض کیا کہ قرآن کریم نے ایک جگہ مہر کے لئے ''قنطار''(۱) (سونے یا چاندی کا ڈھیر) کا لفظ استعمال کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ چاندی کا ڈھیر بھی مہر ہوسکتا ہے، پھر آپ زیادہ مہر مقرر کرنے سے کیوں روکتے ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خاتون کی بات سن کر فرمایا واقعی خاتون کا استدلال درست ہے اور زیادہ مہر باندھنے سے کلی طور پر منع کرنا درست نہیں۔ (۲)

مطلب یہی تھا کہ اگر دکھاوا مقصود نہ ہو، اور ادائیگی کی نیت بھی ہو اور استطاعت بھی، تو زیادہ مہر مقرر کرنا بھی جائز ہے، البتہ ان میں سے کوئی بات مفقود ہو تو ناجائز۔

جب مہر کا ذکر چل نکلا تو ایک اور نکتے کی وضاحت بھی ہو جائے، مہر کی دو قسمیں مشہور ہیں: ''مہر معجّل'' اور ''مہر مؤجل'' یہ الفاظ چونکہ صرف نکاح کی مجلس ہی میں سنائی دیتے ہیں اس لئے بہت سے لوگوں کو ان کا مطلب معلوم نہیں ہوتا، شرعی اعتبار سے ''مہر معجّل'' اس مہر کو کہتے ہیں جو نکاح ہوتے ہی شوہر کے ذمے لازم ہو جاتا ہے، اور یہ اس کا فریضہ ہے کہ یا تو نکاح کے وقت ہی بیوی کو ادا کر دے، یا اس کے بعد جتنی جلد ممکن ہو، عورت کو بھی ہر وقت یہ حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے اس کا

---

(۱) اس جملہ میں سورۃ النساء کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے: ﴿وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَاراً فَلَا تَأْخُذُواْ مِنْهُ شَيْئاً﴾ (النساء: ۲۰) یعنی اور ان میں سے ایک کو ڈھیر سارا مہر دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ واپس نہ لو۔

(۲) المقاصد الحسنة للسخاوی (۱/۱۷۱)، کشف الخفاء (۱/۲۶۹)

مطالبہ کر لے، چونکہ ہمارے معاشرے میں خواتین عام طور سے مطالبہ نہیں کرتیں، اس لئے اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس کی ادائیگی ہمارے لئے ضروری نہیں، بلکہ شوہر کا یہ فرض ہے کہ وہ عورت کے مطالبے کا انتظار کیے بغیر بھی جس قدر جلد ممکن ہو اس فرض سے سبکدوش ہو جائے۔

''مہر مؤجل'' اس مہر کو کہا جاتا ہے جس کی ادائیگی کے لئے فریقین نے آئندہ کی کوئی تاریخ متعین کر لی ہو، جو تاریخ اس طرح متعین کر لی جائے، اس سے پہلے اس کی ادائیگی شوہر کے ذمے لازم نہیں ہوتی، نہ بیوی اس سے پہلے مطالبہ کر سکتی ہے، لہٰذا مہر کے مؤجل ہونے کا اصل مطلب تو یہی ہے کہ اس کی ادائیگی کے لئے کوئی تاریخ نکاح کے وقت ہی مقرر کر لی جائے، لیکن ہمارے معاشرے میں عام طور سے کوئی تاریخ مقرر کیے بغیر صرف یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اتنا مہر مؤجل ہے، اور ہمارے معاشرے کے رواج کے مطابق اس کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ مہر کی یہ مقدار اس وقت واجب الاداء ہوگی جب نکاح ختم ہوگا، چنانچہ اگر طلاق ہو جائے تب مہر مؤجل کی ادائیگی لازم ہوگی، یا میاں بیوی میں سے کسی کا انتقال ہو جائے تب اس کی ادائیگی لازم سمجھی جاتی ہے۔

ایک اور نکتہ یہ قابل ذکر ہے کہ ہمارے معاشرے میں شوہر کی طرف سے دلہن کو جو زیور چڑھایا جاتا ہے اس کا بذات خود مہر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، ہمارے معاشرے کے رواج کے مطابق یہ زیور دلہن کی ملکیت نہیں ہوتا، بلکہ اسے عارضی استعمال کے لئے دیا جاتا ہے، چنانچہ بیوی اسے شوہر کی اجازت کے بغیر نہ فروخت کر سکتی ہے نہ کسی کو تحفے میں دے سکتی ہے، نہ کسی اور کام میں لگا سکتی ہے نیز یہی وجہ ہے کہ اگر خدانخواستہ طلاق کی نوبت آ جائے تو شوہر یہ زیور واپس لے لیتا ہے، لہٰذا اس زیور سے مہر ادا نہیں ہوتا، ہاں اگر شوہر بیوی سے صراحۃً یہ کہہ دیئے کہ یہ زیور میں نے بطور مہر تمہاری ملکیت میں دے دیا، تو پھر اسے مہر میں شمار کر سکتے ہیں، اس صورت میں بیوی اس زیور کی مالک بن کر اس میں ہر طرح کا تصرف کر سکتی ہے، اور اسے کسی بھی حالت میں اس سے واپس نہیں لیا جا سکتا۔

بہرصورت! یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ مہر کا تعین محض ایک فرضی یا رسمی کارروائی نہیں ہے، جو سوچے سمجھے بغیر کر لی جائے، بلکہ یہ ایک دینی فریضہ ہے جو پوری سنجیدگی کا متقاضی ہے، یہ ایک معاملے کی بات ہے، شرعاً اس کے تمام پہلو صاف اور واضح ہونے چاہئیں، اور اس کی معاملے کے مطابق ادائیگی کی فکر کرنی چاہئے، یہ بڑی ناانصافی کی بات ہے کہ اس حق کی ادائیگی سے ساری عمر بے فکر رہنے کے بعد بستر مرگ پر بیوی سے اس کی معافی حاصل کر لی جائے، جب ماحول کے جبر سے اس کے پاس معاف کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔

۱۸ جمادی الثانیہ ۱۴۱۶ھ/۱۲ نومبر ۱۹۹۵ء

کچھ جہیز کے بارے میں ☆

چند سال پہلے شام کے ایک بزرگ شیخ عبدالفتاح ہمارے یہاں تشریف لائے ہوئے تھے، اتفاق سے ایک مقامی دوست بھی اسی وقت آ گئے، اور جب انہوں نے ایک عرب بزرگ کو بیٹھے ہوئے دیکھا تو ان سے دُعا کی درخواست کرتے ہوئے کہا کہ میری دو بیٹیاں شادی کے لائق ہیں دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ان کی شادی کے اسباب پیدا فرما دے۔ شیخ نے ان سے پوچھا کہ کیا ان کے لئے کوئی مناسب رشتہ نہیں مل رہا؟ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ رشتہ تو دونوں کا ہو چکا ہے، لیکن میرے پاس اتنے مالی وسائل نہیں ہیں کہ ان کی شادی کرسکوں، شیخ نے یہ سن کر انتہائی حیرت سے پوچھا وہ آپ کی لڑکیاں ہیں یا لڑکے ہیں؟ کہنے لگے کہ لڑکیاں ہیں، شیخ نے سراپا تعجب بن کر کہا لڑکیوں کی شادی کے لئے مالی وسائل کی کیا ضرورت ہے؟ انہوں نے کہا کہ میرے پاس انہیں جہیز میں دینے کے لیے کچھ نہیں ہے، شیخ نے پوچھا جہیز کیا ہوتا ہے؟ اس پر حاضرین مجلس نے انہیں بتایا کہ ہمارے ملک میں یہ رواج ہے کہ باپ شادی کے وقت اپنی بیٹی کو زیورات، کپڑے، گھر کا اثاثہ اور بہت سا ساز و سامان دیتا ہے اسے جہیز کہتے ہیں، اور جہیز دینا باپ کی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے، جس کے بغیر لڑکی کی شادی کا تصور نہیں کیا جا سکتا، اور لڑکی کے سسرال والے بھی اس کا مطالبہ کرتے ہیں۔ شیخ نے یہ تفصیل سنی تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے، اور کہنے لگے کہ کیا بیٹی کی شادی کرنا کوئی جرم ہے جس کی یہ سزا باپ کو دی جائے؟ پھر انہوں نے بتایا کہ ہمارے ملک میں اس قسم کی کوئی رسم نہیں ہے، اکثر جگہوں پر تو یہ لڑکے کی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے کہ اپنے گھر میں دلہن کو لانے سے پہلے گھر کا اثاثہ اور دلہن کی ضروریات فراہم کر کے رکھے، لڑکی کے باپ کو کچھ خرچ کرنا نہیں پڑتا، اور بعض جگہوں پر رواج یہ ہے کہ لڑکی کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے سامان تو باپ ہی خریدتا ہے، لیکن اس کی قیمت لڑکا ادا کرتا ہے، البتہ باپ اپنی بیٹی کو رخصتی کے وقت کوئی مختصر تحفہ دینا چاہے تو دے سکتا ہے، لیکن وہ بھی کچھ ایسا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔

اس واقعے سے کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے، کہ ہمارے معاشرے میں جہیز کو جس طرح بیٹی کی

☆ ذکر وفکر، ص: ۲۸۲

شادی کا ایک ناگزیر حصہ قرار دے دیا گیا ہے، اس کے بارے میں عالم اسلام کے دوسرے علاقوں کا کیا نقطہ نظر ہے؟

جیسا کہ شیخ کے حوالے سے پیچھے بیان کیا گیا، شرعی اعتبار سے بھی جہیز کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ اگر کوئی باپ اپنی بیٹی کو رخصت کرتے وقت اسے کوئی تحفہ اپنی استطاعت کے مطابق دینا چاہے تو دے دے، اور ظاہر ہے کہ تحفہ دیتے وقت لڑکی کی آئندہ ضروریات کو مدنظر رکھا جائے تو زیادہ بہتر ہے، لیکن نہ وہ شادی کے لئے کوئی لازمی شرط ہے، نہ سسرال والوں کو کوئی حق پہنچتا ہے کہ وہ اس کا مطالبہ کریں، اور اگر کسی لڑکی کو جہیز نہ دیا جائے یا کم دیا جائے تو اس پر برا منائیں یا لڑکی کو مطعون کریں، نہ یہ کوئی دکھاوے کی چیز ہے کہ شادی کے موقع پر اس کی نمائش کر کے اپنی شان و شوکت کا اظہار کیا جائے، اس سلسلے میں ہمارے معاشرے میں جو غلط تصورات پھیلے ہوئے ہیں وہ مختصراً درج ذیل ہیں:

① جہیز کو لڑکی کی شادی کے لئے ایک لازمی شرط سمجھا جاتا ہے، چنانچہ جب تک جہیز دینے کے لئے پیسے نہ ہوں، لڑکی کی شادی نہیں کی جاتی، ہمارے معاشرے میں نہ جانے کتنی لڑکیاں اسی وجہ سے بن بیاہی رہتی ہیں کہ باپ کے پاس انہیں دینے کے لئے جہیز نہیں ہوتا، اور جب شادی سر پر آ ہی جائے تو جہیز کی شرط پوری کرنے کے لئے باپ کو بعض اوقات روپیہ حاصل کرنے کے ناجائز ذرائع اختیار کرنے پڑتے ہیں، اور وہ رشوت، جعل سازی، دھوکہ فریب اور خیانت جیسے جرائم کے ارتکاب پر آمادہ ہو جاتا ہے، اور اگر کوئی باپ اتنا باضمیر ہے کہ ان ناجائز ذرائع کو استعمال نہیں کرنا چاہتا تو کم از کم اپنے آپ کو قرض ادھار کے شکنجے میں جکڑنے پر مجبور ہوتا ہے۔

② جہیز کی مقدار اور اس کے لئے لازمی اشیاء کی فہرست میں بھی روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے، اب جہیز محض ایک بیٹی کے لئے باپ کا تحفہ نہیں ہے جو وہ اپنی خوش دلی سے اپنی استطاعت کی حد میں رہ کر دے، بلکہ معاشرے کا ایک جبر ہے، چنانچہ اس میں صرف بیٹی کی ضروریات ہی داخل نہیں، بلکہ اس کے شوہر کی ضروریات پوری کرنا اور اس کے گھر کو مزین کرنا بھی ایک لازمی حصہ ہے، خواہ لڑکی کے باپ کا دل چاہے یا نہ چاہے، اسے یہ تمام لوازم پورے کرنے پڑتے ہیں۔

③ بات صرف اتنی نہیں ہے کہ لڑکی کی ضروریات پوری کر کے اس کا دل خوش کیا جائے، بلکہ جہیز کی نمائش کی رسم نے یہ بھی ضروری قرار دے دیا ہے کہ جہیز ایسا ہو جو ہر دیکھنے والے کو خوش

کر سکے، اور ان کی تعریف حاصل کر سکے۔

(۴) جہیز کے سلسلے میں سب سے گھٹیا بات یہ ہے کہ لڑکی کا شوہر یا اس کی سسرال کے لوگ جہیز پر نظر رکھتے ہیں، بعض جگہ تو شاندار جہیز کا مطالبہ پوری ڈھٹائی سے کیا جاتا ہے، اور بعض جگہ اگر صریح مطالبہ نہ ہو، تب بھی توقعات یہ باندھی جاتی ہیں کہ دلہن اچھا سا جہیز لے کر آئے گی، اور اگر یہ توقعات پوری نہ ہوں تو لڑکی کو طعنے دے دے کر اس کے ناک میں دم کر دیا جاتا ہے۔

جہیز کے ساتھ اس قسم کی جو رسمیں اور تصورات نتھی کر دیئے گئے ہیں اور ان کی وجہ سے جو معاشرتی خرابیاں جنم لیتی رہی ہیں، ان کا احساس ہمارے معاشرے کے اہل فکر میں مفقود نہیں، اس موضوع پر بہت کچھ لکھا بھی گیا ہے، بعض تجاویز بھی پیش کی گئی ہیں، بلکہ سرکاری سطح پر بعض قوانین بھی بنائے گئے ہیں، اور ان کوششوں کا یہ اثر بحمدللہ ضرور ہوا ہے کہ اب جہیز کے بارے میں لوگوں کے بہت سے تصورات میں تبدیلی آئی ہے، جہیز کی نمائش کا سلسلہ کم ہوا ہے، بین الممالک شادیوں میں جہیز کی پابندی حالات کے جبر نے ترک کرا دی، لیکن ابھی تک معاشرے کے ایک بڑے حصے میں ان غلط تصورات کی حکمرانی ختم نہیں ہوئی۔

بعض حضرات یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ جہیز کو قانوناً بالکل ممنوع قرار دے دیا جائے، لیکن دراصل یہ ایک معاشرتی مسئلہ ہے اور اس قسم کے مسائل صرف قانون کی جکڑ بندی سے حل نہیں ہوتے، اور نہ ایسے قوانین پر عمل کرنا ممکن ہوتا ہے، اس کے لئے تعلیم و تربیت اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے ایک مناسب ذہنی فضا تیار کرنی ضروری ہے، بذاتِ خود اس بات میں کوئی شرعی یا اخلاقی خرابی بھی نہیں ہے، کہ ایک باپ اپنی بیٹی کو رخصت کرتے وقت اپنے دل کے تقاضے سے اسے ایسی چیزوں کا تحفہ پیش کرے جو اس کے لئے آئندہ زندگی میں کار آمد ہوں، خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو سادگی کے ساتھ کچھ جہیز عطا فرمایا تھا، شرعی اعتبار سے اس قسم کے جہیز کے لئے کوئی مقدار بھی مقرر نہیں ہے، اگر دوسرے مفاسد نہ ہوں تو باپ اپنے دلی تقاضے کے تحت جو کچھ دینا چاہے دے سکتا ہے، لیکن خرابی یہاں سے پیدا ہوتی ہے کہ اول تو اسے نمود و نمائش کا ذریعہ بنایا جاتا ہے، اور دوسرے لڑکے والے عملاً اسے اپنا حق سمجھتے ہیں، زیادہ سے زیادہ جہیز کی امیدیں باندھتے ہیں، اور انتہائی گھٹیا بات یہ ہے کہ اس کی کمی کی وجہ سے لڑکی اور اس کے گھر والوں کو مطعون کرتے ہیں، جہیز کی ان خرابیوں کو ختم کرنے کے لئے معاشرے کے تمام طبقات کو ان تصورات کے خلاف جہاد کرنا پڑے گا، تعلیم و تربیت، ذرائع ابلاغ اور وعظ و نصیحت کے ذریعے ان تصورات کی

قباحتیں مختلف انداز و اسلوب سے متواتر بیان کرنے اور کرتے رہنے کی ضرورت ہے، یہاں تک کہ یہ گھٹیا باتیں ہر کس و ناکس کی نظر میں ایک ایسا عیب بن جائیں جس کی اپنی طرف نسبت سے لوگ شرمانے لگیں، کسی بھی معاشرے میں پھیلے ہوئے غلط تصورات یا بری عادتیں اسی طرح رفتہ رفتہ دور ہوتی ہیں کہ اس معاشرے کے اہل اقتدار، اہل علم و دانش اور دوسرے بارسوخ طبقے مل جل کر ایک ذہنی فضا تیار کرتے ہیں، یہ ذہنی فضا رفتہ رفتہ فروغ پاتی ہے، اور لوگوں کی تربیت کرتی ہے، لیکن اس کے لئے دردمند دل اور انتھک جدوجہد درکار ہے، افسوس ہے کہ ہمارے ان طبقوں کے بیشتر افراد کچھ ایسے مسائل میں الجھ گئے ہیں کہ معاشرے کی اصلاح و تربیت کا کام، جو کسی بھی قوم کی تعمیر کے لئے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے، کسی شمار وقطار میں نظر نہیں آتا، ذہنی تربیت اور کردار سازی کا کام سیاست اور فرقہ واریت کی ہاؤہُو میں ایسا گم ہوا ہے کہ اب اس کا نام بھی ایک مذاق معلوم ہونے لگا ہے، لیکن اس صورت حال میں مایوس ہو کر بیٹھ جانا بھی درست نہیں ایک داعئ حق کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی بات کہنے سے نہ اکتائے، اپنے دائرے کی حد تک کام کرنے سے نہ تھکے۔ بالآخر ایک وقت آتا ہے جب حق وصداقت کی کشش دوسروں کو بھی اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیتی ہے، اور قوموں کی نہ صرف سوچ میں بلکہ عمل میں بھی انقلاب آجاتا ہے۔

۲۵ جمادی الثانیہ ۱۴۱۶ھ

۱۹ نومبر ۱۹۹۵ء

☆☆☆

شادی کی دعوت اور بارات ☆

میں پچھلے مضمون میں جہیز کے بارے میں کچھ گذارشات لکھ چکا تھا، بعد میں ایسٹن برسٹل (برطانیہ) سے ایک صاحب کا خط مجھے موصول ہوا جس میں وہ لکھتے ہیں:

''میں آپ کی توجہ ایک اہم مسئلہ کی طرف دلانا چاہتا ہوں جس کی ابتداء کا زمانہ متعین کرنا تو ایک تاریخ داں کا کام ہے، مگر اس کی برائی ہر شخص کے سامنے ہے، وہ ہے جہیز، جہیز کی رسم چونکہ ہندو پاک میں بسنے والے مسلمانوں میں اپنی پوری چمک دمک کے ساتھ جاری ہے، اس لئے جو مسلمان وہاں سے نقل مکانی کر کے مغرب آئے تو وہ یہ رسم بھی اپنے ساتھ لائے، چنانچہ اب یہ رسم مغرب میں بھی پھیل گئی ہے، آپ سے گذارش ہے کہ ایک تو آپ اس کی شرعی حیثیت بیان فرمائیں، تاکہ یورپ میں مسلمانوں کی نئی نسل اس سے آگاہ ہو سکے، اور شاید ان ہزاروں غریب لڑکیوں کی قسمت پر بھی اس کا کچھ اثر پڑے جو صرف جہیز نہ ہونے کی بنا پر دلہن نہیں بن سکتیں، کیا جہیز ضروری ہے؟ اگر ہے تو اس کی مقدار کیا ہے؟ کیا جہیز دینے کے بعد ماں باپ کو اپنی وراثت سے حصہ دینا ضروری نہیں رہتا؟ عموماً عورتیں اپنے حق وراثت سے اس لئے دست بردار ہو جاتی ہیں کہ ان کو جہیز مل گیا ہے، اور غمی خوشی میں ان کی ماں باپ کی طرف سے مدد متوقع ہوتی ہے، اور ان کی شادی پر بھی خاصا خرچ ہو چکا ہوتا ہے، مگر یہ ساری باتیں تو لڑکے پر بھی صادق آتی ہیں، پھر وہ وراثت کا کیونکر حقدار ہوگا؟

دوسرے لڑکی کے والدین برات کو جو کھانا کھلاتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ عرب ممالک میں لڑکی کے والدین جو خرچ کرتے ہیں اس کی ادائیگی دولہا کرتا ہے، مگر ہمارے یہاں یہ تمام اخراجات والدین پر ہی کیوں ڈالے جاتے ہیں؟

تیسرے بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ لڑکی کا باپ دولہا سے شادی کے اخراجات کے علاوہ بھی کچھ رقم کا تقاضا کرتا ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

☆ ذکر و فکر، ص: ۲۸۷

بلاشبہ آپ کی کتابوں سے ان گنت لوگ فیضیاب ہو رہے ہیں لیکن ''جنگ'' میں آپ نے مضامین کا جو سلسلہ شروع کیا ہے، وہ مختصر اور عام فہم ہونے کی وجہ سے زیادہ موثر ہے، اگر آپ میرے مذکورہ سوالات کی وضاحت ''جنگ'' ہی کے صفحات میں فرما دیں تو امید ہے کہ اس سے بہت سے لوگوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوگا'' عبدالمجید ایسٹن برسٹل برطانیہ

مکتوب نگار کے بعض سوالات کا جواب تو میرے پچھلے مضمون میں آچکا ہے، مثلاً یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ جہیز ہرگز نکاح کا کوئی ضروری حصہ نہیں ہے، اور اس کی استطاعت نہ ہونے کی صورت میں لڑکی کو نکاح کے بغیر بٹھائے رکھنا ہرگز جائز نہیں، کوئی باپ اپنی بیٹی کو رخصت کرتے وقت اپنی استطاعت کی حدود میں رہتے ہوئے خوشی سے بیٹی کو کوئی تحفہ دینا چاہے تو وہ بے شک دے سکتا ہے، لیکن نہ اس کو نکاح کی لازمی شرط سمجھنے کی گنجائش ہے، نہ اس میں نام ونمود کا کوئی پہلو ہونا چاہئے، اور نہ شوہر یا اس کے گھر والوں کے لئے جائز ہے کہ وہ جہیز کا مطالبہ کریں، یا اس کی توقعات باندھیں۔

اب مکتوب نگار نے جو نئی بات ذکر کی ہے وہ یہ ہے کہ ''کیا جہیز دینے کے بعد ماں باپ کو اپنی وراثت سے حصہ دینا ضروری نہیں رہتا؟'' واقعی یہ غلط فہمی بعض حلقوں میں خاصی عام ہے، اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ جہیز کا وراثت سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے، اگر کسی باپ نے اپنی بیٹی پر جہیز کی صورت میں اپنی ساری کائنات بھی لٹا دی ہو، تب بھی لڑکی کا حق وراثت ختم نہیں ہوتا، باپ کے انتقال کے بعد وہ اپنے باپ کے ترکے میں ضرور حصہ دار ہوگی، اور اس کے بھائیوں کے لئے ہرگز جائز نہیں ہے کہ وہ سارا ترکہ خود لے بیٹھیں، اور اپنی بہن کو اس بنیاد پر محروم کردیں کہ اسے جہیز میں بہت کچھ مل چکا ہے، لڑکا ہو یا لڑکی، ان کے باپ نے اپنی زندگی میں انہیں جو کچھ دیا ہو، اس سے ان کے وراثت کے حصے میں کوئی کمی نہیں آتی، البتہ باپ کو حتی الامکان اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ اپنی زندگی میں وہ اپنی اولاد کو جو کچھ دے، وہ قریب قریب برابر ہو، اور کسی ایک لڑکے یا لڑکی پر دولت کی بارش برسا کر دوسروں کو محروم نہ کرے۔ لیکن یہ ایک مستقل مسئلہ ہے جس کی تفصیل ان شاء اللہ کسی اور موقع پر عرض کروں گا، بہرحال! یہ بات طے شدہ ہے، اور اس میں شرعی اعتبار سے کوئی ادنیٰ شبہ نہیں کہ لڑکی کو جہیز دینے سے اس کا حق وراثت ختم نہیں ہوتا، بلکہ جہیز میں دی ہوئی مالیت کو اس کے حصہ وراثت سے منہا بھی نہیں کیا جا سکتا، اسے بہر صورت ترکے سے اپنا پورا حصہ ملنا ضروری ہے۔

مکتوب نگار نے دوسرا مسئلہ یہ اٹھایا ہے کہ ''لڑکی کے والدین برات کو جو کھانا کھلاتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟'' اس معاملے میں بھی ہمارے معاشرے میں افراط وتفریط پر مبنی تصورات

پھیلے ہوئے ہیں، بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح لڑکے کے لئے نکاح کے بعد ولیمہ کرنا سنت ہے، اسی طرح لڑکی کے باپ کے لئے بھی نکاح کے وقت دعوت کرنا سنت یا کم از کم شرعی طور پر پسندیدہ ہے، حالانکہ یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے،لڑکی والوں کی طرف سے کسی دعوت کا اہتمام نہ سنت ہے، نہ مستحب، بلکہ اگر دوسری خرابیاں نہ ہوں تو صرف جائز ہے، یہی معاملہ بارات کا ہے، نکاح کے وقت دولہا کی طرف سے بارات لے جانا کوئی سنت نہیں، نہ نکاح کو شریعت نے اس پر موقوف کیا ہے، لیکن اگر دوسری خرابیاں نہ ہوں تو بارات لے جانا کوئی گناہ بھی نہیں، لہٰذا بعض حضرات جو بارات لے جانے اور لڑکی والوں کی طرف سے ان کی دعوت کو ایسا گناہ سمجھتے ہیں جیسے قرآن وسنت نے اس سے خاص طور پر منع کیا ہو، ان کا یہ تشدد بھی مناسب نہیں، حقیقت یہ ہے کہ اگر اعتدال کے ساتھ کچھ لوگ نکاح کے موقع پر لڑکی کے گھر چلے جائیں، (جس میں لڑکی کے باپ پر کوئی بار نہ ہو) اور لڑکی کے والدین اپنی بچی کے نکاح کے فریضے سے سبکدوش ہونے کی خوشی میں اپنی دلی خواہش سے ان کی اور اپنے دوسرے عزیزوں دوستوں کی دعوت کر دیں تو اس میں بذاتِ خود کوئی گناہ نہیں ہے، لیکن ان تمام چیزوں میں خرابی یہاں سے پیدا ہوتی ہے کہ ان تقریبات کو نکاح کا لازمی حصہ سمجھ لیا جاتا ہے، اور جو شخص انہیں انجام دینے کی استطاعت نہ رکھتا ہو، وہ خواہی نخواہی ان پر مجبور ہوتا ہے، اور اس غرض کے لئے بعض اوقات ناجائز ذرائع اختیار کرتا ہے، اور بعض اوقات قرض ادھار کا بوجھ اپنے سر لیتا ہے، اور اگر کوئی شخص اپنے مالی حالات کی وجہ سے یہ کام نہ کرے تو اسے معاشرے میں مطعون کیا جاتا ہے۔

کسی شخص کو کوئی ہدیہ تحفہ دینا یا اس کی دعوت کرنا اگر دل کے تقاضے اور محبت سے ہو تو نہ صرف یہ کہ کوئی گناہ نہیں، بلکہ باعث برکت ہے، بالخصوص جب نئے رشتے قائم ہو رہے ہوں تو ایسا کرنے سے باہمی محبت میں اضافہ ہوتا ہے، بشرطیکہ یہ سب کچھ خلوص سے ہو، اور اپنی استطاعت کی حدود میں رہ کر ہو، لیکن جب یہ چیز نام ونمود اور دکھاوے کا ذریعہ بن جائے یا اس میں بدلے کی طلب شامل ہو جائے، یا یہ کام خوش دلی کے بجائے معاشرے اور ماحول کے جبر کے تحت انجام دیئے جائیں، یعنی اندر سے دل نہ چاہ رہا ہو، لیکن ناک کٹنے کے خوف سے زبردستی تحفے دیئے جائیں یا دعوتیں کی جائیں تو یہی کام جو باعث برکت ہو سکتے تھے الٹے گناہ، بے برکتی اور نحوست کا سبب بن جاتے ہیں، اور ان کی وجہ سے معاشرہ طرح طرح کی اخلاقی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، ہماری شامت اعمال یہ ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو خود ساختہ رسموں میں جکڑ کر اچھے کاموں کو بھی اپنے لئے ایک عذاب بنا لیا ہے، اگر یہی کام سادگی بیساختگی اور بے تکلفی سے کیے جائیں تو ان میں کوئی خرابی نہیں، لیکن اگر رسموں کی پابندی، نام ونمود اور معاشرتی جبر کے تحت انجام دیئے جائیں تو یہ بہت بڑی برائی ہے۔

لہٰذا اصل بات یہ ہے کہ اگر کسی لڑکی کا باپ اپنی بیٹی کے نکاح کے وقت اپنی خوش دلی سے اس کی سسرال کے لوگوں کو، یا اپنے اعزہ اور احباب کو جمع کر کے ان کی دعوت کر دیتا ہے اور اسے نکاح کا لازمی حصہ یا سنت نہیں سمجھتا تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے، اور اگر کوئی شخص ایسا نہیں کرتا تو اس میں بھی کوئی ایسی بات نہیں ہے، جس کی شکایت کی جائے یا جس کی وجہ سے اسے مطعون کیا جائے، بلکہ اس کا عمل سادگی کی سنت سے زیادہ قریب ہے، اس لئے اس کی تعریف کرنی چاہئے۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ بعض لوگ اپنی اولاد کے امتحان میں کامیاب ہونے پر یا انہیں اچھی ملازمت ملنے پر خوشی کے اظہار کے لئے اپنے خاص خاص ملنے والوں کی دعوت کر دیتے ہیں، اس دعوت میں ہرگز کوئی حرج نہیں، دوسری طرف بہت سے لوگوں کے بچے امتحان میں پاس ہوتے رہتے ہیں، یا انہیں اچھی ملازمتیں ملتی رہتی ہیں لیکن وہ اس خوشی میں کوئی دعوت نہیں کرتے، ان لوگوں پر بھی معاشرے کی طرف سے کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا، نہ انہیں اس بنا پر مطعون کیا جاتا ہے کہ انہوں نے دعوت کیوں نہیں کی؟ اگر یہی طرز عمل نکاح کی دعوت میں بھی اختیار کر لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے؟ یعنی جس کا دل چاہے دعوت کرے اور جس کا دل نہ چاہے، نہ کرے، لیکن خرابی یہاں سے پیدا ہوتی ہے کہ نکاح میں اگر کوئی دعوت نہ کرے تو سسرال والوں کی طرف سے باقاعدہ مطالبہ ہوتا ہے، اور یوں سمجھا جاتا ہے جیسے شادی ہوئی ہی نہیں، جن بزرگوں نے بارات لے جانے اور اس کی دعوت کے اہتمام سے روکا درحقیقت ان کے پیش نظر یہی خرابیاں تھیں، انہوں نے اس بات کی ترغیب دی کہ کم از کم کچھ بارسوخ افراد ان دعوتوں کے بغیر نکاح کریں گے تو ان لوگوں کو حوصلہ ہوگا جو ان کی استطاعت نہیں رکھتے، اور صرف معاشرے کی مجبوری سے انہیں یہ کام کرنے پڑتے ہیں۔

مکتوب نگار نے آخری بات یہ پوچھی ہے کہ بعض علاقوں میں لڑکی کا باپ دولہا سے نکاح کے اخراجات کے علاوہ مزید کچھ رقم کا بھی مطالبہ کرتا ہے، اور اس کے بغیر اسے اپنی لڑکی کا رشتہ دینے پر تیار نہیں ہوتا، بے شک یہ بے بنیاد رسم بھی ہمارے معاشرے کے بعض حصوں میں خاصی رائج ہے، اور یہ شرعی اعتبار سے بالکل ناجائز رسم ہے، اپنی لڑکی کا رشتہ دینے کے لئے دولہا سے رقم لینے کو ہمارے فقہاء کرام رحمہم اللہ نے رشوت قرار دیا ہے، اور اس کا گناہ رشوت لینے کے گناہ کے برابر ہے، بلکہ اس میں ایک پہلو بے غیرتی کا بھی ہے، اور یہ عمل اپنی لڑکی کو فروخت کرنے کے مشابہ ہے، اور بعض جگہ جہاں یہ رسم پائی جاتی ہے، اسی وجہ سے شوہر اس کے ساتھ زرخرید کنیز جیسا سلوک کرتا ہے، لہٰذا یہ رسم شرعی اور اخلاقی لحاظ سے انتہائی غلط رسم ہے جو واجب الترک ہے۔

۳ رجب ۱۴۱۶ھ / ۲۶ نومبر ۱۹۹۵ء

نکاح اور ولیمہ...... چند سوالات کا جواب ☆

میں نے پچھلے مضامین میں شادی بیان اور اس کے رسم و رواج کے بعض پہلو پر کچھ گذارشات پیش کیں تو میرے پاس قارئین کی طرف سے سوالات اور تجاویز کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا، جن سے ایک تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ شادی بیاہ میں ہونے والی فضول رسموں سے کتنے پریشان ہیں اور ان کا کوئی حل چاہتے ہیں۔ دوسرے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ شادی بیاہ کے بارے میں دینی معلومات سے ناواقفیت کتنی عام ہو گئی ہے کہ وہ معمولی باتیں جو مسلمان گھرانے کے ہر فرد کو معلوم ہوا کرتی تھیں اب اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کو معلوم نہیں ہیں، اور ان کی جگہ بہت سے بے بنیاد اور غلط مفروضوں نے لے لی ہے، تیسرے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لوگ ان مسائل کی صحیح شرعی حیثیت جاننا چاہتے ہیں۔

ان میں سے بعض سوالات تو ایسے تھے کہ میں نے انہیں شائع کرنے کے بجائے ان کا انفرادی جواب دینا زیادہ مناسب سمجھا، لیکن ان میں سے بعض باتیں ایسی ہیں کہ ان کی وضاحت ان کالموں میں مناسب معلوم ہوتی ہیں تاکہ وہ وسیع پیمانے پر پڑھی جاسکیں۔ تاہم ہر خط کو اس کے الفاظ میں نقل کرنے کے بجائے مجموعی مضمون کے ذیل میں انشاء اللہ مطلوبہ سوالات کا جواب عرض کر دوں گا۔

شادی کی تقریبات میں ''ولیمہ'' ایک ایسی تقریب ہے جو باقاعدہ سنت ہے، اور آنحضرت ﷺ نے اس کی صراحۃً ترغیب دی ہے، لیکن اول تو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ دعوت کوئی فرض یا واجب نہیں جس کے چھوڑنے سے نکاح پر کوئی اثر پڑتا ہو، ہاں یہ سنت ہے اور حتی الامکان اس پر ضرور عمل کرنا چاہئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس سنت کی ادائیگی کے لئے شرعاً نہ مہمانوں کی کوئی تعداد مقرر ہے نہ کھانے کا کوئی معیار، بلکہ ہر شخص اپنی استطاعت کی حد میں رہتے ہوئے جس پیمانے پہ چاہے ولیمہ کر سکتا ہے، صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک ولیمہ ایسا کیا جس میں صرف دو سیر جو خرچ ہوئے، حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے موقع پر ولیمہ سفر میں ہوا، اور اس طرح ہوا کہ دسترخوان بچھا دیا گیا اور اس پر کچھ کھجوریں، کچھ پنیر اور کچھ گھی رکھ دیا گیا (۱) بس ولیمہ ہو گیا، البتہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا

☆ ذکر و فکر، ص: ۲۹۳

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأطعمة، باب الخبز المرقق والأكل على الخوان والسفرة، رقم: ٤٩٦٨

کے نکاح کے موقع پر روٹی اور بکری کے گوشت سے دعوت کی گئی۔(۱)

لہٰذا ولیمہ کے بارے میں یہ سمجھنا درست نہیں کہ اس میں مہمانوں کی کوئی بڑی تعداد ضروری ہے، یا کوئی اعلیٰ درجے کا کھانا ضرور ہونا چاہئے، اور اگر کسی شخص کے پاس خود گنجائش نہ ہو تو وہ قرض ادھار کر کے ان چیزوں کا اہتمام کرے، بلکہ شرعی اعتبار سے مطلوب یہی ہے کہ جس شخص کے پاس خود اپنے وسائل کم ہوں، وہ اپنی استطاعت کے مطابق اختصار سے کام لے، ہاں اگر استطاعت ہو تو زیادہ مہمان مدعو کرنے اور اچھے کھانے کا اہتمام کرنے میں بھی کچھ حرج نہیں، بشرطیکہ مقصد نام ونمود اور دکھاوا نہ ہو۔

ان حدود میں رہتے ہوئے ولیمہ بیشک مسنون ہے، اور اس لحاظ سے کار ثواب بھی، لہٰذا اس کے تقدس کو طرح طرح کے گناہوں سے مجروح کرنا اس کی ناقدری، بلکہ توہین کے مترادف ہے، محض شان وشوکت کے اظہار اور نام ونمود کے اقدامات، تقریب کی مصروفیات میں نمازوں کا ضیاع، بجے بنے مردوں عورتوں کا بے حجاب میل جول ان کی فلم بندی، اور اس قسم کے دوسرے منکرات اس تقریب کی برکتوں پر پانی پھیر دیتے ہیں جن سے اس بابرکت تقریب کو بچانا چاہئے۔

ولیمہ کے بارے میں ایک اور غلط فہمی خاصی پھیلی ہوئی ہے، جس کی وجہ سے بہت سے لوگ پریشان رہتے ہیں، ایک صاحب نے خاص طور پر اپنی اس پریشانی کا ذکر کرتے ہوئے اس نکتے کی وضاحت چاہی ہے وہ غلط فہمی یہ ہے کہ اگر دولہا دلہن کے درمیان تعلقات زن وشو قائم نہ ہو پائے ہوں تو ولیمہ صحیح نہیں ہوتا۔

واقعہ یہ ہے کہ ولیمہ نکاح کے وقت سے لے کر رخصتی کے بعد تک کسی بھی وقت ہو سکتا ہے، البتہ مستحب یہ ہے کہ رخصتی کے بعد ہو، اور رخصتی کا مطلب رخصتی ہی ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں، یعنی یہ کہ دلہن دولہا کے گھر آ جائے اور دونوں کی تنہائی میں ملاقات ہو جائے، اور بس۔ لہٰذا اگر کسی وجہ سے دونوں کے درمیان تعلق زن وشو قائم نہ ہوا ہو تو اس سے ولیمے کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ نہ ولیمہ ناجائز ہوتا ہے، نہ نفلی قرار پاتا ہے، اور نہ یہ سمجھنا چاہئے کہ اس طرح ولیمہ کی سنت ادا نہیں ہوتی، بلکہ اگر ولیمہ رخصتی ہی سے پہلے منعقد کر لیا جائے تب بھی ولیمہ ادا ہو جاتا ہے، صرف اس کا مستحب وقت حاصل نہیں ہوتا، (یہاں دلائل کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے، جو حضرات دلائل سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی فتح الباری میں صفحہ ۲۳۱ ج ۹ پر باب الولیمہ کے تحت حدیث نمبر ۵۱۶۶ کی تشریحات ملاحظہ فرمالیں)۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب الولیمة بشاة، رقم: ٤٧٧٠

ایک صاحب نے ایک اور سوال کیا ہے اور وہ یہ کہ نکاح کے وقت جب لڑکی کے گھر والے لڑکی سے ایجاب وقبول کراتے ہیں تو کیا لڑکی کا اپنی زبان سے منظوری کا اظہار کرنا ضروری ہے یا نکاح نامے پر دستخط کر دینا کافی ہے؟ اس سلسلے میں عرض ہے کہ ہمارے یہاں شادیاں عموماً اس طرح ہوتی ہیں کہ دلہن خود نکاح کی محفل میں موجود نہیں ہوتی، بلکہ دلہن کے گھر والوں میں سے کوئی نکاح سے پہلے اس سے اجازت لیتا ہے، جو دلہن کی طرف سے وکیل کی حیثیت رکھتا ہے، اور نکاح نامے میں بھی اس کا نام وکیل کے خانے میں درج ہوتا ہے، جب یہ وکیل لڑکی سے اجازت لینے جاتا ہے تو یہ نکاح کا ایجاب وقبول نہیں ہوتا، بلکہ محض لڑکی سے نکاح کی اجازت لی جاتی ہے، اس میں اجازت لینے والے کو لڑکی سے یہ کہنا چاہئے کہ میں تمہارا نکاح فلاں ولد فلاں سے اتنے مہر پر کرنا چاہتا ہوں، کیا تمہیں یہ منظور ہے؟ اگر لڑکی کنواری ہے تو اس کا زبان سے منظور ہے کہنا ضروری نہیں بلکہ اتنا بھی کافی ہے کہ وہ انکار نہ کرے، البتہ زبان سے منظوری کا اظہار کر دے تو اور اچھا ہے، اور اگر صرف نکاح نامے پر دستخط کر دے تو بھی اجازت ہو جاتی ہے، البتہ اگر کوئی عورت پہلے شادی شدہ رہ چکی ہے اور اب یہ اس کی دوسری شادی ہے تو اس کا زبان سے منظوری کا اظہار ضروری ہے بصورت دیگر اسے منظوری نہیں سمجھا جائے گا۔

جب لڑکی سے اس طرح اجازت لے لی جائے تو جس شخص نے اجازت لی ہے وہ بحیثیت وکیل نکاح کرنے کا اختیار نکاح خواں کو دے دیتا ہے، اور پھر نکاح خواں جو الفاظ دولہا سے کہتا ہے وہ نکاح کا ایجاب ہے، اور دولہا جو جواب دیتا ہے قبول اور ان دونوں کلمات سے نکاح کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

۱۱ رجب ۱۴۱۶ھ/ ۴ دسمبر ۱۹۹۵ء

☆☆☆

طلاق کا صحیح طریقہ ☆

میرا مختلف حیثیتوں میں عام مسلمانوں کے خاندانی، بالخصوص ازدواجی تنازعات سے کافی واسطہ رہا ہے، اور یہ دیکھ دیکھ کر دکھ ہوتا رہا ہے کہ ہمارے معاشرے میں اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت اتنی بڑھ گئی ہے کہ جو سامنے کی باتیں پہلے بچے بچے کو معلوم ہوتی تھیں، اب بڑوں بڑوں کو بھی معلوم نہیں ہوتیں، اسی لئے چند ماہ پہلے میں نے اس کالم میں شادی بیاہ کے مسائل اور اس سے متعلق بنیادی شرعی احکام کی وضاحت شروع کی تھی، جو مختلف عنوانات کے تحت کئی ہفتے جاری رہی، جب نکاح کا ذکر چھڑا تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ''طلاق'' کے بارے میں کچھ گذارشات پیش کر دی جائیں، کیونکہ طلاق کے بالکل ابتدائی احکام سے بھی عام لوگ ناواقف ہو چکے ہیں، اور اس بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں عام ہو چکی ہیں۔

سب سے پہلی غلطی تو یہ ہے کہ بہت سے لوگوں نے طلاق کو غصہ نکالنے کا ایک ذریعہ سمجھا ہوا ہے، جہاں میاں بیوی میں کوئی اختلاف پیش آیا، اور نوبت غصے اور اشتعال تک پہنچی، شوہر نے فوراً طلاق کے الفاظ زبان سے نکال دیئے، حالانکہ طلاق کوئی گالی نہیں ہے جو غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے دے دی جائے، یہ نکاح کا رشتہ ختم کرنے کا وہ انتہائی اقدام ہے جس کے نتائج بڑے سنگین ہیں، اس سے صرف نکاح کا رشتہ ہی ختم نہیں ہوتا، بلکہ خاندانی زندگی کے بہت سے مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں، میاں بیوی ایک دوسرے کے لئے اجنبی بن جاتے ہیں، بچوں کی پرورش کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، املاک کی تقسیم میں پیچیدگی پیدا ہوتی ہے، مہر، نفقہ اور عدت کے معاملات پر اس کا اثر پڑتا ہے، غرض نہ صرف میاں بیوی، بلکہ ان کی اولاد، بلکہ پورے خاندان پر اس کے دوررس اثرات پڑتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جہاں طلاق کی اجازت دی ہے، وہاں اسے ''ابغض المباحات'' قرار دیا ہے، یعنی یہ وہ چیز ہے جو جائز کاموں میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ مبغوض اور ناپسندیدہ ہے، عیسائی مذہب کا اصل تصور یہ تھا کہ میاں بیوی جب ایک مرتبہ نکاح کے رشتے میں بندھ جائیں تو اب طلاق دینے یا لینے کا کوئی راستہ نہیں ہے، بائبل میں تو طلاق کو بدکاری کے برابر قرار دیا گیا ہے،

☆ ذکر و فکر، ص: ۳۱۹

اسلام چونکہ دین فطرت ہے، اس لئے اس نے طلاق کے بارے میں یہ سخت موقف تو اختیار نہیں کیا، اس لئے کہ میاں بیوی کی زندگی میں بعض اوقات ایسے مرحلے پیش آ جاتے ہیں، جب دونوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ وہ شرافت کے ساتھ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں، ایسے موقع پر نکاح کے رشتے کو ان پر زبردستی تھوپے رکھنا دونوں کی زندگی کو عذاب بنا سکتا ہے۔ (یہی وجہ ہے کہ عیسائی مذہب طلاق کے بارے میں اپنے اس قدیم موقف پر قائم نہیں رہ سکا، جس کی داستان بڑی طویل اور عبرتناک ہے) اس لئے اسلام نے طلاق کو ناجائز یا حرام تو قرار نہیں دیا، اور نہ اس کے ایسے لگے بندھے اسباب متعین کیے جو علیحدگی کے معاملے میں میاں بیوی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈال دیں، لیکن اول تو آنحضرت ﷺ نے صاف صاف فرما دیا کہ مباح (جائز) چیزوں میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند طلاق ہے۔ (۱)

دوسرے میاں بیوی کو ایسی ہدایات دی ہیں کہ ان پر عمل کیا جائے تو طلاق کی نوبت کم سے کم آئے، تیسرے اگر طلاق کی نوبت آ ہی جائے تو اس کا ایسا طریقہ بتایا ہے جس میں خرابیاں کم سے کم ہوں، آج اگر لوگ ان ہدایات اور احکام کو اچھی طرح سمجھ لیں، اور ان پر عمل کریں تو نہ جانے کتنے گھریلو تنازعات اور خاندانی مسائل خود بخود حل ہو جائیں۔

جہاں تک ان ہدایات کا تعلق ہے جو طلاق کے سدباب کے لئے دی گئی ہیں ان میں سب سے پہلی ہدایت تو آنحضرت ﷺ نے یہ دی ہے کہ اگر کسی شوہر کو اپنی بیوی کی کوئی بات ناپسند ہے، تو اسے اس کی اچھی باتوں پر بھی غور کرنا چاہئے، مقصد یہ ہے کہ دنیا میں کوئی شخص بے عیب نہیں ہوتا، اگر کسی میں ایک خرابی ہے تو دس اچھائیاں بھی ہو سکتی ہیں، ایک خرابی کو لے کر بیٹھنا اور دس اچھائیوں سے آنکھ بند کر لینا انصاف کے بھی خلاف ہے، اور اس سے کوئی مسئلہ حل بھی نہیں ہو سکتا، بلکہ قرآن کریم نے تو یہاں تک فرما دیا کہ ”اگر تمہیں اپنی بیوی کی کوئی بات ناپسند ہے تو (یہ سوچو) کہ شاید تم جس چیز کو برا سمجھ رہے ہو، اللہ تعالیٰ نے اس میں تمہارے لئے کوئی بڑی بھلائی رکھی ہو“ (۲)

دوسری ہدایت قرآن کریم نے یہ دی ہے کہ جب میاں بیوی آپس میں اپنے اختلافات طے نہ کر سکیں اور نرم و گرم ہر طریقہ آزمانے کے بعد بھی تنازعہ برقرار رہے تو فوراً علیحدگی کا فیصلہ کرنے کے بجائے دونوں کے خاندان والے ایک ایک شخص کو ثالث بنائیں، اور یہ دونوں طرف کے نمائندے

---

(۱) سنن أبی داؤد کتاب الطلاق، باب فی کراھیة الطلاق، رقم: ١٨٦٢، سنن ابن ماجه، کتاب الطلاق، باب حدثنا سوید بن سعید، رقم: ٢٠٠٨

(۲) النساء: ١٩

آپس میں ٹھنڈے دل سے حالات کا جائزہ لے کر میاں بیوی کے درمیان تنازعہ ختم کرنے کی کوشش کریں، ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمادیا کہ اگر یہ دونوں نیک نیتی سے اصلاح کی کوشش کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے درمیان موافقت پیدا فرمادے گا۔(۱)

لیکن اگر یہ تمام کوششیں بالکل ناکام ہو جائیں اور طلاق ہی کا فیصلہ کرلیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ حکم دیا ہے کہ شوہر اس کے لئے مناسب وقت کا انتظار کرے، مناسب وقت کی تشریح آنحضرت ﷺ نے یہ فرمائی ہے کہ طلاق اس وقت دی جائے جب بیوی طہر کی حالت میں ہو، یعنی اپنے ماہانہ نسوانی دورے سے فارغ ہو چکی ہو، اور فراغت کے بعد سے دونوں کے درمیان وظیفۂ زوجیت ادا کرنے کی نوبت نہ آئی ہو، لہٰذا اگر عورت طہر کی حالت میں نہ ہو تو ایسے وقت طلاق دینا شرعاً گناہ ہے، نیز اگر طہر ایسا ہو کہ اس میں میاں بیوی کے درمیان ازدواجی قربت ہو چکی ہو، تب بھی طلاق دینا شرعاً نہیں، ایسی صورت میں طلاق دینے کے لئے شوہر کو اگلے مہینے تک انتظار کرنا چاہئے۔

اس طریق کار میں یوں تو بہت سی مصلحتیں ہیں، لیکن ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ طلاق کسی وقتی منافرت یا جھگڑے کا نتیجہ نہ ہو، شوہر کو مناسب وقت کے انتظار کا حکم اس لئے بھی دیا گیا ہے کہ اس عرصے میں وہ تمام حالات پر اچھی طرح غور کرلے، اور جس طرح نکاح سوچ سمجھ کر ہوا تھا، اسی طرح طلاق بھی سوچ سمجھ کر ہی دی جائے، چنانچہ عین ممکن ہے کہ اس انتظار کے نتیجے میں دونوں کی رائے بدل جائے، حالات بہتر ہو جائیں، اور طلاق کی نوبت ہی نہ آئے۔

پھر اگر مناسب وقت آجانے پر بھی طلاق کا ارادہ برقرار رہے تو شریعت نے طلاق دینے کا صحیح طریقہ یہ بتایا ہے کہ شوہر صرف ایک طلاق دے کر خاموش ہو جائے، اس طرح ایک رجعی طلاق ہو جائے گی، جس کا حکم یہ ہے کہ عدت گزر جانے پر نکاح کا رشتہ شرافت کے ساتھ خود بخود ختم ہو جائے گا، اور دونوں اپنے اپنے مستقبل کے لئے کوئی فیصلہ کرنے میں آزاد ہوں گے۔

اس طریقے میں فائدہ یہ ہے کہ طلاق دینے کے بعد اگر مرد کو اپنی غلطی کا احساس ہو، اور وہ یہ سمجھے کہ حالات اب بہتر ہو سکتے ہیں تو وہ عدت کے دوران اپنی دی ہوئی طلاق سے رجوع کر سکتا ہے، جس کے لئے زبان سے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ”میں نے طلاق سے رجوع کرلیا“ اس طرح نکاح کا رشتہ خود بخود تازہ ہو جائے گا، اور اگر عدت بھی گزر گئی ہو اور دونوں میاں بیوی یہ سمجھیں کہ اب انہوں نے سبق سیکھ لیا ہے، اور آئندہ وہ مناسب طریقے پر زندگی گزار سکتے ہیں تو ان کے لئے یہ راستہ کھلا ہوا ہے کہ وہ باہمی رضامندی سے دوبارہ از سر نو نکاح کرلیں (جس کے لئے نیا ایجاب وقبول، گواہ اور مہر سب ضروری ہے)

(۱) النساء: ۳۵

اگر مذکورہ سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میاں بیوی نے پھر سے نکاح کا رشتہ تازہ کر لیا ہو، اور پھر کسی وجہ سے دونوں کے درمیان تنازعہ کھڑا ہو جائے، تب بھی دوسری طلاق دینے میں جلدی نہ کرنی چاہئے، بلکہ ان تمام ہدایات پر عمل کرنا چاہئے جو اوپر بیان ہوئیں، ان تمام ہدایات پر عمل کے باوجود اگر شوہر پھر طلاق ہی کا فیصلہ کرے تو اس مرتبہ بھی ایک ہی طلاق دینی چاہئے، اب مجموعی طور پر دو طلاقیں ہو جائیں گی، لیکن معاملہ اس کے باوجود میاں بیوی کے ہاتھ میں رہے گا۔

یعنی عدت کے دوران شوہر پھر رجوع کر سکتا ہے، اور عدت گزرنے کے بعد دونوں باہمی رضامندی سے تیسری بار پھر نکاح کر سکتے ہیں۔

یہ ہے طلاق کا وہ طریقہ جو قرآن و حدیث میں بیان ہوا ہے، اور اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ قرآن و سنت نے نکاح کے رشتے کو برقرار رکھنے اور اسے ٹوٹنے سے بچانے کے لئے درجہ بہ درجہ کتنے راستے رکھے ہیں، ہاں اگر کوئی شخص ان تمام درجوں کو پھلانگ جائے تو پھر نکاح و طلاق آنکھ مچولی کا کوئی کھیل نہیں ہے جو غیر محدود زمانے تک جاری رکھا جائے، لہٰذا جب تیسری طلاق بھی دے دی جائے تو شریعت کا حکم یہ ہے کہ اب نکاح کو تازہ کرنے کا کوئی راستہ نہیں، اب نہ شوہر رجوع کر سکتا ہے، نہ میاں بیوی باہمی رضامندی سے نیا نکاح کر سکتے ہیں، اب دونوں کو علیحدہ ہونا ہی پڑے گا۔

ہمارے معاشرے میں طلاق کے بارے میں انتہائی سنگین غلط فہمی یہ پھیل گئی ہے کہ تین سے کم طلاقوں کو طلاق ہی نہیں سمجھا جاتا، لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر طلاق کا لفظ صرف ایک یا دو مرتبہ لکھا جائے تو اس سے طلاق ہی نہیں ہوتی، چنانچہ جب کبھی طلاق کی نوبت آتی ہے تو لوگ تین طلاقوں سے کم پر بس نہیں کرتے، اور کم سے کم تین مرتبہ طلاق کا لفظ استعمال کرنا ضروری سمجھتے ہیں، حالانکہ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا طلاق صرف ایک مرتبہ کہنے سے بھی ہو جاتی ہے، بلکہ شریعت کے مطابق طلاق کا صحیح اور احسن طریقہ یہی ہے کہ صرف ایک مرتبہ طلاق کا لفظ کہا جائے لکھا جائے، اس طرح طلاق تو ہو جاتی ہے، لیکن اگر بعد میں سوچ سمجھ کر نکاح کا رشتہ تازہ کرنا ہو تو اس کے دروازے کسی کے نزدیک مکمل طور پر بند نہیں ہوتے، بلکہ ایک ساتھ تین مرتبہ طلاق کا لفظ استعمال کرنا شرعاً گناہ ہے، اور حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی چاروں فقہی مکاتب فکر کے نزدیک اس گناہ کی ایک سزا یہ ہے کہ اس کے بعد رجوع یا نئے نکاح کا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا، اور جو لوگ ان فقہی مکاتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں ان کو اکثر تین طلاقیں ایک ساتھ دینے کے بعد شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لہٰذا طلاق کے معاملے میں سب سے پہلے تو یہ غلط فہمی دور کرنے کی ضرورت ہے کہ ایک مرتبہ طلاق کا لفظ استعمال کرنے سے طلاق نہیں ہوتی، اور یہ بات اچھی طرح لوگوں میں عام کرنی ضروری ہے کہ طلاق کا صحیح

اور احسن طریقہ یہی ہے کہ صرف ایک مرتبہ طلاق کا لفظ استعمال کیا جائے، اس سے زیادہ نہیں، اگر عدت کے دوران شوہر کے رجوع کا حق ختم کرنا مقصود ہو تو ایک طلاق بائن دے دی جائے، یعنی طلاق کے ساتھ بائن کا لفظ بھی ملا لیا جائے تو شوہر کو یک طرفہ طور پر رجوع کرنے کا حق نہیں رہے گا، البتہ باہمی رضامندی سے دونوں میاں بیوی جب چاہیں نیا نکاح کر سکیں گے۔ یہ بات کہ طلاق کا احسن طریقہ یہی ہے کہ صرف ایک طلاق دی جائے، پوری امت میں مسلم ہے، اور اس میں کسی مکتب فکر کا اختلاف نہیں ہے، ضرورت ہے کہ علماء کرام اپنے خطبوں میں اس مسئلے کو عوام کے سامنے واضح کریں، اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے بھی طلاق کے یہ احکام لوگوں تک پہنچائے جائیں۔

۵ محرم ۱۴۱۷ھ / ۲۳ مئی ۱۹۹۶ء

احسان اور ازدواجی زندگی ☆

حضرت ڈاکٹر محمد عبدالحی صاحب عارفی (رحمۃ اللہ علیہ) ہمارے زمانے کی ان درخشاں شخصیتوں میں سے تھے جو عمر بھر شہرت، پبلسٹی اور نام ونمود سے دامن بچا کر زندگی گزارتے ہیں، لیکن ان کی سیرت و کردار کی خوشبو خود بخود دلوں کو کھینچتی اور ماحول کو معطر کرتی ہے، وہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے تربیت یافتہ اور تصوف وسلوک میں ان کے خلیفہ مجاز تھے، چنانچہ لوگ اپنے اعمال واخلاق کی اصلاح کے لئے ان سے رجوع کرتے اور ان کی ہدایات سے فیض یاب ہوتے تھے، ایک مرتبہ ایک صاحب حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس حاضر ہوئے، اور اپنا حال بیان کرتے ہوئے کہنے لگے کہ ''الحمدللہ، مجھے احسان کا درجہ حاصل ہو گیا ہے'' (احسان ایک قرآنی اصطلاح ہے جس کی تشریح حدیث میں یہ کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس دھیان کے ساتھ کی جائے جیسے عبادت کرنے والا اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے، یا کم از کم اس دھیان کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہے ہیں) ان صاحب کا مطلب یہ تھا کہ عبادت کی ادائیگی کے دوران بحمداللہ مجھے یہ دھیان حاصل ہو گیا ہے، جسے حدیث کی اصطلاح میں احسان کہا جاتا ہے۔

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں انہیں مبارک باد دی، اور فرمایا ''احسان واقعی بڑی نعمت ہے، جس کے حاصل ہونے پر شکر ادا کرنا چاہئے، لیکن میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ احسان کا یہ درجہ صرف نماز ہی میں حاصل ہوا ہے یا جب آپ اپنے بیوی بچوں سے یا دوست احباب سے کوئی معاملہ کرتے ہیں اس وقت بھی یہ دھیان باقی رہتا ہے؟'' اس پر وہ صاحب کہنے لگے کہ ہم نے تو یہی سنا تھا کہ احسان کا تعلق نماز اور دوسری عبادتوں کے ساتھ ہے، لہٰذا میں نے تو اس کی مشق نماز ہی میں کی ہے، اور بفضلہٖ تعالیٰ نماز کی حد تک یہ مشق کامیاب رہی ہے، لیکن نماز سے باہر زندگی کے عام معاملات میں کبھی احسان کی مشق کا خیال ہی نہیں آیا، حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے اسی غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے آپ سے یہ سوال کیا تھا، بے شک نماز اور دوسری عبادتوں میں یہ دھیان مطلوب ہے، کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں، لیکن اس دھیان کی ضرورت صرف نماز ہی

☆ ذکر وفکر، ص:۳۰۲

کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ زندگی کے ہر کام میں اس کی ضرورت ہے، انسان کو لوگوں کے ساتھ زندگی گزارتے اور ان کے ساتھ مختلف معاملات انجام دیتے ہوئے بھی یہ دھیان رہنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں، خاص طور پر میاں بیوی کا تعلق ایسا ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لئے دم دم کے ساتھی ہوتے ہیں، اور ان کی رفاقت میں بے شمار اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں، بہت سی ناگواریاں بھی پیش آتی ہیں، اور ایسے مواقع بھی آتے ہیں جب انسان کا نفس اسے ان ناگواریوں کے جواب میں ناانصافیوں پر ابھارتا ہے، ایسے موقع پر اس دھیان کی ضرورت کہیں زیادہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں، اگر یہ احساس ایسے وقت دل میں جاگزین نہ ہو تو عموماً اس کا نتیجہ ناانصافی اور حق تلفی کی صورت میں نکلتا ہے۔

اس کے بعد حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام عمر کبھی اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ طبعی غصے اور ڈانٹ ڈپٹ کا معاملہ نہیں فرمایا، اور اس سنت پر عمل کی کوشش میں میں نے بھی یہ مشق کی ہے کہ میں اپنے گھر والوں پر غصہ نہ اتاروں، چنانچہ میں اللہ تعالیٰ کے شکر کے طور پر کہتا ہوں کہ آج مجھے اپنی اہلیہ کے ساتھ رفاقت کو اکیاون سال ہو چکے ہیں لیکن اس عرصے میں الحمد للہ، میں نے کبھی ان سے لہجہ بدل کر بھی بات نہیں کی۔ بعد میں ایک مرتبہ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ محترمہ نے ازخود حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ تمام عمر مجھے یاد نہیں ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے کبھی ناگواری کے لہجے میں بات کی ہو، اور نہ کبھی مجھے یہ یاد ہے کہ انہوں نے مجھ سے براہِ راست اپنا کوئی کام کرنے کو کہا ہو، میں خود ہی اپنے شوق سے ان کے کام کرنے کی کوشش کرتی تھی، لیکن وہ مجھ سے نہیں کہتے تھے۔

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ باتیں آج مجھے اس لئے یاد آ گئیں کہ میں نے پچھلے ہفتے خطبہ نکاح کا پیغام کی تشریح کرتے ہوئے یہ عرض کیا تھا کہ پر مسرت اور خوشگوار ازدواجی زندگی کے لئے تقویٰ ضروری ہے، حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ عمل (جو ہوا میں اڑنے اور پانی پر چلنے کی کرامتوں سے ہزاروں درجہ اونچے درجے کی کرامت ہے) درحقیقت اسی تقویٰ کا نتیجہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی عملی تصویر تھا کہ

''تم میں سب سے بہتر لوگ وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے لئے بہتر ہوں'' (۱)

(۱) سنن الترمذي، كتاب المناقب عن رسول الله، باب فضل أزواج النبي، رقم: ۳۸۳۰، سنن ابن ماجه، كتاب النكاح، باب حسن معاشرة النساء، رقم: ۱۹٦۷، سنن الدارمي، كتاب النكاح، باب في حسن معاشرة النساء، رقم: ۲۱٦۰

بے شک قرآن کریم نے مردوں کو عورتوں پر قوام (نگران) قرار دیا ہے، لیکن آنحضرت ﷺ نے اپنے ارشادات اور اپنے عمل سے یہ بات واضح فرما دی ہے کہ نگران ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مرد ہر وقت عورتوں پر حکم چلایا کرے، بیوی کے ساتھ خادمہ جیسا معاملہ کرے، یا اسے اپنی آمریت کے شکنجے میں کس کر رکھے، حقیقت یہ ہے کہ خود قرآنِ کریم نے ہی ایک دوسری جگہ میاں بیوی کے رشتے کو مودت (دوستی) اور رحمت سے تعبیر فرمایا ہے۔

نیز اسی آیت میں شوہر کے لئے بیوی کو سکون کا ذریعہ قرار دیا ہے، (الروم: ۲۱) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ میاں بیوی کے درمیان اصل رشتہ دوستی اور محبت کا ہے، اور دونوں ایک دوسرے کے لئے سکون اور راحت کا ذریعہ ہیں، لیکن اسلام ہی کی ایک تعلیم یہ ہے کہ جب کبھی کوئی اجتماعی کام کیا جائے تو لوگوں کو چاہئے کہ وہ کسی کو اپنا امیر بنالیں، تاکہ کام نظم وضبط کے ساتھ انجام پائے، یہاں تک کہ اگر دو شخص کسی سفر پر جارہے ہوں تب بھی مستحسن یہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے میں سے کسی ایک کو امیر بنالیں، خواہ وہ دونوں آپس میں دوست ہی کیوں نہ ہوں، اب جس شخص کو بھی امیر بنایا جائے وہ ہر وقت دوسرے پر حکم چلانے کے لئے نہیں، بلکہ سفر کے معاملات کی ذمہ داری اٹھانے کے لئے امیر بنایا گیا ہے، اس کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے ساتھی یا ساتھیوں کی خبر گیری کرے، سفر کا ایسا انتظام کرے جو سب کی راحت و آرام کے لئے ضروری ہو، اور جب وہ یہ فرائض انجام دے تو دوسروں کا کام یہ ہے کہ وہ ان امور میں اس کی اطاعت اور اس کے ساتھ تعاون کریں۔

جب اسلام نے ایک معمولی سے سفر کے لئے بھی یہ تعلیم دی ہے تو زندگی کا طویل سفر اس تعلیم سے کیسے خالی رہ سکتا ہے؟ لہٰذا جب میاں بیوی اپنی زندگی کا مشترک سفر شروع کر رہے ہوں تو ان میں سے شوہر کو اس سفر کا امیر یا نگران بنایا گیا ہے، کیونکہ اس سفر کی ذمہ داریاں اٹھانے کے لئے جو جسمانی قوت اور جو صفات درکار ہیں وہ قدرتی طور پر مرد میں زیادہ ودیعت کی گئی ہیں، لیکن اس انتظام سے یہ حقیقت ماند نہیں پڑتی کہ دونوں کے درمیان اصل تعلق دوستی، محبت اور رحمت کا تعلق ہے، اور ان میں سے کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ دوسرے کے ساتھ ایک نوکر کا سا معاملہ کرے، یا شوہر اپنے امارت کے منصب کی بنیاد پر یہ سمجھے کہ بیوی اس کے ہر حکم کی تعمیل کے لئے پیدا ہوئی ہے، یا اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ بیوی سے اپنی ہر جائز یا ناجائز خواہش کی تکمیل کرائے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو جو قوت اور جو صفات عطا کی ہیں ان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے اس منصب کو جائز حدود میں رہتے ہوئے بیوی کی دلداری میں استعمال کرے، اور اس کی جائز خواہشات کو حتی الامکان پورا کرے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بیوی کو جو مقام بخشا ہے، اور اسے جو حقوق عطا کیے ہیں ان کا تقاضا ہے کہ وہ اپنی خداداد صلاحیتیں

اپنے شریک زندگی کے ساتھ تعاون اور اسے خوش رکھنے میں صرف کرے، اگر دونوں یہ کام کرلیں تو نہ صرف یہ کہ گھر دونوں کے لئے دنیوی جنت بن جاتا ہے بلکہ ان کا یہ طرز عمل مستقل عبادت کے حکم میں ہے جو آخرت کی حقیقی جنت کا وسیلہ بھی ہے، اسی لئے دونوں کو نکاح کے خطبے میں تقویٰ کا حکم دیا گیا ہے، اور اسی لئے حضرت ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ احسان کا موقع صرف نماز ہی نہیں بلکہ میاں بیوی کے تعلقات بھی ہیں۔

قرآن کریم کی بے شمار آیات میں سے آنحضرت ﷺ نے نکاح کے خطبے کے لئے خاص طور پر انہی تین آیات کا جو انتخاب فرمایا یقیناً اس میں کوئی بڑی مصلحت ہوگی، غور کیا جائے تو ان تینوں آیتوں میں جو بات مشترک طور پر کہی گئی ہے، وہ تقویٰ کا حکم ہے، تینوں آیتیں اسی حکم سے شروع ہو رہی ہیں، کہ تقویٰ اختیار کرو، کوئی نادان یہ کہہ سکتا ہے کہ تقویٰ کا شادی بیاہ سے کیا جوڑ؟ لیکن جو شخص حالات کے نشیب وفراز اور میاں بیوی کے تعلقات کی نزاکتوں کو جانتا ہے، اور جسے ازدواجی الجھنوں کی تہہ تک پہنچنے کا تجربہ ہے وہ اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میاں بیوی کے خوشگوار تعلقات اور ایک دوسرے کے حقوق کی ٹھیک ٹھیک ادائیگی کے لئے تقویٰ ایک لازمی شرط ہے، میاں بیوی کا رشتہ نازک ہوتا ہے، ان دونوں کے سینے میں چھپے ہوئے جذبات اور ان کی حقیقی سرشت ایک دوسرے کے سامنے اتنی کھل کر آتی ہے کہ کسی اور کے سامنے اتنی کھل کر نہیں آسکتی، دوسروں کے سامنے ایک شخص اپنی بدطینتی کو ظاہری مسکراہٹوں کے پردے میں چھپا سکتا ہے، اپنے اندر کے انسان پر خوبصورت الفاظ اور اوپری خوش اخلاقی کا ملمع چڑھا سکتا ہے، لیکن بیوی کے ساتھ اپنے شب وروز کے معاملات میں وہ یہ ملمع باقی نہیں رکھ سکتا، اسے اپنی ظاہرداری کے خول سے کبھی نہ کبھی باہر نکلنا ہی پڑتا ہے، اور اگر اندر کا یہ انسان تقویٰ سے آراستہ نہ ہو تو اپنے شریک زندگی کا جینا دوبھر کر دیتا ہے، ایک بیوی کو اپنے شوہر سے جو تکلیفیں پہنچتی ہیں، ان کا ازالہ ہمیشہ عدالت کے ذریعہ نہیں ہوسکتا، ان میں سے بے شمار تکلیفیں ایسی ہیں جو وہ عدالت تو کجا اپنے کسی قریبی رشتہ دار کے سامنے بھی بیان نہیں کرسکتی، اسی طرح ایک شوہر کو بیوی سے جو شکایتیں ہوسکتی ہیں بسا اوقات شوہر کے پاس ان کا کوئی حل نہیں ہوتا، نہ کسی اور کے ذریعے وہ انہیں دور کرنے کا کوئی سامان کرسکتا ہے، اس قسم کی تکلیفوں اور شکایتوں کا کوئی علاج دنیا کی کوئی طاقت فراہم نہیں کرسکتی، ان کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ دونوں کے دل میں تقویٰ ہو، یعنی وہ اس احساس کی دولت سے مالا مال ہوں کہ وہ ایک دوسرے کے لئے امانت ہیں، اور اس امانت کی جواب دہی انہیں اپنے اللہ کے سامنے کرنی ہے، اپنے شریک زندگی کو اپنے کسی طرزِ عمل سے ستا کر وہ شاید دنیا کی جواب دہی سے بچ جائیں، لیکن ایک دن آئے گا جب وہ اللہ کے سامنے کھڑے

ہوں گے، اور انہیں اپنی ایک ایک حق تلفی کا وبال بھگتنا پڑے گا، اسی احساس کا نام تقویٰ ہے، اور یہی وہ چیز ہے جو انسان کے دل پر ان تنہائیوں میں بھی پہرہ بٹھاتی ہے، جہاں اسے کوئی اور دیکھنے والا نہیں ہوتا، آنحضرت ﷺ یہ چاہتے ہیں کہ جب وہ مرد و عورت زندگی کے سفر میں ایک دوسرے کے ساتھی بنیں تو وہ روزانہ ہونے سے پہلے اپنے دلوں پر یہ غیبی پہرہ بٹھالیں، تاکہ ان کی دوستی پائیدار ہو، اور ان کے دل میں ایک دوسرے کی محبت محض وقتی نفسانیت کی پیداوار نہ ہو، جو نئی نویلی زندگی کا جوش ٹھنڈا ہونے کے بعد فنا ہو جائے، بلکہ وہ تقویٰ کے سائے میں پلی ہوئی پائیدار محبت ہو جو خود غرضی سے پاک اور ایثار و فاداری اور خیر خواہی کے سدا بہار جذبات سے مزین ہوتی ہے، اور جسم سے گذر کر واقعی قلب و روح کی گہرائیوں تک سرایت کر جاتی ہے، اس لئے آنحضرت ﷺ نے نکاح کے خطبے میں ان تین آیات کا انتخاب فرمایا جن میں سے ہر آیت تقویٰ کے حکم سے شروع ہو رہی ہے، اور وہی اس کا بنیادی پیغام ہے۔

۲۵ رجب ۱۴۱۶ھ/ ۱۸ دسمبر ۱۹۹۵ء

☆☆☆

بیوی کے حقوق، شریعت اسلامیہ کی روشنی میں ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾(۱)

﴿وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْا أَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ وَإِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْراً رَّحِيْماً﴾ (۲)

وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَآءِ خَيْرًا فَاِنَّ الْمَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ وَاِنَّ اَعْوَجَ مَا فِی الضِّلَعِ اَعْلَاهُ فَاِنْ ذَهَبْتَ تُقِيْمُهٗ كَسَرْتَهٗ وَاِنْ تَرَكْتَهٗ لَمْ يَزَلْ اَعْوَجَ فَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ))(۳)

حقوق العباد کی اہمیت

ان آیات قرآنیہ اور حدیث نبوی کی روشنی میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ حقوق العباد کا بیان شروع فرما رہے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے اور اس کے پیغمبر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بندوں کے جو حقوق ضروری قرار دیئے

☆ اصلاحی خطبات (۴/۔۷۰) ۲۹ مئی ۱۹۹۲ء، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی، بعد از نماز عصر۔ زیر نظر درس امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "ریاض الصالحین" کے باب نمبر ۳۰ "باب الوصية بالنساء" (صفحہ ۱۲۳ تا ۱۲۷) کا درس ہے۔

(۱) النسآء: ۱۹

(۲) النسآء: ۱۲۹

(۳) صحيح البخاری، كتاب النكاح، باب الوصية بالنساء، رقم: ٤٧٨٧، صحيح مسلم، كتاب الرضاع، باب الوصية بالنساء، رقم: ٢٦٧١، سنن الترمذی، كتاب الرضاع، باب ماجاء فی حق المرأة علی زوجها، رقم: ١٠٨٣، سنن ابن ماجه، كتاب النكاح، باب حق المرأة علی الزوج، رقم: ١٨٤١

ہیں اور جن کے تحفظ کا حکم دیا ہے۔ ان کا بیان یہاں سے شروع فرما رہے ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے بھی بار بار عرض کر چکا ہوں کہ ''حقوق العباد'' دین کا بہت اہم شعبہ ہے اور یہ اتنا اہم شعبہ ہے کہ ''حقوق اللہ'' تو توبہ سے معاف ہو جاتے ہیں، یعنی اگر خدانخواستہ حقوق اللہ سے متعلق کوئی کوتاہی سرزد ہو جائے (خدا نہ کرے) تو اس کا علاج بہت آسان ہے کہ انسان کو جب کبھی اس پر ندامت پیدا ہو تو توبہ و استغفار کر لینے سے معاف ہو جاتے ہیں، لیکن بندوں کے حقوق ایسے ہیں کہ اگر ان میں کوتاہی ہو جائے تو اگر اس پر کبھی ندامت ہو اور اس پر توبہ و استغفار کرے تب بھی وہ گناہ معاف نہیں ہوتے جب تک کہ حق دار کو اس کا حق نہ پہنچایا جائے، یا جب تک صاحب حق اس کو معاف نہ کر دے، اس لئے حقوق العباد کا معاملہ بڑا سنگین ہے۔

ہم غیبت کو گناہ ہی نہیں سمجھتے

حقوق العباد کا معاملہ جتنا سنگین ہے ہمارے معاشرے میں اس سے غفلت اتنی ہی عام ہے ہم لوگوں نے چند عبادات کا نام دین رکھ لیا ہے یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، ذکر، تلاوت، تسبیح وغیرہ ان چیزوں کو تو ہم دین سمجھتے ہیں، لیکن حقوق العباد کو ہم نے دین سے خارج کیا ہوا ہے، اور اسی طرح معاشرتی حقوق کو بھی دین سے خارج کر رکھا ہے، اس میں اگر کوئی شخص کوتاہی یا غلطی کرتا ہے تو اس کو اس کی سنگینی کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

غیبت حقوق العباد تلف کرنے کے مترادف ہے

اس کی سادہ سی مثال یہ ہے کہ (خدا نہ کرے) کوئی مسلمان شراب نوشی کی لت میں مبتلا ہو۔ تو ہر وہ مسلمان جس کو ذرا سا بھی دین سے لگاؤ ہے۔ وہ اس کو برا سمجھے گا، اور خود وہ شخص بھی اپنے فعل پر نادم ہوگا کہ میں یہ ایک گناہ کا کام کر رہا ہوں، لیکن ایک دوسرا شخص ہے جو لوگوں کی غیبت کرتا ہے۔ اس غیبت کرنے والے کو معاشرے میں شراب پینے والے کے برابر برا نہیں سمجھا جاتا، اور نہ خود غیبت کرنے والا اپنے آپ کو گناہ گار اور مجرم خیال کرتا ہے۔ حالانکہ گناہ کے اعتبار سے شراب پینا جتنا بڑا گناہ ہے، غیبت کرنا بھی اتنا ہی بڑا گناہ ہے، بلکہ غیبت اس لحاظ سے شراب پینے سے زیادہ سنگین ہے کہ اس کا تعلق حقوق العباد سے ہے، اور اس لحاظ سے بھی زیادہ سنگین ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ اس کی ایسی مثال دی ہے کہ دوسرے گناہوں کی ایسی مثال نہیں دی۔ چنانچہ اللہ رب العزت نے فرمایا:

''غیبت کرنے والا ایسا ہے جیسے مردہ بھائی کا گوشت کھانے والا'' (۱)
لیکن اتنی سنگینی کے باوجود یہ گناہ معاشرے میں عام ہو گیا ہے، شاید ہی کوئی مجلس اس گناہ سے خالی ہوتی ہو، اور پھر اس کو برا بھی نہیں سمجھا جاتا، گویا کہ دین کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

حالت ''احسان'' ہر وقت مطلوب ہے

میرے شیخ حضرت ڈاکٹر محمد عبدالحی صاحب قدس سرہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ ایک دن فرمانے لگے کہ ایک صاحب میرے پاس آئے۔ اور آکر بڑے فخریہ انداز میں خوشی کے ساتھ کہنے لگے کہ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے ''احسان'' کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ ''احسان'' ایک بڑا درجہ ہے جس کے بارے میں حدیث میں آتا ہے:

((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ))(۲)

یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کر جیسے کہ تو اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم اس خیال کے ساتھ عبادت کر کہ اللہ تعالیٰ تجھے دیکھ رہے ہیں، اس کو درجہ ''احسان'' کہا جاتا ہے۔ ان صاحب نے حضرت والا سے کہا کہ مجھے ''احسان'' کا درجہ حاصل ہو گیا ہے، حضرت ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے ان کو مبارک باد دی کہ اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے، یہ تو بہت بڑی نعمت ہے، البتہ میں آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں کہ کیا آپ کو یہ ''احسان'' کا درجہ صرف نماز میں حاصل ہوتا ہے، اور جب بیوی بچوں کے ساتھ معاملات کرتے ہو اس وقت بھی حاصل ہوتا ہے یا نہیں؟ یعنی بیوی بچوں کے ساتھ معاملات کرتے وقت بھی آپ کو یہ خیال آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں یا یہ خیال اس وقت نہیں آتا؟ وہ صاحب جواب میں فرمانے لگے کہ حدیث میں تو یہ آیا ہے کہ جب عبادت کرے تو اس طرح عبادت کرے گویا کہ وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے، یا اللہ تعالیٰ اس کو دیکھ رہے ہیں، وہ تو صرف عبادت میں ہے ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ ''احسان'' کا تعلق صرف نماز سے ہے، دوسری چیزوں کے ساتھ احسان کا کوئی تعلق نہیں، حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے اسی لئے آپ سے یہ سوال کیا تھا، اس لئے کہ آج کل عام طور پر غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ ''احسان'' صرف نماز ہی میں مطلوب ہے، یا ذکر و تلاوت ہی میں مطلوب ہے، حالانکہ احسان ہر وقت مطلوب ہے، زندگی کے ہر

---

(۱) الحجرات: ۱۲

(۲) صحیح البخاری، کتاب الإیمان، باب سؤال جبریل النبی عن الإیمان والإسلام والإحسان، رقم: ۴۸، صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان الإیمان والإسلام والإحسان، رقم: ۹

مرحلے اور شعبے میں مطلوب ہے، دکان پر بیٹھ کر تجارت کر رہے ہو وہاں پر ''احسان'' مطلوب ہے۔ یعنی دل میں یہ استحضار ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں جب اپنے ماتحتوں کے ساتھ معاملات کر رہے ہو، اس وقت بھی ''احسان'' مطلوب ہے۔ جب بیوی بچوں اور دوست احباب اور پڑوسیوں سے معاملات کر رہے ہو۔ اس وقت بھی یہ استحضار ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں، حقیقت میں ''احسان'' کا مرتبہ یہ ہے، صرف نماز تک محدود نہیں ہے۔

ایک جہنمی عورت کا ذکر

خوب سمجھ لیں کہ نبی کریم ﷺ کی تعلیم ہماری زندگی کے ہر شعبے کے ساتھ ہے، اسی واسطے روایت میں آتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ سے ایک خاتون کے بارے میں پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ! ایک خاتون ہے۔ جو دن رات عبادت میں لگی رہتی ہے، نفل نماز اور ذکر و تلاوت بہت کرتی ہے۔ اور ہر وقت اسی میں مشغول رہتی ہے، اس خاتون کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے کہ اس کا انجام کیسا ہوگا؟ آپ نے صحابہ کرام سے پوچھا کہ وہ خاتون پڑوسیوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہے؟ صحابہ کرام نے جواب دیا کہ پڑوسیوں کے ساتھ اس کا سلوک اچھا نہیں ہے۔ پڑوس کی خواتین تو اس سے خوش نہیں ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ خاتون جہنم میں جائے گی۔

ایک جنتی عورت کا ذکر

پھر ایک ایسی خاتون کے بارے میں آپ سے پوچھا گیا کہ جو نفلی عبادت تو زیادہ نہیں کرتی تھی، صرف فرائض و واجبات پر اکتفا کرتی تھی، اور زیادہ سے زیادہ سنت مؤکدہ ادا کر لیتی۔ بس اس سے زیادہ نوافل، ذکر و تلاوت نہیں کرتی تھی۔ مگر پڑوسیوں اور دوسرے لوگوں کے ساتھ اس کے معاملات اچھے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ خاتون جنت میں جائے گی۔(۱)

حقیقی مفلس کون ہے؟

ان احادیث میں آنحضرت ﷺ نے یہ بات واضح فرما دی کہ اگر کوئی شخص نفلی عبادت کرے تو یہ بڑی اچھی بات ہے، اور اگر نفلی عبادت نہ کرے تو آخرت میں سوال نہیں ہوگا کہ تم نے فلاں نفلی

(۱) مسند احمد بن حنبل، مسند أبي هريرة، رقم: ۹۲۹۸، الأدب المفرد، باب لا يؤذي جاره، رقم: ۹۱۱، ص: ۴۸

عبادت کیوں نہیں کی۔ اس لئے کہ نفل کا مطلب ہی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کرے تو ثواب ملے گا اور اگر نہ کرے تو کوئی گناہ بھی نہیں ہوگا، لیکن حقوق العباد وہ چیز ہے کہ اس کے بارے میں قیامت کے روز سوال ہوگا اور اس پر جنت اور جہنم کا فیصلہ موقوف ہے، چنانچہ ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ مفلس وہ شخص ہے جو قیامت کے روز بڑی مقدار میں نماز روزے لے کر آئے گا۔ لیکن دنیا میں کسی کا حق مار دیا، کسی کو برا کہہ دیا، کسی کی دل آزاری کر دی تھی اور کسی کا دل دکھا دیا تھا۔ اب اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جتنے اعمال لے کر آیا تھا۔ وہ سارے کے سارے دوسروں کو دے دیئے۔ اور دوسروں کے گناہ اس پر ڈال دیئے گئے۔ (۱)

اس لئے حقوق العباد کا باب شریعت کا بہت اہم باب ہے۔

حقوق العباد، دین کا اہم ترین حصہ

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ ''اسلامی فقہ'' جس میں شریعت کے احکام بیان کیے جاتے ہیں۔ اس کو اگر چار برابر حصوں میں تقسیم کیا جائے تو اس کا ایک حصہ عبادات کے بیان پر مشتمل ہے۔ اور بقیہ تین حصے حقوق العباد کے بیان میں ہیں، یعنی ان میں معاملات اور معاشرت کو بیان کیا گیا ہے۔ آپ نے ''ہدایہ'' کا نام سنا ہوگا جو فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہے۔ یہ چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی پہلی جلد میں عبادات کا ذکر ہے۔ جس میں طہارت، نماز، روزہ، زکوٰۃ، اور حج کے احکام بیان کیے گئے ہیں۔ باقی تین جلدیں معاملات، معاشرت اور حقوق العباد سے متعلق ہیں، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حقوق العباد تین چوتھائی دین ہیں۔ اس لئے یہ بڑا اہم باب شروع ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس کو عمل کے جذبے سے پڑھنے اور سننے کی توفیق عطا فرمائے اور حقوق العباد کی اپنی رضا اور خوشنودی کے مطابق ادائیگی کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

اسلام سے پہلے عورت کی حالت

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلا باب یہ قائم فرمایا ''باب الوصیۃ بالنساء'' یعنی ان نصیحتوں کے بارے میں جو حضور اقدس ﷺ نے عورتوں کے حقوق کے متعلق بیان فرمائی ہیں، اور سب سے پہلے یہ باب اس لئے قائم فرمایا کہ سب سے زیادہ بے اعتدالیاں اور سب سے زیادہ کوتاہیاں اس حق میں ہوتی ہیں۔ جب تک اسلام نہیں آیا تھا۔ اور جب تک نبی کریم ﷺ کی تعلیمات نہیں آئی تھیں، اس

(۱) صحیح مسلم، باب تحریم الظلم، رقم: ٦٥٧٩

وقت تک عورت کو ایسی مخلوق سمجھا جاتا تھا۔ جو معاذ اللہ گویا انسانیت سے خارج ہے اور اس کے ساتھ بھیڑ بکریوں جیسا سلوک ہوتا تھا، اس کو انسانیت کے حقوق دینے سے لوگ انکار کرتے تھے۔ کسی بھی معاملے میں اس کے حقوق کی پرواہ نہیں کی جاتی تھی۔ اور یہ سمجھا جاتا تھا جیسے کسی نے اپنے گھر میں بھیڑ بکری پال لی۔ بالکل اسی طریقے سے اپنے گھر میں ایک عورت کو لا کر بٹھا دیا۔ سلوک کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔

اسلام میں عورت کا مقام

حضور اقدس ﷺ نے پہلی بار اس دنیا کو جو آسمانی ہدایات سے بے خبر تھی خواتین کے حقوق کا احساس دلایا کہ خواتین کے ساتھ حسن سلوک کرو۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے سب سے پہلے قرآن کریم کی ایک آیت نقل فرمائی۔ جو اس باب میں جامع ترین آیت ہے:

﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾(۱)

اس میں تمام مسلمانوں سے خطاب ہے کہ تم خواتین کے ساتھ "معروف" یعنی نیکی کے ساتھ اچھا سلوک کر کے زندگی گزارو، ان کے ساتھ اچھی معاشرت برتو، ان کو تکلیف نہ پہنچاؤ، یہ عام ہدایت ہے، یہ آیت گویا اس باب کا متن اور عنوان ہے، اور حضور اقدس ﷺ نے اس آیت کی تشریح اپنے اقوال اور افعال سے فرمائی۔ اور حضور ﷺ کو خواتین کے ساتھ حسن سلوک کا اس درجہ اہتمام تھا کہ آپ نے فرمایا:

((خِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَآءِهِمْ وَاَنَا خِيَارُكُمْ لِنِسَائِیْ))(۲)

"تم میں سب سے بہترین وہ لوگ ہیں جو اپنی خواتین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے ہیں۔ اور میں تم میں اپنی خواتین کے ساتھ بہترین برتاؤ کرنے والا ہوں"

آنحضرت ﷺ کو خواتین کے حقوق کی نگہداشت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا اتنا اہتمام تھا کہ بے شمار احادیث میں اس کی تشریح فرمائی۔ چنانچہ سب سے پہلی حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ

(۱) النساء: ۱۹

(۲) اس حدیث کی عبارت قابل تحقیق ہے، کیونکہ مجموعہ احادیث میں اس موضوع سے متعلق دو طرح کی روایات ملتی ہیں، ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ((خیر کم خیر کم لأهله وأنا خیر کم لأهلی)) جبکہ دوسری روایت میں یہ الفاظ یہ ہیں: ((خِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَآءِهِم)) اس دوسری روایت میں ((وَاَنَا خِيَارُكُمْ لِنِسَائِیْ)) کے الفاظ جستجو کے باوجود نہیں مل سکے۔

سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِسۡتَوۡصُوۡا بِالنِّسَآءِ خَيۡرًا)) (۱)

''میں تم کو عورتوں کے بارے میں بھلائی کی نصیحت کرتا ہوں، تم میری اس نصیحت کو قبول کرلو''

قرآن کریم صرف اصول بیان کرتا ہے

آگے بڑھنے سے پہلے یہاں ایک بات عرض کردوں کہ قرآن کریم میں آپ یہ دیکھیں گے کہ عام طور پر قرآن کریم موٹے موٹے اصول بیان کر دیتا ہے، تفصیلات اور جزئیات میں نہیں جاتا۔ انہیں بیان نہیں کرتا، یہاں تک کہ نماز جیسا اہم رکن جو دین کا ستون ہے، جس کے بارے میں قرآن کریم نے تہتر مقامات پر حکم دیا کہ نماز قائم کرو۔ لیکن نماز کیسے پڑھی جاتی ہے؟ اس کا طریقہ کیا ہوتا ہے؟ اس کی رکعتیں کتنی ہوتی ہیں؟ اور کن چیزوں سے نماز ٹوٹ جاتی ہے، اور کن چیزوں سے نہیں ٹوٹتی؟ یہ تفصیلات قرآن نے بیان نہیں کیں۔ یہ حضور اقدس ﷺ کی تعلیمات پر چھوڑ دیں، آپ نے اپنی سنت سے بیان فرمائیں، اسی طرح زکوٰۃ کا حکم بھی قرآن کریم میں کم و بیش اتنی ہی مرتبہ آیا ہے، لیکن زکوٰۃ کا نصاب کیا ہوتا ہے؟ کس پر فرض ہوتی ہے؟ کتنی فرض ہوتی ہے؟ کن کن چیزوں پر فرض ہوتی ہے؟ یہ تفصیلات قرآن کریم نے بیان نہیں کیں۔ بلکہ نبی کریم ﷺ کی تعلیمات پر چھوڑ دیں، معلوم ہوا کہ قرآن کریم عام طور پر اصول بیان کرتا ہے، تفصیلی جزئیات میں نہیں جاتا۔

گھریلو زندگی، پورے تمدن کی بنیاد ہے

لیکن مرد و عورت کے تعلقات، خاندانی تعلقات ایسی چیز ہے کہ قرآن کریم نے اس کے نازک نازک جزوی مسائل بھی صراحت کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔ ایک ایک چیز کو کھول کر بیان کر دیا ہے، اور پھر بعد میں نبی کریم ﷺ نے اس کی تشریح فرمائی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ وجہ اس کی یہ ہے کہ مرد و عورت کے جو تعلقات ہیں، اور انسان کی جو گھریلو زندگی ہے یہ پورے تمدن کی بنیاد ہوتی ہے۔ اور اس پر پورے تہذیب و تمدن کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اگر مرد و عورت کے تعلقات استوار ہیں،

---

(۱) صحيح البخاری، كتاب النكاح، باب الوصية بالنساء، رقم: ٤٧٨٧، صحيح مسلم، كتاب الرضاع، باب الوصية بالنساء، رقم: ٢٦٧١، سنن الترمذی، كتاب الرضاع، باب ماجاء فی حق المرأة على زوجها، رقم: ١٠٨٣، سنن ابن ماجه، كتاب النكاح، باب حق المرأة على الزوج، رقم: ١٨٤١

خوشگوار ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے حقوق ادا کر رہے ہیں تو اس سے گھر کا نظام درست ہوتا ہے اور گھر کا نظام درست ہونے سے اولاد درست ہوتی ہے اور اولاد کے درست ہونے سے معاشرہ سنورتا ہے۔ اور اس پر پورے معاشرے کی عمارت کھڑی ہوتی ہے، لیکن اگر گھر کا نظام خراب ہو، اور میاں بیوی کے درمیان رات دن تو تو میں میں ہوتی ہو۔ تو اس سے اولاد پر برا اثر پڑے گا۔ اور اس کے نتیجے میں جو قوم تیار ہوگی اس کے بارے میں آپ تصور کر سکتے ہیں کہ کسی شائستہ قوم کے افراد بن سکتے ہیں یا نہیں۔ اس واسطے اس کو ''عائلی احکام'' یعنی گھر داری کے احکام کہا جاتا ہے اس لئے قرآن کریم نے ان تعلقات کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی بیان فرمایا ہے۔

عورت کی پیدائش ٹیڑھی پسلی سے ہونے کا مطلب

اس کے بعد حضور اقدس ﷺ نے بہت اچھی تشبیہ بیان فرمائی ہے، اور یہ اتنی عجیب و غریب اور حکیمانہ تشبیہ ہے کہ ایسی تشبیہ ملنا مشکل ہے۔ فرمایا کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ بعض لوگوں نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا۔ اس کے بعد حضرت حوا علیہا السلام کو انہی کی پسلی سے پیدا کیا گیا، اور بعض علماء نے اس کی دوسری تشریح یہ بھی کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ عورت کی تشبیہ دیتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ عورت کی مثال پسلی کی سی ہے کہ جس طرح پسلی دیکھنے میں ٹیڑھی معلوم ہوتی ہے، لیکن پسلی کا حسن اور اس کی صحت اس کے ٹیڑھا ہونے میں ہی ہے، چنانچہ کوئی شخص اگر یہ چاہے کہ پسلی ٹیڑھی ہے، اس کو سیدھا کر دوں تو جب اسے سیدھا کرنا چاہے گا تو وہ سیدھی تو نہیں ہوگی البتہ ٹوٹ جائے گی، وہ پھر پسلی نہیں رہے گی اب دوبارہ پھر اس کو ٹیڑھا کر کے پلستر کے ذریعہ جوڑنا پڑے گا۔ اسی طرح حدیث شریف میں عورت کے بارے میں بھی یہی فرمایا:

((اِنْ ذَهَبْتَ تُقِيْمُهَا كَسَرْتَهَا وَاِنِ اسْتَمْتَعْتَ بِهَا اِسْتَمْتَعْتَ وَفِيْهَا عِوَجٌ))(۱)

''اگر تم اس پسلی کو سیدھا کرنا چاہو گے تو وہ پسلی ٹوٹ جائے گی اور اگر اس سے فائدہ اٹھانا چاہو تو اس کے ٹیڑھے ہونے کے باوجود فائدہ اٹھاؤ گے''

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب النكاح، باب الوصية بالنساء، رقم: ٤٧٨٧، صحيح مسلم، كتاب الرضاع، باب الوصية بالنساء، رقم: ٢٦٧١، سنن الترمذي، كتاب الرضاع، باب ماجاء في حق المرأة على زوجها، رقم: ١٠٨٣، سنن ابن ماجه، كتاب النكاح، باب حق المرأة على الزوج، رقم: ١٨٤١

یہ بڑی عجیب وغریب اور حکیمانہ تشبیہ حضور ﷺ نے بیان فرمائی، کہ اس کی صحت ہی اس کے ٹیڑھے ہونے میں ہے اگر وہ سیدھی ہوگی تو وہ بیمار ہے صحیح نہیں ہے۔

بعض لوگ اس تشبیہ کو عورت کی مذمت میں استعمال کرتے ہیں کہ عورت ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے، لہٰذا اس کی اصل ٹیڑھی ہے چنانچہ میرے پاس بہت سے لوگوں کے خطوط آتے ہیں جس میں کئی لوگ یہ لکھتے کہ یہ عورت ٹیڑی پسلی کی مخلوق ہے۔ گویا کہ اس کو مذمت اور برائی کے طور پر استعمال کرتے ہیں، حالانکہ خود نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کے منشا یہ نہیں ہے۔

عورت کا ٹیڑھا پن ایک فطری تقاضا ہے

بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو کچھ اور اوصاف دے کر پیدا فرمایا ہے، اور عورت کو کچھ اور اوصاف دے کر پیدا فرمایا، دونوں کی فطرت اور سرشت میں فرق ہے، سرشت میں فرق ہونے کی وجہ سے مرد عورت کے بارے میں یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ میری طبیعت اور فطرت کے خلاف ہے، حالانکہ عورت کا تمہاری طبیعت کے خلاف ہونا یہ کوئی عیب نہیں ہے، کیونکہ یہ اس کی فطرت کا تقاضہ ہے کہ وہ ٹیڑھی ہو۔ کوئی شخص پسلی کے بارے میں یہ کہے کہ پسلی کے اندر جو ٹیڑھا پن ہے وہ اس کے اندر عیب ہے، ظاہر ہے کہ وہ عیب نہیں، بلکہ اس کی فطرت کا تقاضہ ہے کہ ٹیڑھی ہو، اس لئے آنحضرت ﷺ یہ ارشاد فرمارہے ہیں کہ اگر تمہیں عورت میں کوئی ایسی بات نظر آتی ہے جو تمہاری طبیعت کے خلاف ہو، اور اس کی وجہ سے تم اس کو ٹیڑھا سمجھ رہے ہو تو اس کو اس بناء پر مذمت وتنقید کا نشانہ نہ بناؤ، بلکہ یہ سمجھو کہ اس کی فطرت کا تقاضا یہی ہے، اور اگر تم اس کو سیدھا کرنا چاہو گے تو وہ ٹوٹ جائے گی اور اگر فائدہ اٹھانا چاہو گے تو ٹیڑھا ہونے کی حالت میں بھی فائدہ اٹھا سکو گے۔

”غفلت“ عورت کے لئے حسن ہے

آج الٹا زمانہ آ گیا ہے، اس واسطے قدریں بدل گئی ہیں، خیالات بدل گئے، ورنہ بات یہ ہے کہ جو چیز مرد کے حق میں عیب ہے، بسا اوقات وہ عورت کے حق میں حسن اور اچھائی ہوتی ہے اگر ہم قرآن کریم کو غور سے پڑھیں تو قرآن کریم میں یہ بات نظر آجاتی ہے کہ جو چیز مرد کے حق میں عیب تھی، وہی چیز عورت کے بارے میں حسن قرار دی گئی۔ اور اس کو نیکی اور اچھائی کی بات کہا گیا۔ مثلاً مرد کے حق میں یہ بات عیب ہے کہ وہ جاہل اور غافل ہو۔ اور دنیا کی اس کو خبر نہ ہو، اس لئے کہ مرد پر اللہ تعالیٰ نے دنیا کے کاموں کی ذمہ داری رکھی ہے، اس لئے اس کے پاس علم بھی ہونا چاہیے،

اور اس کو باخبر بھی ہونا چاہیے، اگر باخبر نہیں ہے، بلکہ غافل ہے، اور غفلت میں مبتلا ہے تو یہ مرد کے حق میں عیب ہے لیکن قرآن کریم نے غفلت کو عورت کے حق میں حسن قرار دیا، چنانچہ سورۃ نور میں فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ﴾(۱)

"یعنی وہ لوگ جو ایسی عورتوں پر تہمتیں لگاتے ہیں جو پاک دامن ہیں، اور غافل ہیں، یعنی دنیا سے بے خبر ہیں"

تو دنیا سے بے خبری کو ایک حسن کی صفت کے طور پر قران کریم نے بیان فرمایا۔ معلوم ہوا کہ عورت اگر دنیا کے کاموں سے بے خبر ہو۔ اور اپنے فرائض کی حد تک واقف ہو اور دنیا کے معاملات اتنے نہ جانتی ہو تو وہ عورت کے حق میں عیب نہیں، بلکہ وہ صفت حسن ہے، جس کو قرآن کریم نے صفت حسن کے طور پر ذکر فرمایا۔

زبردستی سیدھا کرنے کی کوشش نہ کریں

لہٰذا جو چیز مرد کے حق میں عیب تھی، وہ عورت کے حق میں عیب نہیں اور جو چیز مرد کے حق میں عیب نہیں تھی بعض اوقات وہ عورت کے حق میں عیب ہوتی ہے۔ اس لئے اگر تمہیں ان کے اندر کوئی ایسی چیز نظر آئے جو تمہارے لئے عیب ہے لیکن عورت کے لئے عیب نہیں تو اس کی وجہ سے عورت کے ساتھ برتاؤ میں خرابی نہ کرو، اس لئے کہ پسلی ہونے کا تقاضہ ہی یہ ہے کہ وہ اپنی فطرت کے اعتبار سے تمہاری طبیعت سے مختلف ہو تو اب اس کو زبردستی سیدھا کرنے کی کوشش نہ کرو۔

سارے جھگڑوں کی جڑ

یہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔ اور آپ سے زیادہ مرد و عورت کی نفسیات سے کون واقف ہو سکتا ہے، اس لئے حضور اقدس ﷺ نے سارے جھگڑوں کی جڑ پکڑ لی کہ سارے جھگڑے صرف اس بنا پر ہوتے ہیں کہ مرد یہ چاہتا ہے کہ جیسا میں خود ہوں، یہ بھی ویسی بن جائے، تو بھائی! یہ تو ویسی بننے سے رہی، اگر ویسی بنانا چاہو گے تو ٹوٹ جائے گی اس لئے اس فکر کو تو چھوڑ دو، ہاں! جو چیزیں اس کے حق میں اس کے حالات کے لحاظ سے اس کی فطرت اور سرشت کے لحاظ سے اس کے لئے عیب ہیں، ان کی اصلاح کی فکر کرو، اور ان کی اصلاح کی فکر بھی مرد کی ذمہ داری ہے لیکن اگر تم یہ چاہو کہ وہ تمہارے مزاج اور طبیعت کے موافق ہو جائے، یہ نہیں ہو سکتا۔

---

(۱) النور: ۲۴

اس کی کوئی عادت پسندیدہ بھی ہوگی

اس باب کی دوسری حدیث بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ((لَایَفْرَكْ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً اِنْ كَرِهَ مِنْهَا خُلُقًا رَضِیَ مِنْهَا آخَرَ))(۱)

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عجیب وغریب اصول بیان فرمایا کہ کوئی مومن مرد یا کسی مومن عورت سے بالکلیہ بغض نہ رکھے، یعنی یہ نہ کرے کہ اس کو بالکلیہ فضول، احمق اور نادان قرار دے دے، اور یہ کہے کہ اس میں تو کوئی اچھائی نہیں ہے۔ اگر اس کی کوئی بات ناپسند ہے تو اس کی دوسری کوئی بات پسند بھی ہوگی۔

پہلا اصول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتا دیا کہ جب دو انسان ایک ساتھ رہتے ہیں تو کوئی بات دوسرے کی اچھی لگتی ہے، اور کوئی بری لگتی ہے۔ اگر کوئی بات بری لگ رہی ہے تو اس کی وجہ سے اس کو علی الاطلاق برا نہ سمجھو، بلکہ اس وقت اس کے اچھے اوصاف کا استحضار کرو، اس کے اندر آخر کوئی اچھائی بھی تو ہوگی۔ بس اس اچھائی کا استحضار کرکے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ یہ اچھائی تو اس کے اندر ہے، اگر یہ عمل کرو گے تو ہوسکتا ہے کہ اس کے اندر جو برائیاں ہیں۔ تمہارے دل کے اندر ان کی اتنی زیادہ اہمیت باقی نہ رہے۔

اصل بات یہ ہے کہ آدمی ناشکرا ہے۔ اگر دو تین باتیں پسند ہوئیں اور بری لگیں بس! انہیں کو لے کر بیٹھ گیا کہ اس میں تو یہ خرابی ہے۔ اس میں تو یہ خرابی ہے۔ اب اچھائی کی طرف دھیان نہیں۔ اس لئے ہر وقت روتا رہتا ہے۔ اور ہر وقت اس کی برائیاں کرتا رہتا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں اس کے ساتھ بدسلوکی کرتا ہے۔

ہر چیز خیر وشر سے مخلوط ہے

دنیا کے اندر کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ جس کے اندر برائی نہ ہو اور اس میں کوئی نہ کوئی اچھائی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا بنائی ہے۔ اس میں ہر چیز کے اندر خیر اور شر مخلوط ہے۔ کوئی چیز اس کائنات میں خیر مطلق نہیں اور کوئی شر مطلق نہیں۔ اس میں خیر وشر ملے جلے ہوتے ہیں، کوئی کافر ہے یا مشرک ہے یا کوئی برا انسان ہے، اگر اس کے اندر بھی اچھائی تلاش کرو گے تو کوئی نہ کوئی اچھائی ضرور مل جائے گی۔

(۱) صحيح مسلم، كتاب الرضاع، باب الوصية بالنساء، رقم: ۲۶۷۲، مسند أحمد، رقم: ۸۰۱۳

انگریزی کی ایک کہاوت

انگریزی کی ایک کہاوت ہے اور ہمارے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''حکمت کی بات مومن کی گمشدہ متاع ہے۔ جہاں وہ اس کو پائے، اسے لے لے''(۱)
لہٰذا انگریزی کہاوت ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ ضرور غلط ہی ہو۔ بات بڑی حکیمانہ ہے، کسی نے کہا کہ ''وہ گھنٹہ یا گھڑی جو بند ہوگئی ہو وہ بھی دن میں دو بار سچ بولتی ہے۔'' مثلاً فرض کرو کہ بارہ بج کر پانچ منٹ پر گھڑی بند ہوگئی، اب ظاہر ہے کہ ہر وقت تو وہ صحیح ٹائم نہیں بتائے گی۔ بلکہ غلط بتائے گی۔ لیکن دن میں دو مرتبہ ضرور صحیح ٹائم بتائے گی۔ ایک دن میں بارہ بج کر پانچ منٹ پر، اور ایک رات میں بارہ بج کر پانچ منٹ پر، تو دو مرتبہ وہ ضرور سچ بولے گی۔
کہاوت کہنے والے کا مقصد یہ ہے کہ چاہے کتنی بھی بیکار اور بری چیز ہو۔ لیکن اگر اس میں اچھائی تلاش کرو گے تو مل جائے گی۔ اسی طرح دنیا کے اندر کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کے اندر کوئی نہ کوئی اچھائی نہ ہو۔

کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

ہمارے والد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ اقبال مرحوم کا ایک شعر بہت پڑھا کرتے تھے کہ ؎

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

مطلب یہ ہے کہ جو چیز بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے۔ اپنی حکمت اور مشیت سے پیدا فرمائی ہے۔ اگر غور کرو گے تو ہر ایک کے اندر حکمت اور مصلحت نظر آئے گی لیکن ہوتا یہ ہے کہ آدمی صرف برائیوں کو دیکھتا رہتا ہے۔ اچھائیوں کی طرف نگاہ نہیں کرتا۔ اس وجہ سے وہ بددل ہو کر ظلم اور ناانصافی کا ارتکاب کرتا ہے۔

عورت کے اچھے وصف کی طرف نگاہ کرو

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا:

(۱) سنن الترمذي، كتاب العلم عن رسول الله، باب ماجاء في فضل الفقه على العبادة، رقم: ۲۶۱۱، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب الحكمة، رقم: ۴۱۵۹

﴿فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾(۱)

اگر تمہیں وہ عورتیں پسند نہیں ہیں جو تمہارے نکاح میں آ گئیں، تو اگر چہ وہ تمہیں ناپسند ہیں لیکن ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں بہت خیر رکھی ہو۔ اس لئے حکم یہ ہے کہ عورت کے اچھے وصف کی طرف نگاہ کرو اس سے تمہارے دل کو تسلی بھی ہوگی اور بدسلوکی کے راستے بھی بند ہوں گے۔

ایک بزرگ کا سبق آموز واقعہ

حکیم الامت حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بزرگ کا قصہ لکھا ہے کہ ایک بزرگ کی بیوی بہت لڑنے جھگڑنے والی تھی۔ ہر وقت لڑتی رہتی تھی۔ جب گھر میں داخل ہوتے بس لعنت ملامت لڑائی جھگڑا شروع ہو جاتا۔ کسی صاحب نے ان بزرگ سے کہا کہ دن رات کی جھک جھک اور لڑائی آپ نے کیوں پالی ہوئی ہے، یہ قصہ ختم کر دیجئے اور طلاق دے دیجئے۔ تو ان بزرگ نے جواب دیا کہ بھائی! طلاق دینا تو آسان ہے، جب چاہوں گا، دے دوں گا، بات دراصل یہ ہے کہ اس عورت میں اور تو بہت سی خرابیاں نظر آتی ہیں۔ لیکن اس کے اندر ایک وصف ایسا ہے۔ جس کی وجہ سے میں ان کو کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ اور کبھی طلاق نہیں دوں گا۔ اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر وفاداری کا ایسا وصف رکھا ہے کہ اگر بالفرض میں گرفتار ہو جاؤں اور پچاس سال تک جیل میں بند رہوں تو مجھے یقین ہے کہ میں اس کو جس کونے میں بٹھا کر جاؤں گا اسی کونے میں بیٹھی رہے گی۔ اور کسی اور کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھے گی۔ اور یہ وفاداری ایسا وصف ہے کہ اس کی کوئی قیمت نہیں ہوسکتی۔

حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ اور نازک مزاجی

حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کا نام سنا ہوگا بڑے ولی اللہ گزرے ہیں، اور ایسے نفیس مزاج اور نازک مزاج بزرگ تھے کہ اگر کسی نے صراحی کے اوپر گلاس ٹیڑھا رکھ دیا تو اس کو ٹیڑھا دیکھ کر سر میں درد ہو جاتا تھا۔ ایسے نازک مزاج آدمی تھے۔ ذرا بستر پر شکنیں آ جائیں تو سر میں درد ہو جاتا تھا۔ لیکن ان کو بیوی جو ملی وہ بڑی بدسلیقہ، بدمزاج، زبان کی پھوہڑ، ہر وقت کچھ نہ کچھ بولتی رہتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو عجیب عجیب طریقے سے آزماتے ہیں اور ان کے درجات بلند فرماتے

---

(۱) النساء: ۱۹

ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک آزمائش تھی لیکن انہوں نے ساری عمر ان کے ساتھ نبھایا۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ میرے گناہوں کو شاید اس طرح معاف فرمادیں۔

ہمارے معاشرے کی خواتین دنیا کی حوریں ہیں

ہمارے حضرت حکیم الامت قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے ہندوستان پاکستان کے معاشرے کی خواتین دنیا کی حوریں ہیں اور اس کی وجہ یہ بیان فرماتے کہ ان کے اندر وفاداری کا وصف ہے جب سے مغربی تہذیب وتمدن کا وبال آیا ہے اس وقت سے رفتہ رفتہ یہ وصف بھی ختم ہوتا جارہا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر وفاداری کا ایسا وصف رکھا ہے کہ چاہے کچھ ہو جائے لیکن یہ اپنے شوہر پر جان نثار کرنے کے لئے تیار ہے۔ اور اس کی نگاہ شوہر کے علاوہ کسی اور پر نہیں پڑتی۔

بہر حال ان بزرگ نے حقیقت میں اسی حدیث پر عمل کر کے دکھلایا:

((اِنْ كَرِهَ مِنْهَا خُلُقًا رَضِيَ مِنْهَا آخَرَ))(۱)

کہ اگر ایک بات ناپسند ہے اس عورت کی، تو دوسری بات پسند بھی ہوگی اس کی طرف دھیان اور خیال کرو، اور اس کے نتیجے میں اس کے ساتھ حسن سلوک کرو، ساری خرابی یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ برائیوں کی طرف نگاہ ہوتی ہے، اچھائیوں کی طرف نگاہ نہیں ہوتی۔

بیوی کو مارنا بداخلاقی ہے

اس باب کی تیسری حدیث ہے:

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ زَمْعَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّهُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْطُبُ ثُمَّ ذَكَرَ النِّسَآءَ فَوَعَظَ فِيهِنَّ فَقَالَ ((يَعْمِدُ اَحَدُكُمْ فَيَجْلِدُ امْرَأَتَهُ جَلْدَ الْعَبْدِ فَلَعَلَّهُ يُضَاجِعُهَا مِنْ آخِرِ يَوْمِهِ))(۲)

ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا اور اس خطبے میں بہت سی باتیں ارشاد فرمائیں، لیکن اس خطبے میں اس باب سے متعلق جو باتیں ارشاد فرمائیں وہ یہ کہ آپ نے فرمایا کہ یہ

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب الرضاع، باب الوصية بالنساء، رقم: ۲٦۷۲، مسند أحمد، رقم: ۸۰۱۳

(۲) صحيح البخاري، كتاب تفسير القرآن، باب وقال مجاهد بطغواها بمعاصيها ولايخاف عتباها، رقم: ٤٥٦١، صحيح مسلم، كتاب الجنة وصفة نعيمها وأهلها، باب النار يدخلها الجبارون والجنة يدخلها الضعفاء، رقم: ۵۰۹۵ مسند أحمد، رقم: ۱۵٦۳۱

بری بات ہے کہ تم میں سے ایک شخص اپنی بیوی کو اس طرح مارتا ہے جیسے آقا اپنے غلام کو مارتا ہے۔ اور دوسری طرف اسی سے اپنی جنسی خواہش بھی پوری کرتا ہے یہ کتنی بداخلاقی اور بے غیرتی کی بات ہے کہ آدمی اپنی بیوی کو اس طرح مارے جس طرح غلام کو مارا جاتا ہے۔

بیوی کی اصلاح کے تین درجات

جیسا کہ میں نے عرض کیا، قرآن کریم نے میاں بیوی کے تعلقات کی چھوٹی چھوٹی جزئیات اور مسائل کا حکم بھی بیان کرنے کا اہتمام کیا ہے میاں بیوی کے درمیان چپقلش کا پہلا درجہ یہاں سے شروع ہو جاتا ہے کہ شوہر کو بیوی کی کوئی بات ناپسند ہو گئی اس کا حل قرآن کریم نے یہ بتا دیا کہ جب ایک بات تمہیں ناپسند ہو گئی تو تم یہ دیکھو کہ دوسری بات اس کے اندر پسندیدہ ہو گی، اور پھر بھی اگر شوہر یہ سمجھتا ہے کہ اس کے اندر بعض باتیں ایسی ہیں جو قابل برداشت نہیں ہیں بلکہ اصلاح کے لائق ہیں اور ظاہر ہے کہ مرد کو اس بات کا بھی مکلّف بنایا گیا ہے کہ اگر وہ بیوی میں کوئی بات قابل اصلاح اور بری دیکھے تو اس کی اصلاح کی فکر کرے لیکن اس کی اصلاح کا طریقہ کیا ہونا چاہیے؟ وہ طریقہ قرآن کریم نے یہ بتا دیا:

﴿وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ﴾(۱)

سب سے پہلے تو ان کو نرمی خوش اخلاقی اور محبت سے نصیحت کرو، یہ اصلاح کا پہلا درجہ ہے، اگر نصیحت کے ذریعہ وہ باز آجائیں تو بس، اب آگے قدم نہ بڑھاؤ، اور اگر وعظ ونصیحت کا اثر نہ ہو تو پھر اصلاح کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ سونا چھوڑ دو، اپنا بستر الگ کر دو، اگر ذرا بھی سمجھ ہو گی، فہم میں درستگی ہو گی تو اب باز آجائیں گی۔ (بستر الگ کرنے کی تفصیل آگے مستقل حدیث کے تحت آرہی ہے)

بیوی کو مارنے کی حد

اگر اصلاح کا دوسرا درجہ بھی کارگر ثابت نہ ہو تو پھر تیسرا درجہ اختیار کرو، وہ ہے مارنا، لیکن مار کیسی ہونی چاہیے؟ اور کس قدر ہونی چاہیے؟ اس کے بارے میں حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے امت کو جو آخری نصیحتیں فرمائیں، ان میں یہ نصیحت بھی فرمائی:

---

(۱) النساء: ۳٤

((وَاضْرِبُوْهُنَّ ضَرْباً غَيْرَ مُبَرِّحٍ))(۱)

یعنی اول تو مار کا مرحلہ آنا بھی نہیں چاہیے اور اگر آئے بھی تو اس صورت کو صرف اس وقت استعمال کیا جائے جب اس کے علاوہ کوئی چارہ باقی نہ رہے اس لئے کہ مار بالکل آخری چارہ کار ہے، اور اس میں یہ قید لگا دی کہ وہ مار تکلیف دینے والی نہ ہو، یعنی اس مار سے تکلیف دینا مقصود نہ ہو بلکہ تادیب مقصود ہو اور اصلاح مقصود ہو اس لئے تکلیف دینے والی ایسی مار جائز نہیں جس سے نشان پڑ جائے۔ (مارنے کے بارے میں مزید تفصیل ان شاء اللہ آگے مستقل حدیث کے تحت آرہی ہے)

بیویوں کے ساتھ آپ ﷺ کا سلوک

جب نبی کریم ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے اس وقت نو ازواج مطہرات آپ کے نکاح میں تھیں اور وہ ازواج مطہرات آسمان سے نزول کیے ہوئے فرشتے نہیں تھے وہ اسی معاشرے کے افراد تھے اور ان کے درمیان وہ باتیں بھی ہوا کرتی تھیں جو سوکنوں کے درمیان آپس میں ہوا کرتی ہیں۔ اور وہ مسائل بھی کھڑے ہوتے تھے جو بعض اوقات شوہر اور بیوی میں کھڑے ہو جاتے ہیں، لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ساری عمر نہ صرف یہ کہ کسی خاتون پر ہاتھ نہیں اٹھایا بلکہ جب کبھی گھر کے اندر داخل ہوتے تو چہرہ مبارک پر تبسم ہوتا تھا۔ (۲)

آپ ﷺ کی سنت

سرکار دو عالم ﷺ کی سنت یہی ہے کہ ان پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے، اور مارنے کی جو اجازت ہے، وہ ناگزیر حالات کے اندر ہے، ورنہ عام حالات میں تو مارنے کی اجازت بھی نہیں اور نبی کریم ﷺ کی سنت بھی نہیں ہے، سنت وہ ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے چہرہ مبارک پر تبسم ہوتا تھا۔

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کرامت

حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہ۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ ہمیں

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الرضاع، باب ماجاء فی حق المرأة علی زوجها، رقم: ۱۰۸۳، وفی کتاب تفسیر القرآن عن رسول الله، باب من سورة التوبة، رقم: ۳۰۱۲

(۲) سبل الهدى والرشاد فی سیرة خیر العباد، باب فی ضحکه صلی الله علیه وسلم وتبسمه (۱۲۱/۷)، کنز العمال، رقم: ۱۸۷۱۹ (۲۲۲/۷)

کبھی کبھی تعلیم کے طور پر فرمایا کرتے تھے کہ ”آج میرے نکاح کو پچپن سال ہو گئے ہیں لیکن الحمدللہ کبھی اس پچپن سال کے عرصہ میں لہجہ بدل کر بات نہیں کی“ میں کہا کرتا ہوں کہ لوگ پانی پر تیرنے اور ہوا میں اڑنے کو کرامت سمجھتے ہیں اصل کرامت تو یہ ہے کہ پچپن سال بیوی کے ساتھ زندگی گزاری۔ اور یہ تعلق ایسا ہوتا ہے کہ جس میں یقیناً ناگواریاں پیدا ہوتی ہیں، یہ بات ممکن نہیں کہ ناگواری نہ ہوتی ہو، لیکن فرماتے ہیں کہ ”میں نے لہجہ بدل کر بات نہیں کی“ اور اس سے آگے بڑھ کر ان کی اہلیہ اور ہماری پیرانی صاحبہ فرماتی ہیں کہ ساری عمر مجھ سے یہ نہیں کہا کہ ”مجھے پانی پلا دو“ یعنی اپنی طرف سے کسی کام کا حکم نہیں دیا کہ یہ کام کر دو، میں خود اپنے شوق اور جذبے سے سعادت سمجھ کر ان کا خیال رکھتی اور ان کا کام کرتی تھی، لیکن ساری عمر زبان سے انہوں نے مجھے کسی چیز کا حکم نہیں دیا۔

طریقت بجز خدمت خلق نیست

حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”میں نے تو اپنے آپ کو یہ سمجھ لیا ہے اور اسی پر اعتقاد رکھتا ہوں، اور اسی پر خاتمہ چاہتا ہوں کہ میں تو خادم ہوں، مجھے تو اللہ تعالیٰ نے خدمت کے لئے دنیا میں بھیجا ہے، جتنے میرے اہل تعلقات ہیں، ان کی خدمت میرے ذمے ہے میں مخدوم بنا کر نہیں بھیجا گیا کہ دوسرے لوگ میری خدمت کریں، بلکہ میں خادم ہوں، اپنی بیوی کا بھی خادم، اپنے بچوں کا خادم، اپنے مریدین کا بھی خادم اور اپنے متعلقین کا بھی خادم ہوں اس لئے کہ بندے کے لئے خادمیت کا مقام اچھا ہے اس لئے میں خادم ہوں“ فرمایا کہ ؎

زتسبیح و سجادہ و دلق نیست
طریقت بجز خدمت خلق نیست

طریقت درحقیقت خدمت خلق ہی کا نام ہے، حضرت فرمایا کرتے تھے کہ جب میں نے یہ سمجھ لیا کہ میں خادم ہوں۔ مخدوم نہیں ہوں۔ تو خادم دوسروں پر کیسے حکم چلائے کہ یہ کام کر دو۔ ساری عمر اس طرح گزاری کہ جب ضرورت پیش آتی، خود کام کرتے، کسی سے نہیں کہتے۔ یہ ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع، ظاہری چیزوں میں تو ہم لوگ سنت کا اتباع کر لیتے ہیں۔ لیکن اخلاق میں معاملات میں معاشرت میں اور زندگی گزارنے کے طریقوں میں بھی سنت کی اتباع کرنی چاہیے۔

صرف دعویٰ کافی نہیں

اتباع سنت بڑی عجیب وغریب چیز ہے۔ یہ انسان کی دنیا بھی بناتی ہے اور آخرت بھی بناتی

ہے، اور زندگی کو استوار کرتی ہے، اور یہ صرف دعویٰ کرنے سے حاصل نہیں ہوتی ؎

وَكُلٌّ يَدَّعِىْ حُبًّا لِلَيْلٰى
وَلَيْلٰى لَاتُقَرِّبُهُمْ بِذَالِكْ

یہ صرف عمل سے حاصل ہوتی ہے کہ آدمی اپنے اخلاق میں، اپنے کردار میں، اور اپنے عمل سے اس چیز کو اپنائے کہ جس کے ساتھ ادنیٰ تعلق بھی ہو گیا، اس کو اپنی ذات سے ادنیٰ تکلیف بھی نہ پہنچائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے بیوی کی اصلاح کا تیسرا درجہ جو بتایا ہے اس کی تشریح نبی کریم ﷺ نے اپنے عمل سے اس طرح فرمائی ہے کہ ساری عمر میں کبھی بیوی پر ہاتھ نہیں اٹھایا، چاہے کتنی ناگواری کیوں نہ ہو گئی، اور ان لوگوں کو جو اپنی بیویوں پر ہاتھ اٹھاتے ہیں، برے لوگ اور بدترین لوگ قرار دیا۔

خطبہ حجۃ الوداع کا ایک اقتباس

عَنْ عَمْرِو بْنِ الْاَحْوَصِ الْجُشَمِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّهٗ سَمِعَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ يَقُوْلُ بَعْدَ اَنْ حَمِدَ اللّٰهَ تَعَالٰى وَاَثْنٰى عَلَيْهِ وَذَكَّرَ وَوَعَظَ ثُمَّ قَالَ: ((اَلَا وَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَآءِ خَيْرًا، فَاِنَّمَا هُنَّ عَوَانٍ عِنْدَكُمْ لَيْسَ تَمْلِكُوْنَ مِنْهُنَّ شَيْئًا غَيْرَ ذٰلِكَ، اِلَّا اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ))(۱)

اس حدیث میں حضور نبی کریم ﷺ کے آخری خطبہ کا ایک اقتباس بیان کیا گیا ہے، یہ خطبہ جو آنحضرت ﷺ نے اپنے آخری حج، حجۃ الوداع کے موقع پر دیا تھا، اس خطبہ میں صراحۃً آپ نے یہ فرما دیا کہ شاید اس سال کے بعد میں تم کو یہاں نہ دیکھ سکوں، لہٰذا اس خطبہ میں آپ نے وہ باتیں چن چن کر ارشاد فرمائیں جن کے اندر امت کے پھسل جانے اور گمراہ ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ تاکہ قیامت تک امت کے لئے ایک دستور العمل اور ایک لائحہ عمل سامنے آ جائے؟ اور امت کی گمراہی کے جتنے راستے ہیں۔ اس خطبہ میں ان راستوں کو بند کرنے کی کوشش فرمائی۔

خطبہ تو بہت طویل ہے لیکن اس خطبہ کے مختلف حصے مختلف مقامات پر بیان ہوئے ہیں اور یہ بھی اسی خطبہ کا حصہ ہے، جس میں مرد و عورت کے باہمی حقوق کو بیان فرمایا گیا ہے پھر خاص کر

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الرضاع، باب ماجاء فی حق المرأة علی زوجها، رقم: ۱۰۸۳، وفی کتاب تفسیر القرآن عن رسول الله، باب من سورة التوبة، رقم: ۳۰۱۲

مردوں کو عورتوں کے حقوق پہچاننے اور ان کا خیال رکھنے کی تاکید فرمائی گئی ہے، اب آپ ان حقوق کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں یہ حقوق آپ ﷺ خطبہ حجۃ الوداع میں ایسے موقع پر ارشاد فرما رہے ہیں جبکہ یہ خیال بھی ہے کہ آئندہ اس طرح سب لوگوں کے سامنے بات کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ لہٰذا حضور اقدس ﷺ نے دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے جن چیزوں کو بیان کرنے کے لئے منتخب فرمایا، اور جن باتوں کی اہمیت آپ نے محسوس فرمائی کہ امت کو ہر حال میں ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیے، ان میں مرد و عورت کے باہمی حقوق بھی داخل ہیں۔

میاں بیوی کے تعلقات کی اہمیت

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی زندگی میں شوہر اور بیوی کے تعلقات کو کتنی اہمیت حاصل ہے۔ اور خود صاحب شریعت یعنی نبی کریم ﷺ نے اس کی کتنی اہمیت محسوس فرمائی ہے۔ کیونکہ اگر میاں بیوی آپس میں ایک دوسرے کے حقوق صحیح طور پر ادا نہ کریں۔ اور باہم تلخیوں پر کمر باندھ لیں تو اس کے ذریعہ صرف ایک دوسرے کے حقوق ہی ضائع نہیں ہوتے، بلکہ بالآخر اس کا اثر دونوں خاندانوں پر پڑتا ہے اور بچوں پر اس کا اثر پڑتا ہے اور اس کی وجہ سے اولاد خراب ہوتی ہے اور چونکہ سارے تمدن کی بنیاد خاندان اور گھر پر ہے اس لئے اس کے نتیجے میں پورا تمدن بگڑ جاتا ہے، اس واسطے حضور اقدس ﷺ نے بڑی اہمیت کے ساتھ اس کی تاکید فرمائی۔

عورتیں تمہارے پاس مقید ہیں

حضرت عمرو بن الاحوص جشمی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس خطبہ میں آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان فرمائی۔ اور وعظ و نصیحت فرمائی، اور پھر فرمایا کہ خوب سن لو، میں تمہیں عورتوں کے ساتھ بھلائی کی نصیحت کرتا ہوں تم اس نصیحت کو قبول کر لو، یہ وہی جملہ ہے جو پچھلی حدیث میں آیا تھا۔ اور اگلا جملہ یہ ارشاد فرمایا:

((فَاِنَّمَا هُنَّ عَوَانٍ عِنْدَكُمْ))

''اس لئے کہ وہ خواتین تمہارے پاس تمہارے گھروں میں مقید رہتی ہیں''

نبی کریم ﷺ نے خواتین کا یہ ایک ایسا وصف بیان فرمایا کہ اگر مرد صرف اس وصف پر غور کرے تو اس کو کبھی ان کے ساتھ بدسلوکی کا خیال بھی نہ آئے۔

ایک نادان لڑکی سے سبق لو

ہمارے حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک نادان اور غیر تعلیم یافتہ لڑکی سے سبق لو کہ صرف دو بول پڑھ کر جب ایک شوہر سے تعلق قائم ہو گیا، ایک نے کہا کہ میں نے نکاح کیا۔ اور دوسرے نے کہا کہ میں نے قبول کرلیا۔ اس لڑکی نے اس دو بول کی ایسی لاج رکھی کہ ماں کو اس نے چھوڑا، باپ کو اس نے چھوڑا، بہن بھائیوں کو اس نے چھوڑا، اپنے خاندان کو چھوڑا، اور پورے کنبے کو چھوڑا، اور شوہر کی ہو گئی۔ اور اس کے پاس آ کر مقید ہو گئی تو اس دو بول کی اس نادان لڑکی نے اتنی لاج رکھی اور اتنی وفاداری کی۔ تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک نادان لڑکی تو اس دو بول کا اتنا بھرم رکھتی ہے کہ سب کو چھوڑ کر ایک کی ہو گئی، لیکن تم سے یہ نہیں ہو سکا کہ تم یہ دو بول

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

پڑھ کر اس اللہ کے ہو جاؤ جس کے لئے یہ دو بول پڑھے تھے۔ تم سے تو وہ نادان لڑکی اچھی کہ یہ دو بول پڑھ کر اس کی اتنی لاج رکھتی ہے، تم سے اتنی لاج بھی نہیں رکھی جا سکتی کہ اس اللہ کے ہو جاؤ۔

عورت نے تمہارے لئے کتنی قربانیاں دی ہیں

اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ یہ دیکھو کہ اس نے تمہاری خاطر کتنی بڑی قربانی دی۔ اگر بالفرض معاملہ برعکس ہوتا۔ اور تم سے یہ کہا جاتا کہ تمہاری شادی ہو گی، لیکن تمہیں اپنا خاندان چھوڑنا ہو گا۔ اپنے ماں باپ چھوڑنے ہوں گے۔ یہ تمہارے لئے کتنا مشکل کام ہوتا، ایک اجنبی ماحول، اجنبی گھر، اجنبی آدمی کے ساتھ زندگی بھر نباہ کے لئے وہ عورت مقید ہو گئی۔ اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ کیا تم اس قربانی کا لحاظ نہیں کرو گے؟ اس قربانی کا لحاظ کرو، اور اس کے ساتھ اچھا معاملہ کرو۔

اس کے علاوہ تمہارا ان پر کوئی مطالبہ نہیں

اس کے بعد بڑا سنگین جملہ ارشاد فرمایا، جب کبھی اس جملے کی تشریح کی نوبت آتی ہے تو مرد لوگ ناراض ہو جاتے ہیں وہ جملہ یہ ہے:

((لَيْسَ تَمْلِكُوْنَ مِنْهُنَّ شَيْئًا غَيْرَ ذٰلِكَ))

یعنی تمہیں ان پر صرف اتنا حق حاصل ہے کہ وہ تمہارے گھر میں رہیں، اس کے علاوہ شرعاً ان پر تمہارا کوئی مطالبہ نہیں۔

کھانا پکانا عورت کی شرعی ذمہ داری نہیں

اسی بنیاد پر فقہاء کرام نے یہ مسئلہ بیان کیا جو بڑا نازک مسئلہ ہے۔ جس کے بیان کرنے سے بہت سے لوگ ناراض ہو جاتے ہیں، وہ مسئلہ یہ ہے کہ گھر کا کھانا پکانا عورت کی شرعی ذمہ داری نہیں ہے۔ یعنی شرعاً یہ فریضہ ان پر عائد نہیں ہوتا کہ وہ ضرور کھانا پکائیں۔ بلکہ فقہاء کرام نے یہاں تک لکھا ہے کہ عورتوں کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم ان عورتوں کی ہے جو اپنے گھر میں اپنے میکے میں بھی گھر کا کام کیا کرتی تھیں۔ اور دوسری قسم کی عورتیں وہ ہیں جو اپنے گھر میں کھانا نہیں پکاتی تھیں۔ بلکہ نوکر چاکر تھے۔ وہ کھانا پکاتے تھے۔ اگر دوسری قسم کی عورت شادی کے بعد شوہر کے گھر آجائے تو اس کے ذمہ کھانا پکانا کسی طرح بھی واجب نہیں نہ دیانۃً، نہ قضاءً، نہ اخلاقاً، نہ شرعاً، بلکہ وہ عورت شوہر سے کہہ سکتی ہے کہ میرا نفقہ تو تمہارے ذمہ واجب ہے بجائے اس کے کہ میں کھانے پکاؤں تم میرے لئے پکا پکا کھانا لاکر دو، چنانچہ فقہاء کرام لکھتے ہیں کہ اس صورت میں پکا پکایا کھانا لاکر عورت کو دینا شوہر کی ذمہ داری ہے۔ اور اس عورت سے نہ قضاء کھانا پکانے کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے اور نہ دیانۃً، اس لئے کہ حضور اقدس ﷺ نے صاف اور واضح الفاظ میں یہ فرمایا:

((لَيْسَ تَمْلِكُونَ مِنْهُنَّ شَيْئًا غَيْرَ ذٰلِكَ))

یعنی تمہیں یہ حق حاصل ہے کہ ان کو اپنے گھر پر رکھو اور تمہاری اجازت کے بغیر ان کو گھر سے باہر جانا جائز نہیں۔ لیکن اس کے علاوہ ان پر کوئی ذمہ داری شرعاً نہیں ہے۔

اور اگر وہ پہلی قسم کی عورت ہے یعنی جو اپنے گھر میں کھانا پکاتی تھی۔ اور کھانا پکاتی ہوئی شوہر کے گھر آئی ہے تو اس کے ذمہ کھانا پکانا قضاء واجب نہیں ہے۔ لیکن دیانۃً واجب ہے۔ یعنی بزور عدالت تو اس سے کھانا پکانے کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں! البتہ اس کی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنا کھانا خود پکائے۔ اس صورت میں شوہر کے ذمہ یہ ہے کہ وہ کھانا پکانے کا سامان لاکر دے دے۔ باقی شوہر یا بچوں کے لئے کھانا پکانا۔ یہ اس کی ذمہ داری بھی نہیں ہے۔ اور یہ عورت شوہر سے یہ مطالبہ نہیں کر سکتی کہ تم میرے لئے پکا پکایا کھانا لاکر دو۔ لیکن اگر وہ شوہر اور بچوں کے لئے کھانا پکانے سے انکار کر دے تو اب اس سے عدالت کے زور پر کھانا پکانے کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا، فقہاء کرام نے اتنی تفصیل کے ساتھ یہ مسائل بیان فرمائے ہیں۔

ساس، سسر کی خدمت واجب نہیں

ایک بات اور سمجھ لیجیے جس میں بڑی کوتاہی ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ جب عورت کے ذمہ شوہر کا اور اس کی اولاد کا کھانا پکانا واجب نہیں تو شوہر کے جو ماں باپ اور بہن بھائی ہیں ان کے لئے کھانا پکانا اور ان کی خدمت کرنا بطریق اولیٰ واجب نہیں۔ ہمارے یہاں یہ دستور چل پڑا ہے کہ جب بیٹے کی شادی ہوئی۔ تو اس بیٹے کے ماں باپ یہ سمجھتے ہیں کہ بہو پر بیٹے کا حق بعد میں ہے، اور ہمارا حق پہلے ہے، لہٰذا یہ بہو ہماری خدمت ضرور کرے۔ چاہے بیٹے کی خدمت کرے یا نہ کرے، اور پھر اس کے نتیجے میں ساس بہو بھاوج اور نندوں کے جھگڑے کھڑے ہو جاتے ہیں، اور ان جھگڑوں کے نتیجے میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔

ساس سسر کی خدمت عورت کی سعادت مندی ہے

خوب سمجھ لیجیے اگر والدین کو خدمت کی ضرورت ہے تو لڑکے کے ذمے واجب ہے کہ وہ خود ان کی خدمت کرے، البتہ اس لڑکے کی بیوی کی سعادت مندی ہے کہ وہ اپنے شوہر کے والدین کی خدمت بھی خوش دلی سے اپنی سعادت اور باعث اجر سمجھ کر انجام دے، لیکن لڑکے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی بیوی کو اپنے والدین کی خدمت کرنے پر مجبور کرے، جبکہ وہ خوش دلی سے ان کی خدمت پر راضی نہ ہو۔ اور نہ والدین کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی بہو کو اس بات پر مجبور کریں کہ وہ ہماری خدمت کرے، لیکن اگر وہ بہو خوش دلی سے اپنی سعادت مندی سمجھ کر اپنے شوہر کے والدین کی جتنی خدمت کرے گی ان شاء اللہ اس کے اجر میں بہت اضافہ ہوگا۔ اس بہو کو ایسا کرنا بھی چاہیے۔ تا کہ گھر کی فضا خوش گوار رہے۔

بہو کی خدمت کی قدر کریں

لیکن ساتھ ہی دوسری جانب ساس، سسر اور شوہر کو بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ اگر یہ خدمت انجام دے رہی ہے تو یہ اس کا حسن سلوک ہے اس کا حسن اخلاق ہے، اس کے ذمہ یہ خدمت فرض واجب نہیں ہے۔ لہٰذا ان کو چاہیے کہ وہ بہو کی اس خدمت کی قدر کریں۔ اور اس کا بدلہ دینے کی کوشش کریں۔ ان حقوق اور مسائل کو نہ سمجھنے کے نتیجے میں آج گھر کے گھر برباد ہو رہے ہیں۔ ساس بہو کی اور بھاوج اور نندوں کی لڑائیوں نے گھر کے گھر اجاڑ دیئے، یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ ان حقوق کی وہ حدود جو نبی کریم ﷺ نے بیان فرمائی ہیں وہ ذہنوں میں موجود نہیں ہیں۔

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک عجیب واقعہ

حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہ نے ایک دن بڑا عجیب واقعہ سنایا کہ میرے متعلقین میں ایک صاحب تھے۔ وہ اور ان کی بیوی دونوں میری مجلس میں آیا کرتے تھے اور کچھ اصلاحی تعلق بھی قائم کیا ہوا تھا۔ دونوں نے ایک مرتبہ اپنے گھر میری دعوت کی چنانچہ میں ان کے گھر گیا، اور جا کر کھانا کھایا اور کھانا بڑا اچھا بنا ہوا تھا۔ ہمارے حضرت والا قدس اللہ سرہ کی ہمیشہ ہی عادت تھی کہ جب کھانا کھاتے تو کھانے کے بعد کھانا بنانے والی خاتون کی تعریف کرتے کہ تم نے بہت اچھا کھانا پکایا، تا کہ اس کی حوصلہ افزائی ہو، اس کا دل بڑھے، چنانچہ جب حضرت والا کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو وہ خاتون پردے کے پیچھے آئیں اور آ کر حضرت والا کو سلام کیا تو حضرت والا نے فرمایا تم نے بڑا لذیذ کھانا اور اچھا کھانا بنایا کھانا کھانے میں بڑا مزہ آیا۔ حضرت والا فرماتے ہیں کہ جب میں نے یہ جملہ کہا تو پردے کے پیچھے سے اس خاتون کی سسکیاں لینے اور رونے کی آواز آئی میں حیران ہو گیا کہ معلوم نہیں کہ میری کس بات سے ان کو تکلیف پہنچی اور ان کا دل ٹوٹا میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ آپ کیوں رو رہی ہیں؟ ان خاتون نے اپنے رونے پر بمشکل قابو پاتے ہوئے یہ کہا کہ حضرت! آج مجھے ان شوہر کے ساتھ رہتے ہوئے چالیس سال ہو گئے ہیں لیکن اس پورے عرصے میں کبھی میں نے ان کی زبان سے یہ جملہ نہیں سنا کہ "آج کھانا اچھا بنا ہے" آج جب آپ کے منہ سے یہ جملہ سنا تو مجھے رونا آ گیا۔

ایسا شخص کھانے کی تعریف نہیں کرے گا

حضرت والا بکثرت یہ واقعہ سنا کر فرماتے تھے کہ وہ شخص یہ کام ہرگز نہیں کر سکتا جس کے دل میں یہ احساس ہو کہ یہ بیوی کھانے پکانے کی جو خدمت انجام دے رہی ہے، یہ اس کا حسن سلوک اور حسن معاملہ ہے جو وہ میرے ساتھ کر رہی ہے، لیکن جو شخص اپنی بیوی کو نوکر اور خادم سمجھتا ہو کہ یہ میری خادمہ ہے، اس کو تو یہ کام ضرور انجام دینا ہے۔ کھانا پکانا اس کا فرض ہے۔ اگر کھانا اچھا پکا رہی ہے تو اس پر اس کی تعریف کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ایسا شخص کبھی اپنی بیوی کی تعریف نہیں کرے گا۔

شوہر اپنے ماں باپ کی خدمت خود کرے

ایک مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ والدین ضعیف ہیں یا بیمار ہیں۔ اور ان کو خدمت کی ضرورت

ہے، گھر میں صرف بیٹا اور بہو ہے، اب کیا کیا جائے؟ اس صورت میں بھی شرعی مسئلہ یہ ہے کہ بہو کے ذمے واجب نہیں کہ وہ شوہر کے والدین کی خدمت کرے، البتہ اس کی سعادت اور خوش نصیبی ہے، اور اجر وثواب کا موجب ہے، اگر خدمت کرے گی تو ان شاء اللہ بڑا ثواب حاصل ہوگا۔ لیکن بیٹے کو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ کام میرا ہے۔ مجھے چاہیے کہ اپنے والدین کی خدمت کروں، اب چاہے وہ خدمت خود کرے، یا کوئی نوکر اور خادمہ رکھے، لیکن اگر بیوی خدمت کر رہی ہے تو یہ اس کا حسن سلوک اور احسان سمجھنا چاہیے۔

عورت کو اجازت کے بغیر باہر جانا جائز نہیں

لیکن ایک قانون اس کے ساتھ اور بھی سن لیں، ورنہ معاملہ الٹا ہو جائے گا۔ اس لئے کہ لوگ جب یک طرفہ بات سن لیتے ہیں تو اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے تفصیل کے ساتھ عرض کیا کہ کھانا پکانا عورت کے ذمہ شرعاً واجب نہیں۔ لیکن حضور اقدس ﷺ نے یہ جو فرمایا کہ یہ تمہارے گھروں میں مقید رہتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری اجازت کے بغیر ان کے لئے کہیں جانا جائز نہیں۔ لہٰذا جس طرح فقہاء کرام نے کھانا پکانے کا مسئلہ تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، اسی طرح فقہاء نے یہ قانون بھی لکھا ہے کہ اگر شوہر عورت سے یہ کہہ دے کہ تم گھر سے باہر نہیں جاسکتیں۔ اور اپنے عزیز واقارب سے ملنے نہیں جاسکتیں۔ حتیٰ کہ اس کے والدین سے بھی ملنے کے لئے جانے سے منع کر دے تو عورت کے لئے ان سے ملاقات کے لئے گھر سے باہر جانا جائز نہیں۔ البتہ اگر والدین اپنی بیٹی سے ملنے کے لئے اس کے گھر آجائیں تو اب شوہر ان والدین کو ملاقات کرنے سے نہیں روک سکتا، لیکن فقہاء نے اس کی حد مقرر کر دی ہے کہ اس کے والدین ہفتے میں ایک مرتبہ آئیں اور ملاقات کر کے چلے جائیں۔ یہ اس عورت کا حق ہے۔ شوہر اس سے نہیں روک سکتا لیکن اجازت کے بغیر اس کے لئے جانا جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کے درمیان اس طرح توازن برابر کیا ہے کہ عورت کے ذمے قانونی اعتبار سے کھانا پکانا واجب نہیں تو دوسری طرف قانونی اعتبار سے اس کا گھر سے باہر نکلنا شوہر کی اجازت کے بغیر جائز نہیں۔

دونوں مل کر زندگی کی گاڑی کو چلائیں

یہ قانون کی بات تھی۔ لیکن حسن سلوک کی بات یہ ہے کہ وہ اس کی خوشی کا خیال رکھے۔ اور یہ اس کی خوشی کا خیال رکھے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے بھی اپنے درمیان یہ تقسیم کار فرما رکھی

تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ گھر کے باہر کے تمام کام انجام دیتے تھے۔ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا گھر کے اندر تمام کام انجام دیتی تھیں۔ یہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ اور اسی پر عمل ہونا چاہیے۔ دونوں میاں بیوی قانون کی باریکیوں میں ہر وقت نہ پڑے رہیں۔ بلکہ شوہر بیوی کے ساتھ اور بیوی شوہر کے ساتھ خوش اسلوبی کا معاملہ کرے۔ اور یہ فطری تقسیم بھی ہے کہ گھر کے کام بیوی کے ذمے اور باہر کے کام شوہر کے ذمہ ہوں۔ اس طرح دونوں مل کر زندگی کی گاڑی کو چلائیں۔

اگر بے حیائی کا ارتکاب کریں تو؟

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے آگے ارشاد فرمایا:

((اِلَّا اَنْ یَّاتِیْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ فَاِنْ فَعَلْنَ فَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ضَرْبًا غَیْرَ مُبَرِّحٍ فَاِنْ اَطَعْنَ فَلَاتَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا))

ہاں! اگر وہ عورتیں گھر میں کسی کھلی بے حیائی کا ارتکاب کریں تو وہ بے حیائی کسی قیمت پر بھی برداشت نہیں، اس صورت میں قرآن کریم کے بتائے ہوئے نسخے کے مطابق پہلے ان کو نصیحت کرو۔ اور اس کے بعد اگر وہ باز نہ آئیں تو ان کا بستر الگ کر دو۔ اور پھر بھی اگر باز نہ آئیں تو بدرجہ مجبوری اس بے حیائی پر مارنے کی بھی اجازت ہے بشرطیکہ وہ مار تکلیف دینے والی نہ ہو۔ اور اس کے بعد اگر وہ تمہاری اطاعت کر لیں۔ اور باز آ جائیں تو اب اس کے بعد کوئی راستہ ان کے خلاف تلاش نہ کرو، یعنی ان کو مزید تکلیف پہنچانے کی گنجائش نہیں۔

((اَلَا وَحَقُّهُنَّ عَلَیْكُمْ اَنْ تُحْسِنُوْا اِلَیْهِنَّ فِیْ كِسْوَتِهِنَّ وَطَعَامِهِنَّ))

خبردار! ان عورتوں کا تم پر یہ حق ہے کہ تم ان کے ساتھ اچھا معاملہ کرو، ان کے لباس میں اور ان کے کھانے میں اور ان کی دوسری ضروریات جو تمہارے ذمہ واجب ہیں تم ان میں احسان سے کام لو، صرف یہ نہیں کہ انتہائی ناگزیر ضرورت پوری کر دی، بلکہ احسان، فراخدلی اور کشادگی سے کام لو، اور ان کے لباس اور کھانے پر خرچ کرو۔

بیوی کو جیب خرچ الگ دیا جائے

یہاں دو تین باتیں اس سلسلے میں عرض کرنی ہیں، جن پر حکیم الامت حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ نے اپنے مواعظ میں جا بجا زور دیا ہے۔ اور عام طور پر ان باتوں کی طرف سے غفلت پائی جاتی ہے۔ پہلی بات جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمائی، وہ یہ کہ نفقہ صرف یہ نہیں ہے کہ بس! کھانے کا

انتظام کر دیا، اور کپڑے کا انتظام کر دیا۔ بلکہ نفقہ کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ کھانے اور کپڑے کے علاوہ بھی کچھ رقم بطور جیب خرچ کے بیوی کو دی جائے۔ جس کو وہ آزادی کے ساتھ اپنی خواہش کے مطابق صرف کر سکے۔ بعض لوگ کھانے اور کپڑے کا تو انتظام کر دیتے ہیں۔ لیکن جیب خرچ کا اہتمام نہیں کرتے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جیب خرچ دینا بھی ضروری ہے، اس لئے کہ انسان کی بہت سی ضروریات ایسی ہوتی ہیں جس کو بیان کرتے ہوئے بھی انسان شرماتا ہے، یا اس کو بیان کرتے ہوئے الجھن محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے کچھ رقم بیوی کے پاس ایسی ضروریات کے لئے بھی ہونی چاہیے، تاکہ وہ دوسرے کی محتاج نہ ہو، یہ بھی نفقہ کا ایک حصہ ہے۔ حضرت والا نے فرمایا کہ جو لوگ یہ جیب خرچ نہیں دیتے، وہ اچھا نہیں کرتے۔

خرچہ میں فراخ دلی سے کام لینا چاہیے

دوسری بات یہ ہے کہ کھانے پینے میں اچھا سلوک کرو، یہ نہ ہو کہ صرف ''قوت لا یموت'' دے دی، یعنی اتنا کھانا دے دیا جس سے موت نہ آئے۔ بلکہ احسان کرو، اور احسان کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی آمدنی کے معیار کے مطابق فراخی اور کشادگی کے ساتھ گھر کا خرچہ اس کو دے۔ بعض لوگوں کے دلوں میں یہ خلجان رہتا ہے کہ شریعت میں ایک طرف فضول خرچی اور اسراف کی ممانعت آئی ہے، اور دوسری طرف یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ گھر کے خرچ میں تنگی مت کرو، بلکہ کشادگی سے کام لو، اور اب سوال یہ ہے کہ دونوں میں حد فاصل کیا ہے؟ کون سا خرچہ اسراف میں داخل ہے اور کون سا خرچہ اسراف میں داخل نہیں؟

رہائش جائز، آسائش جائز

اس خلجان کے جواب میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے گھر کے بارے میں فرمایا کہ ایک ''گھر'' وہ ہوتا ہے جو قابل رہائش ہو۔ مثلاً جھونپڑی ڈال دی، یا چھپر ڈال دیا، اس میں بھی آدمی رہائش اختیار کر سکتا ہے۔ یہ تو پہلا درجہ ہے، جو بالکل جائز ہے، دوسرا درجہ یہ ہے کہ رہائش بھی ہو، اور ساتھ میں آسائش بھی ہو، مثلاً پختہ مکان ہے۔ جس میں انسان آرام کے ساتھ رہ سکتا ہے۔ اور گھر میں آسائش کے لئے کوئی کام کیا جائے تو اس کی ممانعت نہیں ہے اور یہ بھی اسراف میں داخل نہیں مثلاً ایک شخص ہے وہ جھونپڑی میں بھی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اور دوسرا شخص جھونپڑی میں نہیں رہ سکتا اس کو تو رہنے کے لئے پختہ مکان چاہیے۔ اور پھر اس مکان میں بھی اس کو پنکھا اور بجلی چاہیے۔ اب اگر وہ شخص اپنے

گھر میں پنکھا اور بجلی اس لئے لگاتا ہے تاکہ اس کو آرام حاصل ہو۔ تو یہ اسراف میں داخل نہیں۔

آرائش بھی جائز

تیسرا درجہ یہ ہے کہ مکان میں آسائش کے ساتھ آرائش بھی ہو۔ مثلاً ایک شخص کا پختہ مکان بنا ہوا ہے۔ پلاستر کیا ہوا ہے بجلی بھی ہے پنکھا بھی ہے۔ لیکن اس مکان پر رنگ نہیں کیا ہوا، اب ظاہر ہے کہ رہائش تو ایسے مکان میں بھی ہو سکتی ہے لیکن رنگ و روغن کے بغیر آرائش نہیں ہو سکتی، اب اگر کوئی شخص آرائش کے حصول کے لئے مکان پر رنگ و روغن کرائے تو شرعاً وہ بھی جائز ہے۔

نمائش جائز نہیں

اس کے بعد چوتھا درجہ ہے "نمائش" اب جو کام کر رہا ہے اس سے نہ تو آرام مقصود ہے، نہ آرائش مقصود ہے۔ بلکہ اس کام کا مقصد صرف یہ ہے کہ لوگ مجھے بڑا دولت مند سمجھیں، اور لوگ یہ سمجھیں کہ اس کے پاس بہت پیسہ ہے، اور تاکہ اس کے ذریعہ دوسروں پر اپنی فوقیت جتاؤں، اور اپنے آپ کو بلند ظاہر کروں، یہ سب "نمائش" کے اندر داخل ہے اور یہ شرعاً ناجائز ہے۔ اور اسراف میں داخل ہے۔

فضول خرچی کی حد

یہی چار درجات لباس اور کھانے میں بھی ہیں بلکہ ہر چیز میں ہیں ایک شخص اچھا اور قیمتی کپڑا اس لئے پہنتا ہے تاکہ مجھے آرام ملے اور تاکہ مجھے اچھا لگے، اور میرے گھر والوں کو اچھا لگے، اور میرے ملنے جلنے والے اس کو دیکھ کر خوش ہوں، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اگر کوئی شخص اچھا اور قیمتی لباس اس نیت سے پہنتا ہے، تاکہ مجھے دولت مند سمجھا جائے، مجھے بہت پیسے والا سمجھا جائے، اور میرا بڑا مقام سمجھا جائے تو یہ نمائش ہے اور ممنوع ہے۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسراف کے بارے میں واضح حد فاصل کھینچ دی کہ اگر ضرورت پوری کرنے کے لئے کوئی خرچہ کیا جا رہا ہے۔ یا آسائش کے حصول کے لئے یا اپنے دل کو خوش کرنے کے لئے آرائش کی خاطر کوئی خرچہ کیا جا رہا ہے وہ اسراف میں داخل نہیں۔

یہ اسراف میں داخل نہیں

میں ایک مرتبہ کسی دوسرے شہر میں تھا۔ اور واپس کراچی آنا تھا۔ گرمی کا موسم تھا۔ میں نے

ایک صاحب سے کہا کہ ایئر کنڈیشنڈ کوچ میں میرا ٹکٹ بک کرا دو، اور میں نے ان کو پیسے دے دیئے، ایک دوسرے صاحب پاس بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے فوراً کہا کہ صاحب! یہ تو آپ اسراف کر رہے ہیں، اس لئے کہ ایئر کنڈیشنڈ کوچ میں سفر کرنا تو اسراف میں داخل ہے۔ بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اگر اوپر کے درجے میں سفر کر لیا تو یہ اسراف میں داخل ہے خوب سمجھ لیجیے، اگر اوپر کے درجے میں سفر کرنے کا مقصد راحت حاصل کرنا ہے، مثلاً گرمی کا موسم ہے۔ گرمی برداشت نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ نے پیسے دیئے ہیں تو پھر اس درجے میں سفر کرنا کوئی گناہ اور اسراف نہیں ہے۔ لیکن اگر اوپر کے درجے میں سفر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جب میں ایئر کنڈیشنڈ کوچ میں سفر کروں گا تو لوگ یہ سمجھیں گے کہ یہ بڑا دولت مند آدمی ہے تو پھر وہ اسراف اور ناجائز ہے۔ اور نمائش میں داخل ہے، یہی تفصیل کپڑے اور کھانے میں بھی ہے۔

ہر شخص کی کشادگی کا معیار الگ ہے

لہٰذا شوہر کو چاہیے کہ ان درجات کو مدنظر رکھتے ہوئے بیوی کے نفقہ اور لباس میں کشادگی کے ساتھ خرچ کرے۔ ہر آدمی کی کشادگی الگ الگ ہوتی ہے۔ میرے حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ بیان فرماتے ہوئے کہنے لگے کہ بھائی! ایک آدمی ایسا ہے جس کا نہ کوئی آگا نہ پیچھا، یعنی نہ کوئی اس کا رشتہ دار ہے۔ نہ کوئی عزیز و اقارب ہے، اور نہ کوئی دوست ہے، اگر ایسا شخص اپنے گھر میں ایک بستر ایک رکابی، ایک ڈونگا رکھ لے تو بس! اس کے لئے یہ برتن کافی ہیں اب اگر اور زیادہ برتن جمع کرے گا تو اس کا مقصد سوائے نمائش کے اور کچھ نہ ہوگا۔ اور اسراف ہوگا، لیکن ایک دوسرا آدمی جس کے مہمان آتے ہیں، جس کے تعلقات وسیع ہیں۔ جس کے عزیز و اقارب بہت زیادہ ہیں، اس کی ضرورت اور کشادگی کا معیار اور ہے اب اگر ایسے شخص کے گھر میں بعض اوقات برتنوں کے سو سیٹ بھی ہوں یا سو بستر بھی ہوں تب بھی ان میں سے ایک برتن اور ایک بستر بھی اسراف میں داخل نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ یہ سب اس کی ضرورت میں داخل ہیں، اس لئے فرمایا کہ ہر آدمی کا کشادگی کا معیار الگ ہوتا ہے۔

اس محل میں خدا کو تلاش کرنے والا احمق ہے

بعض اوقات لوگ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے بادشاہ تھے ان کا قصہ سن کر اسی سے استدلال کرتے ہیں، جن کا قصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ نے رات کے وقت

ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ محل کی چھت پر گھوم رہا ہے۔ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو پکڑ کر پوچھا کہ رات کے وقت یہاں محل کی چھت پر کیا کر رہے ہو؟ اس آدمی نے کہا کہ اونٹ تلاش کرنے آیا ہوں، میرا اونٹ گم ہو گیا ہے۔ حضرت ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ارے بے وقوف، کم عقل، رات کے وقت محل کی چھت پر اونٹ تلاش کر رہا ہے۔ تجھے یہاں اونٹ کیسے ملے گا؟ اس آدمی نے حیرت سے پوچھا یہاں اونٹ نہیں مل سکتا؟ حضرت ابراہیم نے فرمایا کہ نہیں، تجھے یہاں محل کی چھت پر اونٹ کیسے ملے گا؟ اس آدمی نے کہا کہ اگر اس محل میں اونٹ نہیں مل سکتا اور اس محل میں اونٹ تلاش کرنے والا احمق ہے۔ تو یہ بھی سمجھ لو کہ تم یہاں رہتے ہوئے خدا کو تلاش کر رہے ہو، تمہیں خدا بھی نہیں مل سکتا، اگر میں احمق ہوں تو مجھ سے زیادہ تم احمق ہو۔ بس! اس وقت حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کے دل پر ایک چوٹ لگی، اور اسی وقت ساری بادشاہت چھوڑ کر جنگل کی طرف روانہ ہو گئے۔ اور روانہ ہوتے وقت سوچا کہ اب تو اللہ کی یاد میں زندگی بسر کرنی ہے۔ اس لئے صرف ایک تکیہ اور ایک پیالہ ساتھ لے لیا تاکہ کھانے پینے کی ضرورت پیش آئے گی تو اس پیالے میں کھا پی لیں گے۔ اور سونے کی ضرورت پیش آئے گی تو زمین پر تکیہ رکھ کر سو جائیں گے، جب کچھ آگے چلے تو دیکھا کہ ایک آدمی دریا کے کنارے بیٹھا ہے اور چلو بنا کر پانی پی رہا ہے آپ نے سوچا کہ یہ پیالہ میں نے اپنے ساتھ فضول لے لیا۔ یہ کام تو ہاتھوں کے ذریعہ بھی ہو سکتا ہے چنانچہ وہ پیالہ پھینک دیا اور آگے روانہ ہو گئے کچھ اور آگے گئے تو دیکھا کہ ایک آدمی سر کے نیچے اپنا ہاتھ رکھ کر سو رہا ہے، پھر سوچا کہ یہ تکیہ بھی میں نے فضول لیا۔ تکیہ تو اللہ تعالیٰ نے خود دے رکھا ہے۔ اس سے کام چلائیں گے چنانچہ وہ تکیہ بھی پھینک دیا۔

غلبہ حال کی کیفیت قابل تقلید نہیں

اس قصہ کی وجہ سے بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ پیالہ رکھنا بھی اسراف ہے۔ اور تکیہ رکھنا بھی اسراف ہے اللہ تعالیٰ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے درجات بلند فرمائے۔ وہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی نکھار کر چلے گئے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اپنے حالات کو حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کے حالات پر قیاس مت کرو، ایک تو اس وجہ سے کہ جو کیفیت حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ پر طاری ہوئی، وہ غلبہ حال کی کیفیت تھی، وہ قابل تقلید کیفیت نہیں تھی۔ اور غلبہ حال کا مطلب یہ ہے کہ کسی وقت طبیعت پر کسی بات کا اتنا غلبہ ہو جاتا ہے کہ آدمی اس حالت میں معذور ہو جاتا ہے، معذور ہونے کی وجہ سے اس کے حالات دوسروں کے لئے قابل تقلید نہیں رہتے۔ اس لئے حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کے یہ حالات ہمارے اور آپ کے لئے قابل تقلید نہیں۔ ورنہ دماغ میں یہ بات جم جائے گی

کہ تکیہ بھی چھوڑ و، اور پیالہ بھی چھوڑ و، اور گھر بار بھی چھوڑ و، بیوی بچے چھوڑ و، اس لئے کہ خدا اس کے بغیر نہیں ملے گا۔ حالانکہ دین کا یہ تقاضا نہیں، بلکہ یہ غلبہ حال کی کیفیت ہے جو حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ پر طاری ہوئی۔

آمدنی کے مطابق کشادگی ہونی چاہیے

دوسرے یہ کہ ہر آدمی کی ضرورت اس کے حالات کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہیں، لہٰذا کشادگی کا معیار بھی ہر انسان کا الگ ہے۔ اب جو شخص کم آمدنی والا ہے۔ اس کی کشادگی کا معیار اور ہے، اور جو متوسط آمدنی والا ہے۔ اس کا معیار اور ہے، اور جو زیادہ آمدنی والا ہے اس کی کشادگی کا معیار اور ہے اس لئے ہر شخص کی آمدنی کے معیار کے اعتبار سے کشادگی ہونی چاہیے، یہ نہ ہو کہ شوہر بیچارے کی آمدنی تو کم ہے۔ اور ادھر بیوی صاحبہ نے دولت مند قسم کے لوگوں کے گھر میں جو چیزیں دیکھیں، ان کی نقل اتارنے کی فکر لگ گئی، اور شوہر سے اس کی فرمائش ہونے لگی۔ اس قسم کی فرمائشوں کا تو کوئی جواز نہیں۔ لیکن شوہر کو چاہیے کہ اپنی آمدنی کو مدنظر رکھتے ہوئے کشادگی سے کام لے۔ اور اپنی بیوی کے حق میں بخل اور کنجوسی سے کام نہ لے۔

بیویوں کا ہم پر کیا حق ہے؟

((عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنَ حَيْدَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا حَقُّ زَوْجَةِ اَحَدِنَا عَلَيْهِ؟ قَالَ: ((اَنْ تُطْعِمَهَا اِذَا طَعِمْتَ وَتَكْسُوَهَا اِذَا اكْتَسَيْتَ أَوِ اكْتَسَبْتَ وَلَا تَضْرِبِ الْوَجْهَ وَلَا تُقَبِّحْ، وَلَا تَهْجُرْ اِلَّا فِي الْبَيْتِ))(۱)

حضرت معاویہ بن حیدۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! ہم لوگوں کی بیویوں کا ہم پر کیا حق ہے؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم کھاؤ تو اس کو بھی کھلاؤ، اور جب تم پہنو تو اس کو بھی پہناؤ، اور یہ کہ چہرے پر نہ مارو، اور برا بھلا مت کہو۔

"تقبح" کے معنی ہیں طعنے دینا۔ برا بھلا کہنا۔ اور اس سے دل آزاری کی باتیں کرنا۔

اس کا بستر چھوڑ دو

جیسا کہ پیچھے بیان کیا گیا کہ اگر تم عورت کے اندر کوئی بے حیائی کی بات دیکھو تو پہلے اس کو

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب النكاح، باب في حق المرأة على زوجها، رقم: ۱۸۳۰، سنن ابن ماجه، كتاب النكاح، باب حق المرأة على الزوج، رقم: ۱۸٤۰

سمجھاؤ، اگر سمجھانے سے باز نہ آئے تو اس کا بستر چھوڑ دو۔ اور الگ بستر پر سونا شروع کر دو، اس حدیث میں بستر چھوڑنے کی تفصیل یہ بیان فرمادی کہ بستر چھوڑنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم گھر سے باہر چلے جاؤ۔ بلکہ گھر کے اندر ہی رہو۔ البتہ احتجاج کے طور پر تادیبی طور پر، اور ایک نفسیاتی مار کے طور پر کمرہ بدل دو، یا بستر بدل دو، اور اس سے علیحدگی اختیار کرلو۔

علیحدگی کی ناجائز صورت

علماء نے اس حدیث کے یہ معنی بھی بیان فرمائے ہیں کہ ایسے موقع پر اگرچہ بستر تو الگ کر دو، لیکن بالکلیہ بات چیت ختم نہ کرو، اور ایسی علیحدگی نہ ہو کہ ایک دوسرے کو سلام بھی نہ کیا جائے۔ اور سلام کا جواب بھی نہ دیا جائے اور کوئی ضروری بات کرنی ہو تو اس کا جواب بھی نہ دیا جائے۔ اس طرح کی علیحدگی جائز نہیں ہے۔

چار ماہ سے زیادہ سفر میں بیوی کی اجازت

اس حدیث کے تحت فقہاء کرام نے یہاں تک لکھا ہے کہ مرد کے لئے چار مہینہ سے زیادہ گھر سے باہر رہنا بیوی کی اجازت اور اس کی خوش دلی کے بغیر جائز نہیں، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی تمام قلم رو میں یہ حکم جاری فرمادیا تھا کہ جو مجاہدین گھر سے باہر رہتے ہیں، وہ چار ماہ سے زیادہ گھر سے باہر نہ رہیں اور اسی وجہ سے فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر کسی شخص کو چار ماہ سے کم کا سفر درپیش ہو تو اس کے لئے بیوی کی اجازت کی ضرورت نہیں، لیکن اگر چار ماہ سے زیادہ کا سفر درپیش ہو تو اس کے لئے بیوی سے اجازت لینی ضروری ہے۔ چاہے وہ سفر کتنا ہی بابرکت کیوں نہ ہو، حتیٰ کہ اگر حج کا سفر ہو تو اس میں بھی اگر وہ چار ماہ کے اندر واپس آسکتا ہے، تو پھر اجازت کی ضرورت نہیں، اگر نفلی طور پر وہاں زیادہ قیام کا ارادہ ہے تو پھر اجازت لینی ضروری ہے، یہی حکم تبلیغ، دعوت اور جہاد کے سفر کا ہے۔ لہٰذا جب ان مبارک سفروں میں بیوی کی اجازت ضروری ہے تو پھر جو لوگ ملازمت کے لئے پیسہ کمانے کے لئے لمبے سفر کرتے ہیں ان میں تو بطریق اولیٰ بیوی کی اجازت ضروری ہے، اگر بیوی کی اجازت کے بغیر جائیں گے تو یہ بیوی کی حق تلفی ہوگی اور شرعاً ناجائز ہوگا اور ایسا کرنے سے گناہ گار ہوں گے۔

بہترین لوگ کون ہیں؟

اگلی حدیث میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

((وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا وَخِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَائِهِ))(۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تمام مومنوں میں ایمان کے اعتبار سے سب سے زیادہ کامل وہ شخص ہے۔ جو اخلاق کے اعتبار سے ان میں سب سے اچھا ہو۔ جو شخص جتنا زیادہ خوش اخلاق ہوگا، وہ اتنا ہی کامل ایمان والا ہوگا۔ اس لئے کامل ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ انسان دوسروں کے ساتھ حسن اخلاق کا معاملہ کرے، اور تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جو اپنی بیویوں اور اپنی عورتوں کے لئے بہتر ہوں، ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے والے ہوں۔

آج کے دور میں ''خوش اخلاقی''

آج کل ہر چیز کے معنی بدل گئے ہر چیز کا مفہوم الٹ گیا، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ پہلے زمانہ کے مقابلہ میں اب اس دور میں ہر چیز الٹی ہوگئی، یہاں تک پہلے چراغ تلے اندھیرا ہوتا تھا، اور اب بلب کے اوپر اندھیرا ہوتا ہے، پھر فرماتے کہ آج کل ہر چیز کی قدریں بدل گئیں ہر چیز کا مفہوم الٹ گیا۔ حتیٰ کہ اخلاق کا مفہوم بھی بدل گیا آج صرف چند ظاہری حرکات کا نام اخلاق ہے مثلاً مسکرا کر مل لئے، اور ملاقات کے وقت رسمی الفاظ زبان سے ادا کر دیئے۔ مثلاً یہ کہہ دیا کہ ''آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی'' یا ''آپ سے مل کر بڑا اچھا معلوم ہوا'' وغیرہ۔ اب زبان سے تو یہ الفاظ ادا کر رہے ہیں، لیکن دل کے اندر عداوت اور حسد کی آگ سلگ رہی ہے، دل کے اندر نفرت کروٹیں لے رہی ہے بس آج اسی کا نام خوش اخلاقی ہے۔ اور آج باقاعدہ یہ ایک فن بن گیا ہے کہ دوسروں کے ساتھ کس طرح پیش آیا جائے تاکہ دوسرے لوگ ہمارے گرویدہ ہو جائیں اور باقاعدہ اس پر کتابیں لکھی جارہی ہیں کہ دوسرے کو گرویدہ بنانے کے لئے اور دوسرے کو متاثر کرنے کے لئے کیا طریقے اختیار کیے جائیں؟ لہٰذا سارا زور اس پر صرف ہو رہا ہے کہ دوسرا گرویدہ ہو جائے دوسرا ہم سے متاثر ہو جائے اور ہم کو اچھا سمجھنے لگے۔ آج اسی کا نام ''اخلاق'' رکھا جاتا ہے۔

خوب سمجھ لیجیے اس کا اس اخلاق سے کوئی تعلق نہیں جس کا ذکر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں۔ یہ اخلاق نہیں، بلکہ ریاکاری اور دکھاوا ہے اور یہ نمائش ہے اور یہ دوسرے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانے اور اپنے گرد اکٹھا کرنے کا بہانہ ہے، یہ حب جاہ ہے، یہ حب شہرت ہے، جو بذات خود بیماری

(۱) سنن الترمذی، کتاب الرضاع، باب ماجاء فی حق المرأة علی زوجها، رقم: ۱۰۸۳، مسند أحمد، رقم: ۷۰۹۵

اور بداخلاقی ہیں، حسن اخلاق سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

''حسن اخلاق'' دل کی کیفیت کا نام ہے

حقیقت میں اخلاق دل کی ایک کیفیت کا نام ہے جس کا مظاہرہ اعضاء اور جوارح سے ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ دل میں ساری مخلوق خدا کی خیرخواہی ہو۔ اور ان سے محبت ہو، خواہ دشمن اور کافر ہی کیوں نہ ہو، اور یہ سوچ کر کہ یہ میرے مالک کی مخلوق ہے لہٰذا مجھے اس سے محبت رکھنی چاہیے، اس کے ساتھ مجھے اچھا سلوک کرنا چاہیے، اولاً دل میں یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے اور پھر اس جذبے کے تحت اعمال صادر ہوتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ خیرخواہی کرتا ہے اب اس جذبہ کے بعد چہرے پر جو مسکراہٹ اور تبسم آتا ہے وہ بناوٹی نہیں ہوتا اور وہ دوسروں کو اپنا گرویدہ کرنے کے لئے نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی دلی خواہش اور دلی جذبے کا ایک لازمی اور منطقی تقاضا ہوتا ہے۔ لہٰذا حضور اقدس ﷺ کے بیان کردہ اخلاق میں اور آج کے اخلاق میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

اخلاق پیدا کرنے کا طریقہ

ان اخلاق کو حاصل کرنے کے لئے محض کتاب پڑھ لینا کافی نہیں ہے، نہ محض وعظ سن لینا کافی ہوتا ہے۔ اس کے لئے کسی مربی اور کسی مصلح کی صحبت میں رہنے کی ضرورت ہوتی ہے تصوف اور پیری مریدی کا جو سلسلہ بزرگوں سے چلا آرہا ہے اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان کے اندر اخلاق فاضلہ پیدا ہوں اور برے اخلاق دور ہوں۔ بہرحال ایمان میں کامل ترین افراد وہ ہیں جن کے اخلاق اچھے ہوں، جن کے دل میں صحیح داعیے پیدا ہوتے ہوں اور ان صحیح داعیوں کا اظہار ان کے اعمال و افعال سے ہوتا ہو۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو ان کاملین میں داخل فرما دیں۔ آمین

اللہ کی بندیوں کو نہ مارو

وَعَنْ اِيَاسِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِیْ ذُبَابٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((لَا تَضْرِبُوْا اِمَاءَ اللّٰهِ)) فَجَاءَ عُمَرُ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: ذَئِرْنَ النِّسَآءُ عَلٰى اَزْوَاجِهِنَّ. الخ(۱)

(۱) سنن أبی داؤد، کتاب النکاح، باب فی ضرب النساء، رقم: ۱۸۳٤، سنن ابن ماجه، کتاب النکاح، باب ضرب النساء، رقم: ۱۹۷۵

حضرت ایاس بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ کی بندیوں کو مارو نہیں، یعنی عورتوں کو مارنا اچھی بات نہیں ہے، مت مارا کرو اور جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے روک دیا کہ یہ کام مت کرو تو جس شخص نے براہ راست حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سن لیا، اس کے لئے وہ کام حرام قطعی ہو گیا، اب اس کے لئے کسی بھی حالت میں مارنا جائز نہیں۔

یہ بات سمجھ لیجیے کہ ایک تو وہ حدیث ہے، جو ہم اور آپ کتاب میں پڑھتے ہیں۔ یا سنتے ہیں، اور جو لمبی سند کے ساتھ ہم تک پہنچتی ہے حدثنا فلان قال حدثنا فلان قال حدثنا فلان ۔ایسی حدیث ظنی کہلاتی ہے، اس لئے کہ ظنی طریقوں سے ہم تک پہنچتی ہے، لہٰذا اس حدیث پر عمل کرنا واجب ہے اگر عمل نہیں کرے گا تو گناہ گار ہو گا لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جو بات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست سن لی، وہ حدیث ظنی نہیں ہے، بلکہ قطعی ہے، لہٰذا اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کرے گا تو صرف گناہ گار نہیں ہو گا، بلکہ کافر ہو جائے گا، اس لئے کہ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا انکار کر دیا، لہٰذا فوراً کافر ہو گیا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی اس لائق تھے

کبھی کبھی ہمارے دلوں میں یہ احمقانہ خیال آتا ہے کہ کاش! ہم بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیدا ہوئے ہوتے، اور اس زمانے کی برکات حاصل کرتے۔ ارے یہ تو اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے اور وہی اپنی حکمت سے فیصلہ فرماتے ہیں اور اپنی حکمت سے ہمیں اس دور میں پیدا فرمایا، اگر ہم اس دور میں پیدا ہو جاتے تو خدا جانے کس اسفل السافلین میں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ بچائے۔ اس لئے کہ وہاں ایمان کا معاملہ اتنا نازک تھا کہ ذرا سی دیر میں انسان ادھر سے ادھر ہو جاتا تھا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جس جانثاری کا معاملہ فرمایا وہ انہیں کا ظرف تھا۔ اور اسی کے نتیجے میں وہ اس درجے تک پہنچے، اگر ہم جیسا آرام پسند اور عافیت پسند آدمی اس دور میں ہوتا تو خدا جانے کیا حشر بنتا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل و کرم ہے کہ اس نے ہمیں اس انجام سے بچایا۔ اور ایسے دور میں پیدا فرمایا جس میں ہمارے لئے بہت سی آسانیاں ہیں۔ آج ایک حدیث کے بارے میں ہم یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ حدیث ظنی ہے۔ اور ظنی ہونے کی وجہ سے اگر کوئی انکار کر دے گا تو کافر نہ ہو گا۔ صرف گناہ گار ہی ہو گا۔ لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معاملہ تو یہ تھا کہ اگر کوئی شخص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کوئی حکم سننے کے بعد انکار کر دے کہ میں نہیں کرتا، فوراً کافر ہو جاتا۔

یہ عورتیں شیر ہو گئیں ہیں

لہٰذا جب حضور اقدس ﷺ نے یہ فرمایا کہ عورتوں کو نہ مارو، تو اب مارنے کا سلسلہ بالکل بند ہو گیا۔ اس لئے کہ صحابہ کرام تو ایسے نہیں تھے کہ حضور اقدس ﷺ سے کسی کام کے بارے میں ممانعت سنیں، اور پھر بھی وہ کام جاری رکھیں۔ جب مارنے کا سلسلہ بالکل بند ہو گیا تو کچھ دنوں کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

"ذَئِرْنَ النِّسَآءُ عَلٰى اَزْوَاجِهِنَّ"

یا رسول اللہ! یہ عورتیں تو اب اپنے شوہروں پر شیر ہو گئیں، اس لئے کہ آپ نے مارنے کی ممانعت کر دی۔ جس کے بعد اب کوئی شخص اپنی بیوی کو نہیں مارتا۔ بلکہ مار کے قریب جانے سے بھی ڈرتا ہے۔ اور اس نہ مارنے کے نتیجے میں عورتیں شیر ہو گئیں ہیں۔ اور شوہروں کی حق تلفیاں کرنے لگی ہیں۔ اور ان کے ساتھ بدسلوکی کرنے لگی ہیں۔ اب آپ فرمائیں کہ ان حالات میں ہم کیا کریں؟

"فَرَخَّصَ فِيْ ضَرْبِهِنَّ"

چنانچہ حضور اقدس ﷺ نے اجازت دے دی کہ اگر عورتیں شوہروں کی حق تلفی کریں۔ اور مارنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو تو تمہیں مارنے کی بھی اجازت ہے۔ اب اس اجازت دینے کے نتیجے میں یہ ہوا کہ ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں بہت سی خواتین آنی شروع ہو گئیں۔ اور آکر عرض کرتیں کہ یا رسول اللہ! آپ نے شوہروں کو مارنے کی اجازت دے دی۔ جس سے لوگوں نے غلط فائدہ اٹھایا اور ہمیں اس طرح مارا۔

یہ اچھے لوگ نہیں ہیں

فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((لَقَدْ اَطَافَ بِآلِ بَيْتِ مُحَمَّدٍ نِسَآءٌ كَثِيْرٌ يَشْكُوْنَ اَزْوَاجَهُنَّ لَيْسَ اُولٰئِكَ بِخِيَارِكُمْ))

"آپ نے اپنا نام لے کر فرمایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھر میں بہت سی خواتین چکر لگاتی ہیں۔ اور وہ اپنے شوہروں کی شکایت کرتی ہیں کہ وہ شوہر ان کے ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں۔ ان کو بری طرح مارتے ہیں۔ لہٰذا خوب اچھی طرح سن لو کہ جو لوگ یہ مار پیٹ کر رہے ہیں وہ تم میں اچھے لوگ نہیں ہیں"

اچھے مومن اور مسلمان کا کام نہیں ہے کہ وہ مار پیٹ کرے، اس سارے مجموعے سے

آنحضرت ﷺ نے یہ بات واضح فرمادی کہ اگرچہ ناگزیر حالت میں، جب کوئی اور چارہ نہ رہے اس وقت شریعت کی طرف سے ایسی مار کی اجازت ہے جس سے نشان نہ پڑے، اور بہت زیادہ تکلیف نہ ہو، لیکن اس کے باوجود محمد رسول اللہ ﷺ کی سنت اور آپ کی اصل خواہش یہ ہے کہ کوئی مرد کسی عورت پر کبھی ہاتھ نہ اٹھائے۔ چنانچہ امہات المومنین رضی اللہ عنہن فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ساری عمر کبھی کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھایا، لہٰذا سنت کا تقاضا بھی یہی ہے۔

دنیا کی بہترین چیز ''نیک عورت''

وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ((اَلدُّنْيَا مَتَاعٌ وَخَيْرُ مَتَاعِهَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ))(۱)

''حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ یہ دنیا ساری کی ساری لطف اندوزی کی چیز ہے''

یعنی ایسی چیز ہے جس سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے۔ نفع اٹھاتا ہے۔ اور لطف اٹھاتا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا انسان کے نفع کے لئے پیدا فرمائی ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا﴾(۲)

اللہ وہ ذات ہے جس نے تمہارے فائدے کے لئے پیدا کیا جو کچھ زمین میں ہے۔ اور تمہارے نفع کے لئے، اور تمہارے لطف اٹھانے کے لئے اور تمہاری ضرورت پوری کرنے کے لئے پیدا کیا۔ اور دنیا کی بہترین متاع جس سے انسان نفع اٹھائے۔ وہ نیک اور صالح عورت ہے۔ ایک دوسری حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((حُبِّبَ اِلَیَّ مِنْ دُنْیَاكُمُ النِّسَاءُ وَالطِّیْبُ وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَیْنِیْ فِی الصَّلَاةِ))(۳)

مجھے تمہاری دنیا میں سے تین چیزیں بہت زیادہ محبوب ہیں۔ کتنا خوبصورت جملہ ارشاد فرمایا کہ ''تمہاری دنیا'' میں سے، یہ اس لئے فرمایا کہ آپ ﷺ دوسری جگہ پر یہ ارشاد فرما چکے تھے کہ:

(۱) صحیح مسلم، کتاب الرضاع، باب خیر متاع الدنیا المرأة الصالحة رقم: ۲٦٦٨، سنن النسائی، کتاب النکاح، باب المرأة الصالحة، رقم: ۳۱۸۰، مسند أحمد، رقم: ٦۲۷۹

(۲) البقرہ: ۲۹

(۳) سنن البیهقی الکبری، رقم: ۱۳۲۳۲ (۷۸/۷)، زادالمعاد (۳۰۷/٤)، نیل الأوطار (۳۳۰/۱) کشف الخفاء (۳٤۰/۱)، کنز العمال، رقم: ۱۸۹۱۳، (۲۸۷/۷)

((مَا لِيْ وَمَا لِلدُّنْيَا مَا أَنَا فِي الدُّنْيَا إِلَّا كَرَاكِبٍ اِسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ، ثُمَّ رَاحَ وَتَرَكَهَا))(۱)

''میرا دنیا سے کیا تعلق! میں تو اک ایسے سوار کی طرح ہوں جو کسی درخت کے سائے میں ذرا سی دیر کے لئے ٹھہرتا ہے۔ اور پھر چلا جاتا ہے۔ اور اس درخت کو چھوڑ دیتا ہے''

اس لئے آپ نے فرمایا کہ تمہاری دنیا میں سے تین چیزیں مجھے بہت زیادہ محبوب اور پسند ہیں۔ وہ کیا ہیں؟ ایک عورت دوسری خوشبو، اور تیسری ٹھنڈا پانی، اس لئے دنیا کی ساری نعمتوں میں سے یہ تین چیزیں اول درجے کی نعمتیں ہیں۔

ٹھنڈا پانی عظیم نعمت ہے

چنانچہ احادیث میں کہیں یہ ثابت نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ساری زندگی میں کبھی کسی خاص کھانے کا اہتمام فرمایا ہو نہ کبھی یہ ثابت ہے کہ آپ نے کسی کھانے کی فرمائش کی ہو کہ فلاں کھانا پکالو۔ بلکہ جو کچھ آپ کے سامنے آیا، آپ نے تناول فرما لیا۔ لیکن ٹھنڈے پانی کا اتنا اہتمام تھا کہ پینے کے لئے ٹھنڈا پانی آپ کے لئے بئر غرس سے لایا جاتا تھا۔ جو مسجد نبوی سے تقریباً دو یا اڑھائی میل دور تھا۔ اس لئے کہ اس کا پانی ٹھنڈا اور میٹھا ہوتا تھا۔ اور اسی لئے آپ نے وصیت فرمائی تھی کہ انتقال کے بعد مجھے اسی کنویں کے پانی سے غسل دیا جائے۔ (۲)

ٹھنڈا پانی پیا کرو

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مکی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی ایک حکمت بیان فرمائی۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کہ میاں اشرف علی! جب کبھی پانی پیو تو خوب ٹھنڈا پیو، تاکہ رگ رگ سے شکر نکلے، اس لئے کہ جب ٹھنڈا پانی پیئے گا تو رگ رگ سیراب ہوگی، تو پھر رگ رگ سے ''الحمدللہ'' نکلے گا اور بے ساختہ رگ رگ سے شکر ادا ہوگا۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول الله، باب ماجاء فی أخذ المال بحقه، رقم: ۲۲۹۹، مسند أحمد، رقم: ۲۶۰۸

(۲) سبل الهدی والرشاد فی سیرة خیر العباد(۷/۲۲۱)، طبقات ابن سعد (۱/۲/۱۸۵)

بری عورت سے پناہ مانگو

بہر حال تین پسندیدہ چیزوں میں سے ایک نیک عورت ہے، اس لئے کہ اگر عورت نیک نہ ہو تو اس سے حضور اقدس ﷺ نے پناہ مانگی:

((اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ عَنِ امْرَأَةٍ تُشَيِّبُنِیْ قَبْلَ الْمَشِيْبِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ وَلَدٍ يَّكُوْنَ عَلَیَّ وَبَالًا))(۱)

اے اللہ! میں اس عورت سے پناہ مانگتا ہوں جو مجھے بڑھاپے سے پہلے بوڑھا کر دے، اور اس اولاد سے پناہ مانگتا ہوں جو میرے لئے وبال ہو جائے۔ اس لئے جب اپنے لئے یا اپنی اولاد کے لئے تلاش کرو تو ایسی عورت تلاش کرو جس میں دین ہو۔ صلاح ہو۔ نیکی ہو۔ اگر خدا نہ کرے نیکی نہیں ہے۔ تو وہ عذاب بننے کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا اگر کسی شخص کو صالح بیوی کی نعمت میسر آئی ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ اس کی قدر کرے۔ اس کی ناقدری نہ کرے۔ اور اس کی قدر یہی ہے کہ اس کے حقوق ادا کرے اور اس کے ساتھ حسن سلوک کرے۔

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان ارشادات پر ہمیں عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

☆☆☆

(۱) المعجم الأوسط، رقم: ٦٣٥٩ (٤٣٦/١٣)، مجمع الزوائد ومنبع الفوائد (٥٨/١١)، رقم: ١٧٤٢٩، الزهد لهنادبن السرى، رقم: ١٠٣٣ (١١٧/٣)

شوہر کے حقوق، شریعت اسلامیہ کی روشنی میں ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ﴾(۱)

پچھلا باب ان حقوق کے بیان میں تھا جو ایک بیوی کے اس کے شوہر کے ذمے عائد ہوتے ہیں۔ اس میں یہ ہدایات دی گئیں تھیں کہ ایک شوہر کو اپنی بیوی کے ساتھ کس قسم کا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے۔ لیکن شریعت، جو درحقیقت اللہ تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا قانون ہے، وہ صرف ایک پہلو کو مدنظر رکھنے والا نہیں ہوتا، بلکہ اس میں دونوں جانبوں کی برابر رعایت ہوتی ہے، اور دونوں کے لیے دنیا و آخرت کی صلاح وفلاح کی ضمانت ہوتی ہے، چنانچہ جس طرح شوہر کے ذمے بیوی کے حقوق عائد کیے گئے۔ اسی طرح اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے عورت کے ذمے شوہر کے حقوق بھی بیان فرمائے۔ اور قرآن و حدیث میں ان دونوں قسموں کے حقوق کی ادائیگی پر بڑا زور اور بڑی تاکید کی گئی ہے۔

آج ہر شخص اپنا حق مانگ رہا ہے

شریعت میں ہر شخص کو اس بات کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنے فرائض ادا کرے، حقوق کے مطالبے پر زور نہیں دیا گیا ہے۔ آج کی دنیا، حقوق کے مطالبے کی دنیا ہے۔ ہر شخص اپنا حق مانگ رہا ہے۔ اور اس کے لیے مطالبہ کر رہا ہے، تحریکیں چلا رہا ہے، مظاہرے کر رہا ہے، ہڑتال کر رہا ہے، گویا کہ اپنا حق مانگنے اور اپنے حق کا مطالبہ کرنے کے لیے دنیا بھر میں کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اور اس

☆ اصلاحی خطبات (۳/ ۱۱۶تا۱۲۷) جامع مسجد بیت المکرم، کراچی، بعد از نماز عصر۔ زیر نظر بیان امام نووی رحمہ اللہ کی کتاب ''ریاض الصالحین'' کے باب نمبر ۳۱ ''باب حق الزوج علی المرأۃ'' (صفحہ ۱۲۵ تا ۱۲۷) کا درس ہے۔

(۱) النسآء: ۳۴

کے لیے باقاعدہ انجمنیں قائم کی جارہی ہیں۔ جن کا نام ''انجمن تحفظ حقوق فلاں'' رکھا جاتا ہے، لیکن آج ''ادائیگی فرائض'' کے لیے کوئی انجمن موجود نہیں، کسی بھی شخص کو اس بات کی فکر نہیں ہے کہ جو فرائض میرے ذمے عائد ہیں۔ وہ ادا کر رہا ہوں یا نہیں؟ مزدور کہتا ہے کہ مجھے میرا حق ملنا چاہئے۔ سرمایہ دار کہتا ہے کہ مجھے میرا حق ملنا چاہئے۔ لیکن دونوں میں سے کسی کو یہ فکر نہیں ہے کہ میں اپنا فریضہ کیسے ادا کروں؟ مرد کہتا ہے کہ مجھے میرے حقوق ملنے چاہئیں۔ اور عورت کہتی ہے کہ مجھے میرے حقوق ملنے چاہئیں۔ اس کے لیے کوشش اور جدوجہد جاری ہے۔ لڑائی ٹھنی ہوئی ہے۔ جنگ جاری ہے۔ لیکن کوئی خدا کا بندہ یہ نہیں سوچتا کہ جو فرائض میرے ذمے عائد ہو رہے ہیں، وہ میں ادا کر رہا ہوں، یا نہیں؟

ہر شخص اپنے فرائض ادا کرے

اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے فرائض کی ادائیگی کی طرف توجہ کرے۔ اگر ہر شخص اپنے فرائض ادا کرنے لگے تو سب کے حقوق ادا ہو جائیں۔ اگر مزدور اپنے فرائض ادا کر دے تو سرمایہ دار اور مالک کے حقوق ادا ہو گئے، اگر سرمایہ دار اور آجر اپنے فرائض ادا کر دے تو مزدور کے حقوق ادا ہو گئے۔ شوہر اگر اپنے فرائض ادا کرے تو بیوی کا حق ادا ہو گیا۔ اور اگر بیوی اپنے فرائض ادا کرے تو شوہر کا حق ادا ہو گیا۔ شریعت کا اصل مطالبہ یہی ہے کہ تم اپنے فرائض ادا کرنے کی فکر کرو۔

پہلے اپنی فکر کرو

آج ہمارے زمانے میں عجیب الٹی گنگا بہنی شروع ہو گئی ہے۔ جب کوئی شخص اصلاح کا جھنڈا اٹھاتا ہے، تو اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ دوسرا شخص اپنی اصلاح کا آغاز کرے، اپنی فکر نہیں کہ میرے اندر بھی کچھ کوتاہی ہے۔ میں بھی غلطی کا شکار ہوں۔ میں اس کی فکر کروں۔ حالانکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾ (۱)

اے ایمان والو! اپنے آپ کی فکر کرو کہ تمہارے ذمے کیا فرائض ہیں؟ اللہ اور اللہ کے رسول کے تم سے کیا مطالبات ہیں؟ شریعت، دیانت، امانت اور اخلاق کے تم سے کیا مطالبات ہیں، ان مطالبات کو بجا لاؤ، دوسرا شخص اگر گمراہی میں مبتلا ہے، اور اپنے فرائض انجام نہیں دے رہا تو اس

(۱) المائدة: ۱۰۵

کا نقصان تمہارے اوپر نہیں ہوگا بشرطیکہ تم اپنے فرائض صحیح طریقے سے انجام دے رہے ہو۔

حضور ﷺ کی تعلیم کا انداز

حضور اقدس ﷺ کی تعلیم کی بات دیکھئے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے عامل جایا کرتے تھے، جو لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرتے تھے، اور اس زمانے میں زیادہ تر مال مویشیوں یعنی اونٹ، بکریاں، گائے وغیرہ کی شکل میں ہوتا تھا۔ آنحضرت ﷺ جب عاملوں کو بھیجتے تو ان کو ایک ہدایت نامہ عطا فرماتے کہ تمہیں وہاں جا کر کیا طریقہ اختیار کرنا ہے؟ اس ہدایت نامے میں یہ بھی تحریر فرماتے:

((لَا جَلَبَ وَلَا جَنَبَ فِيْ زَكَاةٍ، وَلَا تُؤْخَذُ صَدَقَاتُهُمْ إِلَّا فِيْ دُوْرِهِمْ))(۱)

یعنی تم خود لوگوں کے گھروں پر جا کر زکوٰۃ وصول کرنا۔ ایسا مت کرنا کہ تم ایک جگہ پر بیٹھ جاؤ اور لوگوں کو اس بات کی تکلیف دو کہ وہ زکوٰۃ کا مال تمہارے پاس لا کر دیں، اور یہ بھی ہدایت فرماتے:

((اَلْمُتَعَدِّيْ فِي الصَّدَقَةِ كَمَانِعِهَا))(۲)

یعنی جو شخص زکوٰۃ وصول کرنے میں زیادتی کر رہا ہے، مثلاً جتنی زکوٰۃ واجب تھی، مقدار میں اس سے زیادہ وصول کر رہا ہے، یا کیفیت میں زیادہ وصول کر رہا ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا کہ ایسا شخص بھی اتنا ہی گنہگار ہے۔ جتنا زکوٰۃ نہ دینے والا گنہگار ہے۔ لہٰذا ایک طرف عاملوں کو تو یہ تاکید کی جا رہی ہے کہ تم لوگوں کو تکلیف نہ پہنچاؤ۔ اور جتنی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اس سے ایک ذرہ بھی زیادہ وصول نہ کرو، اگر ایسا کرو گے تو قیامت کے دن تمہاری پکڑ ہوگی۔ دوسری طرف جن لوگوں کے پاس زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے ان عاملوں کو بھیجا جا رہا تھا۔ ان سے خطاب کر کے فرمایا:

((اِذَا جَاءَ كُمُ الْمُصَدِّقُ فَلَا يُفَارِقَنَّكُمْ اِلَّا عَنْ رِضًى))(۳)

---

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب الزكاة، باب أين تصدق الأموال، رقم: ١٣٥٧، مسند أحمد، رقم: ٦٧٢٨

(۲) سنن الترمذي، كتاب الزكاة عن رسول الله، باب ماجاء في المتعدي في الصدقة، رقم: ٥٨٥، سنن أبي داؤد، كتاب الزكاة، باب في زكاة السائمة، رقم: ١٣٥٢، سنن ابن ماجه، كتاب الزكاة، باب ماجاء في عمال الصدقة، رقم: ١٧٩٨

(۳) سنن الترمذي، كتاب الزكاة عن رسول الله، باب ماجاء في رضاالمصدق، رقم: ٥٨٦، مسند أحمد، رقم: ١٨٤٣٤، سنن الدارمي، كتاب الزكاة، باب ليرجع المصدق عنكم وهو راض، رقم: ١٦١٠

یعنی تمہارے پاس زکوٰۃ وصول کرنے والے آئیں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تم سے ناراض ہو کر جائیں۔ تمہارا فرض ہے کہ تم ان کو راضی کرو، اور کوئی ایسی غلطی نہ کرو جس سے وہ ناراض ہو جائیں۔ کیونکہ درحقیقت وہ میرے فرستادہ اور میرے نمائندے ہیں، اور ان کو ناراض کرنا گویا مجھے ناراض کرنا ہے۔ لہٰذا عاملین کو یہ تاکید فرمائی کہ تم کسی کے ساتھ زیادتی نہ کرو۔ اور زکوٰۃ دینے والوں کو یہ تاکید فرمائی کہ جب عاملین تمہارے پاس آئیں تو وہ تم سے راضی ہو کر جائیں۔ ہر ایک کو اپنے اپنے فرائض کی ادائیگی کا احساس دلایا جا رہا ہے۔ آپ نے زکوٰۃ دینے والوں کو یہ نہیں فرمایا کہ تم سب مل کر ایک تحریک چلاؤ کہ یہ جو عاملین زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے آ رہے ہیں۔ وہ ہمارے حقوق پامال نہ کریں۔ اس کے لیے انجمن قائم کرو۔ اس لیے کہ یہ ایک لڑائی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

شریعت میں سارا زور اس بات پر ہے کہ ہر شخص اپنے فرائض کی نگہداشت کرے، فرائض کو بجا لانے کی فکر کرے، اللہ تعالیٰ کے سامنے ایک ایک عمل کا جواب دینا ہے۔ اس کی فکر کرے کہ میں اللہ کے سامنے ٹھیک ٹھیک جواب دے سکوں گا یا نہیں؟ دین کا سارا فلسفہ یہ ہے، یہ نہیں ہے کہ ہر شخص دوسروں سے اپنے حقوق کا مطالبہ کرتا رہے۔ اور اپنے فرائض کی ادائیگی سے غافل رہے۔

زندگی استوار کرنے کا طریقہ

میاں بیوی کے باہمی تعلقات میں بھی اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے یہی طریقہ اختیار کیا کہ دونوں کو ان کے فرائض بتا دیئے۔ شوہر کو بتا دیا کہ تمہارے فرائض یہ ہیں، اور بیوی کو بتا دیا کہ تمہارے فرائض یہ ہیں۔ ہر ایک اپنے فرائض ادا کرنے کی فکر کرے۔ اور درحقیقت زندگی کی گاڑی اسی طرح چلتی ہے کہ دونوں اپنے فرائض کا احساس کریں، اور دوسرے کے حقوق کا پاس کریں۔ اپنے حقوق حاصل کرنے کی اتنی فکر نہ ہو۔ جتنی دوسرے کے حقوق کی ادائیگی کی فکر ہو۔ اگر یہ جذبہ پیدا ہو جائے تو پھر یہ زندگی استوار ہو جاتی ہے، اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کو ہماری زندگی کے استوار کرنے کی اتنی زیادہ فکر ہے کہ قرآن وحدیث ان ہدایات سے بھرے ہوئے ہیں کہ تمہارے فرائض یہ ہیں، اور تمہارے فرائض یہ ہیں۔ اور اگر ان فرائض اور تعلقات میں رخنہ پڑ جائے تو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کو اس دنیا میں کوئی بات اتنی ناپسند نہیں جتنے میاں بیوی کے باہمی جھگڑے ناپسند ہیں۔

ابلیس کا دربار

ایک حدیث میں آتا ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ابلیس کبھی کبھی سمندر میں پانی کے

اوپر اپنا تخت بچھاتا ہے، اور اپنا دربار منعقد کرتا ہے، اس وقت دنیا میں اس کے جتنے چیلے ہیں۔ جو اس کی اسکیموں پر اور اس کی ہدایات پر عمل کر رہے ہیں۔ وہ سب اس دربار میں حاضر ہوتے ہیں۔ اور ان تمام چیلوں سے ان کی کارکردگی کی رپورٹیں طلب کی جاتی ہیں کہ تم نے کیا فرائض انجام دیئے؟ اس وقت ہر ایک چیلا اپنی کارگزاری بیان کرتا ہے، اور یہ ابلیس تخت پر بیٹھ کر ان کی کارگزاری سنتا ہے۔ ایک چیلا آکر اپنی یہ کارگزاری سناتا ہے کہ ایک شخص نماز پڑھنے کے ارادے سے مسجد کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے درمیان میں اس کو ایک ایسے کام میں پھنسا دیا جس سے اس کی نماز چھوٹ گئی ابلیس سن کر خوش ہوتا ہے کہ تم نے اچھا کام کیا۔ لیکن بہت زیادہ خوشی کا اظہار نہیں کرتا۔ دوسرا چیلا آکر بیان کرتا ہے کہ فلاں شخص فلاں عبادت کی نیت سے جا رہا تھا، میں نے اس کو عبادت سے روک دیا۔ ابلیس سن کر خوش ہوتا ہے کہ تم نے اچھا کیا۔ اسی طرح ہر چیلا اپنی کارگزاری سناتا ہے۔ اور ابلیس سن کر خوش ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک چیلا آکر یہ بیان کرتا ہے کہ دو میاں بیوی باہمی اتفاق اور محبت کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے، بڑی اچھی زندگی گزر رہی تھی، میں نے جا کر ایک ایسا کام کیا جس کے نتیجے میں دونوں میں لڑائی ہو گئی، اور لڑائی کے نتیجے میں دونوں میں جدائی واقع ہو گئی، جب ابلیس یہ سنتا ہے کہ اس چیلے نے دونوں میاں بیوی کو آپس میں لڑا دیا جو اچھی زندگی گزار رہے تھے۔ خوش ہو کر اپنے تخت سے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس چیلے سے معانقہ کرتا ہے۔ اس کو گلے لگا لیتا ہے۔ اور اس سے کہتا ہے کہ صحیح معنی میں میرا نمائندہ تو ہے۔ اور تو نے جو کارنامہ انجام دیا وہ اور کسی نے انجام نہیں دیا۔ (۱)

اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کو میاں بیوی کے باہمی جھگڑے اور ایک دوسرے سے نفرت اور قطع تعلق کتنے ناپسندیدہ ہیں۔ اور شیطان کو یہ اعمال کتنے محبوب ہیں۔ اس لیے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے قرآن و حدیث میں دونوں پر ایک دوسرے کے فرائض اور حقوق بڑی تفصیل کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔ اگر انسان ان پر عمل کر لے تو دنیا بھی درست ہو جائے، اور آخرت بھی درست ہو جائے۔

مرد عورت پر حاکم ہے

اس لیے امام نووی رحمہ اللہ نے یہ دوسرا باب قائم فرمایا ہے جس کا عنوان ہے:

"باب حق الزوج على المرأة"

(۱) صحیح مسلم، کتاب صفة القيامة والجنة والنار، باب تحريش الشيطان وبعثه سراياه لفتنة الناس وأن مع كل انسان قرين، رقم: ۵۰۳۰

یعنی شوہر کے بیوی پر کیا حقوق ہیں۔ اور اس کے تحت قرآنی آیات اور احادیث ذکر فرمائیں۔ سب سے پہلے قرآن کریم کی یہ آیت لائے ہیں:

﴿اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَبِمَا أَنفَقُوْا مِنْ أَمْوَالِهِمْ﴾ (۱)

یعنی مرد عورتوں پر نگہبان اور ان کے منتظم ہیں۔ بعض حضرات نے اس کا یہ ترجمہ بھی کیا ہے کہ مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔ ''قوام'' اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی کام کے کرنے یا اس کا انتظام کرنے کا ذمہ دار ہو، گویا کہ مرد عورتوں پر قوام ہیں۔ ان کے کاموں کے منتظم ہیں۔ اور ان کے حاکم ہیں۔ یہ ایک اصول بیان فرما دیا۔ اس لیے کہ اصولی باتیں ذہن میں نہ ہونے کی صورت میں جتنے کام انسان کرے گا وہ غلط تصورات کے ماتحت کرے گا، لہٰذا مرد کے حقوق بیان کرتے ہوئے عورت کو پہلے اصولی بات سمجھا دی کہ وہ مرد تمہاری زندگی کے امور کا نگہبان اور منتظم ہے۔

آج کی دنیا کا پروپیگنڈہ

آج کی دنیا میں جہاں مرد و عورت کی مساوات، ان کی برابری اور آزادی نسواں کا بڑا زور و شور ہے۔ ایسی دنیا میں لوگ یہ بات کرتے ہوئے شرماتے ہیں کہ شریعت نے مرد کو حاکم بنایا ہے۔ اور عورت کو محکوم بنایا ہے۔ اس لیے کہ آج کی دنیا میں یہ پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے کہ مرد کی عورت پر بالادستی قائم کر دی گئی ہے۔ اور عورت کو محکوم بنا کر اس کے ہاتھ میں قید کر دیا گیا ہے۔ اور اس کو چھوٹا قرار دے دیا گیا ہے۔

سفر کے دوران ایک کو امیر بنا لو

لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ مرد اور عورت زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں، زندگی کا سفر دونوں کو ایک ساتھ طے کرنا ہے، اب زندگی کا سفر طے کرنے میں انتظام کی خاطر یہ لازمی بات ہے کہ دونوں میں سے کوئی ایک شخص سفر کا ذمہ دار ہو۔ حدیث میں نبی کریم ﷺ نے یہ حکم دیا کہ جب بھی دو آدمی کوئی سفر کر رہے ہوں چاہے وہ سفر چھوٹا سا کیوں نہ ہو، اس سفر میں اپنے میں سے ایک کو امیر بنا لو، (۲) امیر بنائے بغیر سفر نہیں کرنا چاہئے۔ تاکہ سفر کے جملہ انتظامات اور پالیسی اس امیر کے فیصلے

(۱) النساء: ۳٤

(۲) الجامع الكبير للسيوطى، رقم: ۱۳۲٦۰ (۱/۱۳٤٤۰)، كنز العمال، رقم: ۱۷۵۱۷ (٦/۷۱۰)

کے تابع ہوں۔ اگر امیر نہیں بنائیں گے تو ایک بدنظمی ہو جائے گی۔

لہٰذا جب ایک چھوٹے سے سفر میں امیر بنانے کی تاکید کی گئی ہے تو زندگی کا یہ طویل سفر جو ایک ساتھ گزارنا ہے۔ اس میں یہ تاکید کیوں نہیں ہوگی کہ اپنے میں سے ایک کو امیر بنالو۔ تاکہ بدنظمی پیدا نہ ہو۔ بلکہ انتظام قائم رہے۔ اس انتظام کو قائم کرنے کے لیے کسی ایک کو امیر بنانا ضروری ہے۔

زندگی کے سفر کا امیر کون ہے؟

اب دو راستے ہیں۔ یا تو مرد کو اس زندگی کے سفر کا امیر بنا دیا جائے، یا عورت کو امیر بنا دیا جائے، اور مرد کو اس کا محکوم بنا دیا جائے۔ تیسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اب انسانی خلقت، فطرت، قوت اور صلاحیتوں کے لحاظ سے بھی اور عقل کے ذریعہ انسان غور کرے تو یہی نظر آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نے جو قوت مرد کو عطا کی ہے۔ بڑے بڑے کام کرنے کی جو صلاحیت مرد کو عطا فرمائی ہے۔ وہ عورت کو عطا نہیں کی۔ لہٰذا اس امارت اور اس سربراہی کا کام صحیح طور پر مرد ہی انجام دے سکتا ہے۔ اور اس کے لیے اپنی عقل سے فیصلہ کرنے کے بجائے اس ذات سے پوچھا جائے جس نے ان دونوں کو بنایا اور پیدا کیا کہ آپ نے دونوں کو سفر پر روانہ کیا۔ اب آپ ہی بتائیں کس کو امیر بنائیں اور کس کو مامور بنائیں؟ اور سوائے اس کے فیصلے کے کسی اور کا فیصلہ قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ خواہ وہ فیصلہ عقلی دلائل سے آراستہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرما دیا کہ اس زندگی کے سفر کو طے کرنے کے لیے مرد ''قوام، حاکم اور منتظم'' ہیں، اگر تم اس فیصلے کو صحیح جانتے ہو، اور مانتے ہو تو اسی میں تمہاری سعادت اور کامیابی ہے۔ اور اگر نہیں مانتے، بلکہ اس فیصلے کی خلاف ورزی کرتے ہو۔ اور اس کے ساتھ بغاوت کرتے ہو، تو پھر تم جانو اور تمہاری زندگی جانے، اب تمہاری زندگی خراب ہوگی۔ اور ہو رہی ہے، جن لوگوں نے اس فیصلے کے خلاف بغاوت کی ان کا انجام دیکھ لیجیے کہ کیا ہوا؟

اسلام میں امیر کا تصور

البتہ اللہ تعالیٰ نے جو لفظ یہاں استعمال فرمایا، اس کو سمجھ لیجیے، اللہ تعالیٰ نے یہاں ''امیر''، ''حاکم'' اور ''بادشاہ'' کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ بلکہ ''قوام'' کا لفظ استعمال کیا۔ اور ''قوام'' کا معنی وہ شخص جو کسی کام کا ذمہ دار ہو۔ اور ذمہ دار ہونے کے معنی یہ ہیں کہ بحیثیت مجموعی زندگی گزارنے کی پالیسی وہ طے کرے گا، اور پھر اس پالیسی کے مطابق زندگی گزاری جائے گی۔ لیکن ''قوام'' ہونے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ آقا ہے۔ اور بیوی اس کی کنیز ہے۔ یا بیوی اس کی نوکر ہے۔ بلکہ دونوں کے

درمیان امیر اور مامور، حاکم اور محکوم کا رشتہ ہے۔ اور اسلام میں ''امیر'' کا تصور یہ نہیں ہے کہ وہ تخت پر بیٹھ کر حکم چلائے۔ بلکہ اسلام میں امیر کا تصور وہ ہے جو حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((سَيِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ))(۱)

قوم کا سرداران کا خادم ہوتا ہے۔

یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ ایک واقعہ سنایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ ہم دیوبند سے کسی دوسری جگہ سفر پر جانے لگے تو ہمارے استاد حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیوبند میں ''شیخ الادب'' کے نام سے مشہور تھے، وہ بھی ہمارے ساتھ سفر میں تھے، جب ہم اسٹیشن پر پہنچے تو گاڑی کے آنے میں دیر تھی، مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حدیث شریف میں ہے کہ جب تم کہیں سفر پر جاؤ تو کسی کو اپنا امیر بنالو، لہٰذا ہمیں بھی اپنا امیر بنالینا چاہئے، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ چونکہ ہم شاگرد تھے وہ استاد تھے۔ اس لیے ہم نے کہا کہ امیر بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ امیر تو بنے بنائے موجود ہیں۔ حضرت مولانا نے پوچھا کہ کون؟ ہم نے کہا کہ امیر آپ ہیں، اس لیے کہ آپ استاد ہیں۔ ہم شاگرد ہیں، حضرت مولانا نے کہا کہ اچھا آپ لوگ مجھے امیر بنانا چاہتے ہیں؟ ہم نے کہا کہ جی ہاں! آپ کے سوا اور کون امیر بن سکتا ہے؟ مولانا نے فرمایا کہ اچھا ٹھیک ہے، لیکن امیر کا ہر حکم ماننا ہوگا۔ اس لیے کہ امیر کے معنی یہ ہیں کہ اس کے حکم کی اطاعت کی جائے، ہم نے کہا جب امیر بنایا ہے تو ان شاء اللہ ہر حکم کی اطاعت بھی کریں گے، مولانا نے فرمایا کہ ٹھیک ہے، میں امیر ہوں۔ اور میرا حکم ماننا۔ جب گاڑی آئی تو حضرت مولانا نے تمام ساتھیوں کا کچھ سامان سر پر اور کچھ ہاتھ میں اٹھایا، اور چلنا شروع کر دیا۔ ہم نے کہا کہ حضرت یہ کیا آپ غضب کر رہے ہیں؟ ہمیں اٹھانے دیجیے۔ مولانا نے فرمایا کہ نہیں۔ جب امیر بنایا ہے تو اب حکم ماننا ہوگا، اور یہ سامان مجھے اٹھانے دیں، چنانچہ وہ سارا سامان اٹھا کر گاڑی میں رکھا۔ اور پھر پورے سفر میں جہاں کہیں مشقت کا کام آتا وہ کام خود کرتے، اور جب ہم کچھ کہتے تو فوراً مولانا فرماتے کہ دیکھو تم نے مجھے امیر بنایا ہے، اور امیر کا حکم ماننا ہوگا۔ لہٰذا میرا حکم مانو۔ ان کو امیر بنانا ہمارے لیے قیامت ہوگیا۔ حقیقت میں امیر کا تصور یہ ہے۔

---

(۱) جامع الأحاديث، رقم: ۱۳۲۲۲، (۳۲٤/۱۳)، الجامع الصغير وزيادة، رقم: ۷۰٦٦ (۷۰۸/۱)، كشف الخفاء، رقم: ۱۵۱۵ (۵۰۰/۲)

امیر وہ جو خدمت کرے

آج ذہن میں جب امیر کا تصور آتا ہے تو وہ بادشاہوں اور بڑے سربراہوں کی صورت میں آتا ہے۔ جو اپنے رعایا کے ساتھ بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتے، لیکن قرآن وحدیث کا تصور یہ ہے کہ امیر وہ شخص ہے جو خدمت کرے، جو خادم ہو۔ امیر کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کو بادشاہ بنا دیا گیا ہے۔ اب وہ حکم چلایا کرے گا۔ اور دوسرے اس کے ماتحت نوکر اور غلام بن کر رہیں گے، بلکہ امیر کے معنی یہ ہیں کہ بے شک فیصلہ اس کا معتبر ہوگا، ساتھ ہی وہ فیصلہ ان کی خدمت کے لیے ہوگا، ان کی راحت اور خیر خواہی کے لیے ہوگا۔

میاں بیوی میں دوستی کا تعلق ہے

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مردوں کو یہ آیت تو یاد رہتی ہے:

﴿اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾(۱)

یعنی مرد عورتوں پر حکمران اور حاکم ہیں۔ اب بیٹھ کر عورتوں پر حکم چلا رہے ہیں۔ اور ذہن میں یہ بات ہے کہ عورت کو ہر حال میں تابع اور فرماں بردار ہونا چاہئے اور ہمارا ان کے ساتھ آقا اور نوکر جیسا رشتہ ہے۔ معاذ اللہ۔ لیکن قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ایک اور آیت بھی نازل فرمائی ہے۔ وہ آیت مردوں کو یاد نہیں رہتی۔ وہ آیت یہ ہے:

﴿وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً﴾(۲)

”اور اسی کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری جنس کی بیویاں بنائیں تاکہ تم کو ان کے پاس آرام ملے، اور تم دونوں میاں بیوی میں محبت اور ہمدردی پیدا کی“

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بے شک مرد عورت کے لیے قوام ہے۔ لیکن ساتھ میں دوستی کا تعلق بھی ہے۔ انتظامی طور پر تو قوام ہے، لیکن باہمی تعلق دوستی جیسا ہے، لہٰذا ایسا تعلق نہیں ہے جیسا آقا اور کنیز کے درمیان ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے دو دوست کہیں سفر پر جا رہے

---

(۱) النساء: ۳٤

(۲) الروم: ۲۱

ہوں۔ اور ایک دوست نے دوسرے دوست کو امیر بنا لیا ہو۔ لہٰذا شوہر اس لحاظ سے تو امیر ہے کہ ساری زندگی کا فیصلہ کرنے کا وہ ذمہ دار ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اس کے ساتھ ایسا معاملہ کرے جیسے نوکروں اور غلاموں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ بلکہ اس دوستی کے تعلق کے کچھ آداب اور کچھ تقاضے ہیں۔ ان آداب اور تقاضوں میں ناز کی باتیں بھی ہوتی ہیں جن کو حاکم ہونے کے خلاف نہیں کہا جا سکتا۔

ایسا رعب مطلوب نہیں

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہمارے یہاں بعض مرد حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ ہم حاکم ہیں، لہٰذا ہمارا اتنا رعب ہونا چاہئے کہ ہمارا نام سن کر بیوی کانپنے لگے۔ اور بے تکلفی کے ساتھ بات نہ کر سکے۔ میرے ایک ہم سبق دوست تھے، انہوں نے ایک مرتبہ بڑے فخر کے ساتھ مجھ سے یہ بات کہی کہ جب میں کئی مہینوں کے بعد اپنے گھر جاتا ہوں تو میرے بیوی بچوں کی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ میرے پاس آ جائیں اور مجھ سے بات کریں، بڑے فخر کے ساتھ یہ بات کہہ رہے تھے، میں نے ان سے پوچھا کہ آپ جب گھر جاتے ہیں تو کیا کوئی درندہ یا شیر چیتا بن جاتے ہیں جس کی وجہ سے بیوی بچے آپ کے پاس آنے سے ڈرتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ یہ نہیں بلکہ اس لیے کہ ہم قوام ہیں، ہمارا رعب ہونا چاہئے۔ اچھی طرح سمجھ لیں کہ قوام ہونے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ بیوی بچے پاس آنے اور بات کرنے سے بھی ڈریں، بلکہ ان کے ساتھ دوستی کا تعلق بھی ہے۔ اور وہ دوستی کا تعلق کس قسم کا ہونا چاہئے؟ سنئے!

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت دیکھئے

ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ جب تم مجھ سے راضی ہوتی ہو، اور جب تم مجھ سے ناراض ہوتی ہو، دونوں حالتوں میں مجھے علم ہو جاتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! کس طرح علم ہو جاتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم مجھ سے راضی ہوتی ہو تو رب محمد (محمد کے رب کی قسم) کے الفاظ سے قسم کھاتی ہو اور جب تم مجھ سے ناراض ہوتی ہو تو رب ابراہیم (ابراہیم کے رب کی قسم) کے الفاظ سے قسم کھاتی ہو۔ اس وقت تم میرا نام نہیں لیتیں، بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام لیتی ہو، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

"اِنِّی لَا اَھْجُرُ اِلَّا اسْمَكَ"

''یا رسول اللہ! ایسے موقع پر میں صرف آپ ﷺ کا نام ہی چھوڑتی ہوں، لیکن آپ ﷺ کی محبت دل سے جدا نہیں ہوتی''(۱)

اب آپ اندازہ لگائیں کہ کون ناراض ہو رہا ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور کس سے ناراض؟ حضور اقدس ﷺ سے، جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ناز سے بعض اوقات ایسی بات فرما دیتی تھیں جس سے معلوم ہو جاتا تھا کہ ان کے دل میں کدورت اور ناراضگی ہے لیکن اس کو آنحضرت ﷺ نے اپنی ''قوامیت'' کے خلاف نہیں سمجھا بلکہ آنحضرت ﷺ نے بڑی خوش طبعی کے ساتھ اس کا ذکر فرمایا کہ تمہاری ناراضگی کا مجھے پتہ چل جاتا ہے۔

بیوی کے ناز کو برداشت کیا جائے

جب ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر سنگین تہمت لگائی گئی (نعوذ باللہ) اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر اس تہمت کی وجہ سے قیامت گزر گئی۔ آنحضرت ﷺ کو بھی ظاہر ہے کہ اس بات کا قلق تھا کہ لوگوں میں اس قسم کی باتیں پھیل گئی ہیں، لیکن ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ فرما دیا:

''اے عائشہ! دیکھو بات یہ ہے کہ تمہیں اتنا غمگین ہونے کی ضرورت نہیں اگر تم بے خطا اور بے قصور ہو تو اللہ تعالیٰ ضرور تمہاری برأت ظاہر فرما دیں گے۔ اور اگر خدانخواستہ تم سے کوئی قصور اور غلطی ہوئی ہے تو اللہ تعالیٰ سے توبہ کرلو، استغفار کرلو۔ اللہ تعالیٰ معاف فرما دیں گے''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ بات بہت شاق گزری کہ آپ نے یہ دوشقیں کیوں کی کہ اگر بے قصور ہو تو اللہ تعالیٰ برأت ظاہر فرما دے گا۔ اور اگر قصور ہوا ہو تو توبہ کرلو۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے دل میں بھی اس بات کا ہلکا سا احتمال ہے کہ مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو گی۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس بات کا بہت سخت صدمہ ہوا، اور صدمہ سے نڈھال ہو کر لیٹ گئیں، اور اسی حال میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے برأت کی آیات نازل ہوئیں۔ اس وقت گھر میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ جب یہ آیات سنیں تو حضور اقدس ﷺ بھی بہت خوش ہوئے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ اب ان شاء اللہ یہ سارا بہتان ختم ہو جائے گا۔ اس وقت حضرت ابوبکر

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب غیرة النساء ووجدهن، رقم: ٤٨٢٧، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فی فضائل عائشة، رقم: ٤٤٦٩، مسند أحمد، رقم: ٢٣١٨٢

صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ خوشخبری سن لو، اللہ تعالیٰ نے تمہاری برأت میں آیات نازل فرمادیں، اور اب کھڑی ہوجاؤ اور آکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کرو، حضرت عائشہ بستر پر لیٹی ہوئی ہیں، اور برأت کی آیات سن لیں۔ لیٹے لیٹے فرمایا کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے میری برأت نازل فرمادی لیکن میں اللہ کے سوا کسی کا شکر ادا نہیں کرتی۔ کیونکہ آپ لوگوں نے تو اپنے دل میں یہ احتمال پیدا کرلیا تھا کہ شاید مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔(۱)

بظاہر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑے ہونے سے اعراض فرمایا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو برا نہیں سمجھا، اس لیے کہ یہ ناز کی بات تھی۔ جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے سرزد ہوئی۔

یہ ناز درحقیقت اس دوستی کا تقاضا ہے، لہٰذا میاں بیوی کے درمیان صرف حاکمیت اور محکومیت کا رشتہ نہیں ہے بلکہ دوستی کا بھی رشتہ ہے اور اس دوستی کا حق یہ ہے کہ اس قسم کے ناز کو برداشت کیا جائے۔ البتہ جہاں بات بالکل غلط ہوگئی وہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ناگواری اور غصہ کا بھی اظہار فرمایا۔ لیکن اس قسم کی ناز کی باتوں کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے گوارا فرمایا۔

بیوی کی دلجوئی سنت ہے

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوستی کا حق اس طرح ادا فرمایا کہ کہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقامات اور درجات عالیہ کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم ہے۔ اور ہم کلامی ہو رہی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے ساتھ دلداری اور دلجوئی اور حسن سلوک کا یہ عالم تھا کہ رات کے وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو گیارہ عورتوں کا قصہ سنا رہے ہیں کہ یمن کے اندر گیارہ عورتیں تھیں۔ انہوں نے آپس میں یہ طے کیا تھا کہ وہ سب ایک دوسرے کو اپنے اپنے شوہروں کی حقیقی اور واقعی حالت بیان کریں گی یعنی ہر عورت یہ بتائے گی کہ اس کا شوہر کیسا ہے؟ اس کے کیا اوصاف ہیں؟ ان گیارہ عورتوں نے اپنے شوہروں کے اوصاف کس وضاحت اور بلاغت کے ساتھ بیان کیے ہیں کہ ساری ادبی لطافتیں اس پر ختم ہیں۔ وہ سارا قصہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو سنا رہے ہیں۔(۲)

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب تفسیر القرآن، باب "لولا اذسمعتموه ظن المؤمنون......"، رقم: ٤٣٨١، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فی فضل عائشة، رقم: ٤٤٧٧، مسند أحمد: ٢٣٦٩٠

(۲) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب حسن المعاشرة مع الأهل، رقم: ٤٧٩٠، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب ذکر حدیث أم زرع، رقم: ٤٤٨١

بیوی کے ساتھ ہنسی مذاق سنت ہے

ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں مقیم تھے، اور ان کی باری کا دن تھا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور ﷺ کے لیے ایک حلوہ پکایا اور حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے گھر پر لائیں، اور لا کر حضور اقدس ﷺ کے سامنے رکھ دیا اور حضرت سودہ بھی سامنے بیٹھی ہوئی تھیں ان سے کہا کہ آپ بھی کھائیں۔ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کو یہ بات گراں گزری کہ جب حضور اقدس ﷺ میرے گھر میں تھے اور میری باری کا دن تھا تو پھر یہ حلوہ پکا کر کیوں لائیں؟ اس لیے حضرت سودہ نے انکار کر دیا کہ میں نہیں کھاتی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ یہ حلوہ کھاؤ اور اگر نہیں کھاؤ گے تو پھر یہ حلوہ تمہارے منہ پر مل دوں گی، حضرت سودہ نے فرمایا کہ میں تو نہیں کھاؤں گی۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے تھوڑا سا حلوہ اٹھا کر حضرت سودہ کے منہ پر مل دیا۔ اب حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے حضور اقدس ﷺ سے شکایت کی یا رسول اللہ! انہوں نے میرے منہ پر حلوہ مل دیا ہے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ قرآن کریم میں آیا ہے:

﴿وَجَزَآءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾(۱)

یعنی کوئی شخص اگر تمہارے ساتھ برا سلوک کرے تو تم بھی بدلے میں اس کے ساتھ برا سلوک کر سکتے ہو۔ اب اگر انہوں نے تمہارے منہ پر حلوہ مل دیا ہے تو تم بھی ان کے چہرے پر حلوہ مل دو، چنانچہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے تھوڑا سا حلوہ اٹھا کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے چہرے پر مل دیا، اب دونوں کے چہروں پر حلوہ ملا ہوا ہے اور یہ سب حضور اقدس ﷺ کے سامنے ہو رہا ہے۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی، پوچھا کہ کون؟ معلوم ہوا کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ تشریف لائے ہیں (شاید اس وقت تک پردے کے احکام نہیں آئے تھے) جب آپ نے یہ سنا کہ حضرت عمر تشریف لائے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ تم دونوں جلدی جا کر اپنے چہرے دھولو۔ اس لیے کہ عمر آرہے ہیں چنانچہ دونوں نے جا کر اپنا چہرہ دھویا۔(۲)

وہ ذات جس کا ہر آن اللہ جل جلالہ کے ساتھ رابطہ قائم ہے۔ جس کی ہر وقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ گفتگو ہو رہی ہے اور وحی آرہی ہے، اللہ تعالیٰ کی حضوری کا وہ مقام حاصل ہے جو اس روئے زمین پر کسی اور کو حاصل نہیں ہو سکتا، لیکن اس کے باوجود ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے ساتھ یہ انداز اور ان کی دلداری کا اتنا خیال ہے۔

---

(۱) النساء: ۱٤۹

(۲) مجمع الزوائد (٤/٣١٦)

مقام ''حضوری'' کی حقیقت

ہم اور آپ زبان سے ''حضوری'' کا لفظ بول دیتے ہیں۔ لیکن اس کی حقیقت ہمیں معلوم نہیں۔ اگر کوئی شخص اس کا مزہ چکھ لے تو اس کو پتہ لگے گا کہ یہ کیا چیز ہے، ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کے ساتھ حضوری کا خیال اس درجہ بڑھ جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے بعض بندے ایسے ہیں کہ وہ پاؤں پھیلا کر نہیں سو سکتے، لیٹ نہیں سکتے، اس لیے کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے ہونے کا احساس ہے، اور جب اپنا بڑا سامنے ہو تو کوئی شخص پاؤں پھیلا کر لیٹے گا؟ ہرگز نہیں لیٹے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے حاضر ہونے کا احساس اور خیال اس درجہ بڑھ جاتا ہے کہ انسان پاؤں پھیلا کر لیٹ نہیں سکتا۔ لہٰذا جس ذات کو ''حضوری'' کا اتنا بڑا مقام حاصل ہو جو دنیا میں کسی اور کو نہیں ہوسکتا۔ وہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے ساتھ کس طرح خوش طبعی کے معاملات کر لیتے ہیں؟ یہ مقام صرف ایک پیغمبر ہی کو حاصل ہوسکتا ہے۔

فیصلہ خاوند کا چلے گا

بہر حال! چونکہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو ''قوام'' بنایا ہے اس لیے فیصلہ اسی کا ماننا ہوگا۔ ہاں تم اپنی رائے اور مشورہ دے سکتی ہو۔ اور ہم نے مرد کو یہ ہدایت بھی دے رکھی ہے کہ وہ حتی الامکان تمہاری دلداری کا خیال بھی کرے لیکن فیصلہ اسی کا مانا جائے گا۔ لہٰذا اگر یہ بات ذہن میں نہ ہو، اور بیگم صاحبہ یہ چاہیں کہ ہر معاملے میں فیصلہ میرا چلے اور مرد قوام نہ بنے، میں قوام بن جاؤں تو یہ صورت فطرت کے خلاف ہے۔ شریعت کے خلاف ہے۔ عقل کے خلاف ہے اور انصاف کے خلاف ہے اس کا نتیجہ گھر کی بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔

عورت کی ذمہ داریاں

آیت مبارکہ کا دوسرا حصہ یہ ہے:

﴿فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ﴾ (۱)

فرمایا کہ نیک عورتوں کا کام کیا ہے؟ نیک عورتوں کا کام یہ ہے کہ وہ ''قانتات'' ہیں یعنی اللہ کی اطاعت کرنے والی۔ اللہ نے جو حقوق شوہر کے عائد کیے ہیں ان حقوق کو صحیح طور بجالانے والی اور

---

(۱) النساء: ۳۴

شوہر کی غیر موجودگی میں شوہر کے گھر کی حفاظت کرنے والی۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے عورت کا لازمی وصف قرار دیا۔ اور اس کے ذمے یہ فریضہ عائد کیا کہ جب شوہر گھر میں موجود نہ ہو تو اس وقت وہ اس کے گھر کی حفاظت کرے۔ گھر کی حفاظت کا مطلب یہ ہے کہ اول تو خود اپنی حفاظت کرے کہ کسی گناہ میں مبتلا نہ ہو اور شوہر کا جو مال ومتاع ہے، اس کی حفاظت کرے۔ اس لیے اس کی حفاظت کی ذمہ داری بیوی پر عائد ہوتی ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

((اَلْمَرْأَةُ رَاعِیَةٌ فِیْ بَیْتِ زَوْجِهَا))(۱)

عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگہبان ہے۔ یعنی اس کے مال ومتاع کی حفاظت عورت کی ذمہ داری ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اکثر حالات میں عورت کے ذمہ کھانا پکانا واجب نہیں ہوتا۔ لیکن شوہر کے گھر کی حفاظت اور اس کے مال ومتاع کی اس طرح حفاظت کہ وہ مال بے جا خرچ نہ ہو۔ قرآن کریم نے یہ اس کی ذمہ داری قرار دی ہے۔

زندگی قانون کے خشک تعلق سے نہیں گزر سکتی

یہ جو میں نے کہا کہ عورت کے ذمے کھانا پکانے کی ذمہ داری نہیں ہے۔ وہ ایک قانون کی بات تھی۔ لیکن زندگی قانون کے خشک تعلق سے نہیں چلا کرتی، لہٰذا جس طرح قانوناً عورت کے ذمہ کھانا پکانا نہیں ہے۔ اسی طرح اگر عورت بیمار ہو جائے تو قانوناً شوہر کے ذمہ اس کا علاج کرانا، یا علاج کے لیے خرچہ دینا بھی ضروری نہیں۔ اور قانوناً شوہر کے ذمہ یہ بھی نہیں ہے کہ وہ عورت کو اس کے والدین کے گھر ملاقات کے لیے لے جایا کرے۔ اور نہ یہ ضروری ہے کہ جب عورت کے ماں باپ اپنی بیٹی سے ملاقات کے لیے آئیں تو ان کو گھر میں بٹھائے۔ بلکہ فقہاء کرام نے یہاں تک لکھا ہے کہ ہفتہ میں صرف ایک دن عورت کے ماں باپ آئیں اور دور سے ملاقات اور زیارت کر کے چلے جائیں۔ گھر میں بٹھا کر ملاقات کرانا شوہر کے ذمہ ضروری نہیں۔ لہٰذا اگر قانون کے خشک تعلق کی بنیاد پر اگر زندگی بسر ہونی شروع ہو جائے تو دونوں کا گھر برباد ہو جائے۔ بات جب چلتی ہے جب خاوند قانون کی بات سے آگے بڑھ کر سنت رسول اللہ ﷺ کی اتباع کرے۔ اور بیوی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی سنت کی اتباع کرے۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجمعة، باب الجمعة فی القری والمدن، رقم: ۸۴۴، مسند أحمد، رقم: ۵۷۵۳

بیوی کے دل میں شوہر کے پیسے کا درد ہو

حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ نے مواعظ میں ذکر فرمایا کہ عورت کے فرائض میں داخل ہے کہ اس کے دل میں شوہر کے پیسے کا درد ہو، شوہر کا پیسہ غلط جگہ پر بلا وجہ صرف نہ ہو۔ اور فضول خرچی میں اس کا پیسہ ضائع نہ ہو۔ یہ چیز عورت کے فرائض میں داخل ہے۔ یہ نہ ہو کہ شوہر کا پیسہ دل کھول کر خرچ کیا جا رہا ہے۔ یا گھر کی نوکرانیوں پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ وہ جس طرح چاہ رہی ہیں کر رہی ہیں۔ اگر کوئی عورت ایسا کرتی ہے تو یہ قانونی فرائض کے خلاف کر رہی ہے۔

ایسی عورت پر فرشتوں کی لعنت

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ:
((اِذَا دَعَا الرَّجُلُ امْرَأَتَهُ اِلٰی فِرَاشِهٖ فَلَمْ تَأْتِهٖ فَبَاتَ غَضْبَانَ عَلَیْهَا لَعَنَتْهَا الْمَلَائِکَةُ حَتّٰی تُصْبِحَ))(۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی مرد اپنی بیوی کو اپنے بستر کی طرف بلائے اور یہ میاں بیوی کے مخصوص تعلقات سے کنایہ ہے۔ یعنی شوہر اپنی بیوی کو ان تعلقات کو قائم کرنے کے لیے بلائے۔ اور وہ عورت نہ آئے۔ یا ایسا طرز عمل اختیار کرے جس سے شوہر کا وہ منشا پورا نہ ہو، اور اس کی وجہ سے شوہر ناراض ہو جائے، ساری رات صبح تک فرشتے اس عورت پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں کہ اس عورت پر خدا کی لعنت ہو اور لعنت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کو حاصل نہیں ہوگی، اس لیے کہ تمہارے اتنے حقوق بیان کیے گئے۔ تمہارے حقوق کا لحاظ کیا گیا۔ اس کا منشا درحقیقت یہ ہے کہ تمہارے اور تمہارے شوہر کے درمیان جو تعلق ہے وہ درست ہو جائے۔ اور اس تعلق کی درستی کا ایک لازمی حصہ یہ ہے کہ تمہارے ذریعہ شوہر کو عفت حاصل ہو۔ پاک دامنی حاصل ہو۔ نکاح کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ پاک دامنی حاصل ہو۔ اور نکاح کے بعد شوہر کو کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت نہ رہے۔ اس لیے تمہارے ذمے یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ اس معاملے میں تمہاری طرف سے کوئی کوتاہی نہ ہو۔ اگر کوتاہی ہوگی تو پھر فرشتوں کی طرف سے تم پر لعنت ہوتی رہے گی۔

---

(۱) صحیح البخاری کتاب النکاح، باب اذا باتت المرأة مهاجرة فراش زوجها، رقم: ٤٧٩٤، صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب تحریم امتناعها من فراش زوجها، رقم: ٢٥٩٤، سنن أبی داؤد، کتاب النکاح، باب فی حق الزوج علی المرأة، رقم: ١٨٢٩، مسند احمد، رقم: ٨٢٢٤

دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں:

((اِذَا بَاتَتِ الْمَرْأَةُ مُهَاجِرَةً فِرَاشَ زَوْجِهَا لَعَنَتْهَا الْمَلَائِكَةُ حَتّٰى تُصْبِحَ))

اگر کوئی عورت اپنے شوہر کا بستر چھوڑ کر رات گزارے تو اس کو فرشتے لعنت کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ صبح ہو جائے۔ اب آپ اندازہ لگائیں کہ حدیث شریف میں ایک چھوٹی بات کہی گئی ہے کہ اگر شوہر نے بیوی کو اس کام کے لیے دعوت دی ہے اور وہ انکار کرے، یا ایسا طرز عمل اختیار کرے جس سے شوہر کا منشا پورا نہ ہو سکے تو ساری رات لعنت ہوتی رہتی ہے۔ اور اگر شوہر کی اجازت اور شوہر کی مرضی کے بغیر عورت گھر سے باہر چلی جائے تو جب تک وہ گھر سے باہر رہے گی۔ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کی لعنت ہوتی رہے گی۔ ان تمام معاملات کی نبی کریم ﷺ نے تفصیل کے ساتھ ایک ایک چیز بیان فرما دی، اس لیے کہ یہی چیزیں جھگڑے اور فساد کا باعث ہوتی ہیں۔

شوہر کی اجازت سے نفلی روزہ رکھے

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:

((لَا یَحِلُّ لِلْمَرْأَةِ اَنْ تَصُوْمَ وَزَوْجُهَا شَاهِدٌ إِلَّا بِإِذْنِهِ، وَلَا تَأْذَنَ فِیْ بَیْتِهِ إِلَّا بِإِذْنِهِ))(۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ کسی عورت کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے شوہر کی موجودگی میں روزہ رکھے۔ مگر شوہر کی اجازت سے، یعنی کسی عورت کے لیے نفلی روزہ رکھنا شوہر کی اجازت کے بغیر حلال نہیں۔ نفلی روزہ کے کتنے فضائل احادیث میں مذکور ہیں لیکن عورت شوہر کی اجازت کے بغیر نہیں رکھ سکتی۔ اس لیے کہ ہو سکتا ہے کہ دن کے وقت روزہ سے ہونے کی وجہ سے شوہر کو تکلیف ہو۔ اس لیے پہلے شوہر سے اجازت لے لے۔ البتہ شوہر کو چاہئے کہ وہ بلاوجہ بیوی کو نفلی روزے سے منع نہ کرے، بلکہ روزے کی اجازت دے دے۔ بعض اوقات میاں بیوی کے درمیان اس بات پر جھگڑا ہو جاتا ہے کہ بیوی کہتی ہے کہ میں روزہ رکھنا چاہتی ہوں اور شوہر کہتا ہے میں اجازت نہیں دیتا۔ اس لیے مرد کو چاہئے کہ وہ بلاوجہ اس فضیلت کو حاصل کرنے سے بیوی کو منع نہ کرے۔ لیکن عورت کے لیے بلا اجازت روزہ رکھنا جائز نہیں۔ اگر شوہر اجازت نہیں دیتا تو عورت وہ نفلی روزہ چھوڑ دے۔ اس لیے کہ شوہر کی اطاعت زیادہ مقدم ہے۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب لا تأذن المرأة فی بیت زوجها لأحد الا باذنه، رقم: ۴۷۹۶، صحیح مسلم، کتاب الزکاة، باب ما أنفق العبد من مال مولاه، رقم: ۱۷۰۴، مسند أحمد، رقم: ۷۸۴۱

شوہر کی اطاعت نفلی عبادت پر مقدم ہے

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے شوہر کی اطاعت کو تمام نفلی عبادتوں پر فوقیت عطا فرمائی ہے۔ لہٰذا جو ثواب اس عورت کو روزہ رکھ کر ملتا، اب شوہر کی اطاعت کرنے میں اس سے زیادہ ثواب ملے گا اور وہ عورت یہ نہ سمجھے میں روزہ سے محروم ہوگئی۔ اس لیے کہ وہ یہ سوچے کہ روزہ کس لیے رکھ رہی تھی؟ روزہ تو اس لیے رکھ رہی تھی کہ ثواب ملے گا۔ اور اللہ تعالیٰ راضی ہوں گے اور اللہ تعالیٰ یہ فرمارہے ہیں کہ میں اس وقت تک راضی نہیں ہوں گا جب تک تیرا شوہر تجھ سے راضی نہیں ہوگا اس لیے جو ثواب تمہیں روزہ رکھ کر ملتا، وہی روزے کا ثواب کھانے پینے کے بعد بھی ملے گا۔ ان شاء اللہ

گھر کے کام کاج پر اجر وثواب

بعض مرتبہ ہم لوگوں کے ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ یہ میاں بیوی کے تعلقات ایک دنیاوی قسم کا معاملہ ہے۔ اور یہ صرف نفسانی خواہشات کی تکمیل کا معاملہ ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ دینی معاملہ بھی ہے اس لیے کہ اگر عورت یہ نیت کرلے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے ذمے یہ فریضہ عائد کیا ہے، اور اس تعلق کا مقصد شوہر کو خوش کرنا ہے۔ اور شوہر کو خوش کرنے کے واسطے سے اللہ تعالیٰ کو خوش کرنا ہے۔ تو پھر یہ سارا عمل ثواب بن جاتا ہے۔ گھر کا جو کام خواتین کرتی ہیں، اور اس میں نیت شوہر کو خوش کرنے کی ہے۔ تو صبح سے لے کر شام تک وہ جتنا کام کررہی ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کے یہاں عبادت میں لکھا جاتا ہے، چاہے وہ کھانا پکانا ہو، گھر کی دیکھ بھال ہو، یا بچوں کی تربیت ہو، یا شوہر کا خیال ہو، یا شوہر کے ساتھ خوش دلی کی باتیں ہوں، ان سب پر اجر لکھا جارہا ہے بشرطیکہ نیت درست ہو۔

جنسی خواہش کی تکمیل پر اجر وثواب

اس موضوع پر بالکل صریح حدیث موجود ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میاں بیوی کے جو باہمی تعلقات ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ان پر بھی اجر عطا فرماتے ہیں۔ صحابہ کرام نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! وہ تو انسان اپنی نفسانی خواہشات کے تحت کرتا ہے۔ اس پر کیسا اجر؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر وہ نفسانی خواہشات کو ناجائز طریقے سے پورا کرتے تو اس پر گناہ ہوتا یا نہیں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا ''یا رسول اللہ! گناہ ضرور ہوتا'' آپ نے فرمایا چونکہ میاں بیوی ناجائز طریقے

کو چھوڑ کر جائز طریقے سے نفسانی خواہشات کو اللہ تعالیٰ کی وجہ سے اور اس کے حکم کے ماتحت کر کر رہے ہیں اس لیے اس پر بھی ثواب ہوگا۔(۱)

اللہ تعالیٰ دونوں کو رحمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں

ایک حدیث جو میں نے خود تو نہیں دیکھی البتہ حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ کے مواعظ میں یہ حدیث پڑھی ہے اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے کئی جگہ اس حدیث کا ذکر فرمایا۔ وہ حدیث یہ ہے کہ شوہر باہر سے گھر کے اندر داخل ہوا اور اس نے محبت کی نگاہ سے بیوی کو دیکھا اور بیوی نے محبت کی نگاہ سے شوہر کو دیکھا تو اللہ تعالیٰ دونوں کو رحمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لہٰذا یہ میاں بیوی کے تعلقات محض دنیوی قصہ نہیں ہے۔ یہ آخرت اور جنت و جہنم بنانے کا راستہ بھی ہے۔

قضا روزوں میں شوہر کی رعایت

ترمذی شریف میں حدیث ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رمضان کے مہینے میں طبعی مجبوری کی وجہ سے جو روزے مجھ سے قضا ہو جاتے تھے، میں عام طور پر ان روزوں کو آنے والے شعبان کے مہینے میں رکھا کرتی تھی یعنی تقریباً گیارہ ماہ بعد، یہ میں اس لیے کرتی تھی کہ شعبان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی کثرت سے روزے رکھا کرتے تھے۔ لہٰذا اگر اس زمانے میں بھی روزے سے ہوں گی۔ اور آپ بھی روزے سے ہوں گے تو یہ صورت زیادہ بہتر ہے بنسبت اس کے کہ میں روزہ سے ہوں۔ اور آپ کا روزہ نہ ہو حالانکہ وہ نفلی روزے نہیں تھے۔ بلکہ رمضان کے قضا روزے تھے۔ اور قضا روزوں کے بارے میں حکم یہ ہے کہ ان کو جتنا جلدی ہو سکے، ادا کر لینے چاہئیں، لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا صرف آپ کی تکلیف کے خیال سے شعبان تک مؤخر فرماتی تھیں۔(۲)

بیوی ناپسندیدہ شخص کو گھر میں آنے کی اجازت نہ دے

اس حدیث کا اگلا جملہ یہ ارشاد فرمایا:

((وَلَا تَأْذَنَ فِي بَيْتِهِ إِلَّا بِإِذْنِهِ))

---

(۱) مسند أحمد (٥/٦٧)

(۲) صحيح البخاري، كتاب الصوم، باب متى يقضي قضاء رمضان، رقم: ١٨١٤، صحيح مسلم، كتاب الصيام، باب قضاء رمضان في شعبان، رقم: ١٩٣٣،

یعنی عورت کے ذمہ یہ بھی فرض ہے کہ شوہر کے گھر میں کسی کو شوہر کی اجازت کے بغیر داخل ہونے کی اجازت نہ دے۔ یا کسی ایسے شخص کو گھر کے اندر آنے کی اجازت دینا جس کو شوہر ناپسند کرتا ہو۔ یہ عورت کے لیے بالکل ناجائز اور حرام ہے۔ ایک دوسری حدیث میں اس بات کو اور تفصیل سے بیان فرمایا:

((اَلَا اِنَّ لَکُمْ عَلٰی نِسَائِکُمْ حَقًّا وَلِنِسَائِکُمْ عَلَیْکُمْ حَقًّا فَأَمَّا حَقُّکُمْ عَلَیْهِنَّ اَنْ لَّایُوْطِئْنَ فُرُشَکُمْ مَنْ تَکْرَهُوْنَ وَلَایَاْذَنَّ فِیْ بُیُوْتِکُمْ لِمَنْ تَکْرَهُوْنَ))(۱)

یاد رکھو، تمہارا تمہاری بیویوں پر بھی کچھ حق ہے اور تمہاری بیویوں کا تم پر کچھ حق ہے یعنی دونوں کے ذمے ایک دوسرے کے کچھ حقوق ہیں اور دونوں کے حقوق کی نگہداشت اور پاسداری فریقین پر لازم ہے۔ وہ حقوق کیا ہیں؟ وہ یہ ہیں کہ اے مردو! تمہارا حق ان بیویوں پر یہ ہے کہ وہ تمہارے بستروں کو ایسے لوگوں کو استعمال نہ کرنے دیں جنہیں تم ناپسند کرتے ہو اور تمہارے گھر میں ایسے لوگوں کو آنے کی اجازت نہ دیں، جن کا آنا تم ناپسند کرتے ہو، یہاں دو حق بیان فرمائے ایک یہ کہ بیوی کے ذمہ یہ فرض ہے کہ وہ گھر کے اندر کسی ایسے شخص کو آنے نہ دے جس کے آنے کو شوہر ناپسند کرتا ہو، حتیٰ کہ اگر بیوی کے کسی عزیز کا گھر میں آنا شوہر کو ناپسند ہو تو اس صورت میں اپنے عزیزوں کو بھی گھر میں آنے کی اجازت دینا بھی جائز نہیں۔ اور والدین کو بھی صرف اتنی اجازت ہے کہ ہفتہ میں ایک مرتبہ آ کر بیٹی کی صورت دیکھ لیں۔ اس سے تو شوہر ان کو روک نہیں سکتا۔ لیکن ان کے لیے بھی شوہر کی اجازت کے بغیر گھر میں ٹھہرنا اور رہنا جائز نہیں۔ اس لیے کہ حضور ﷺ نے صاف لفظوں میں فرمایا کہ جن کو تم ناپسند کرتے ہو ان کو آنے کی اجازت نہ دو، چاہے وہ کوئی بھی ہو۔

اور دوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ وہ بیویاں تمہارے بستروں کو استعمال کرنے کی اجازت نہ دیں، جن کو تم ناپسند کرتے ہو، بستر کے استعمال میں سب چیزیں داخل ہیں یعنی بستر پر بیٹھنا، بستر پر لیٹنا، بستر پر سونا یہ سب اس میں داخل ہیں۔

حضرت ام حبیبہ کا اسلام اور تعظیم رسول ﷺ

ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا حضور اقدس ﷺ کی زوجہ مطہرہ ہیں۔ حضرات صحابہ

(۱) سنن الترمذی، کتاب الرضاع، باب ماجاء فی حق المرأة علی زوجها، رقم: ۱۰۸۳، سنن ابن ماجه، کتاب النکاح، باب حق المرأة علی الزوج، رقم: ۱۸٤۱

کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات کے اندر نور بھرا ہوا ہے۔ یہ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بیٹی ہیں جنہوں نے تقریباً اکیس سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں گزارے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگیں لڑیں اور مکہ مکرمہ کے سرداروں میں سے تھے اور آخر میں فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہو کر صحابی بن گئے اور یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا کرشمہ تھا کہ کافروں کے اتنے بڑے سردار کی بیٹی حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا اور ان کے شوہر دونوں مسلمان ہو گئے، باپ مسلمانوں کی مخالفت اور ان کے ساتھ عداوت میں لگا ہوا ہے، اور بیٹی اور داماد دونوں مسلمان ہو گئے، ان دونوں کے مسلمان ہونے سے ابوسفیان کے کلیجے پر چھری چلتی تھی اور ان کو بیٹی اور داماد کا مسلمان ہونا برداشت نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ ان کو تکلیفیں پہنچانے کے درپے رہتے تھے۔ اس زمانے میں بہت سے مسلمان کافروں کی تکلیفوں سے تنگ آ کر حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والے مسلمانوں میں حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا اور ان کے شوہر بھی تھے۔ یہ دونوں وہاں جا کر رہنے لگے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت کے عجیب وغریب انداز ہیں، جب حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر کے ساتھ حبشہ میں قیام کیا تو کچھ دنوں کے بعد انہوں نے خواب میں دیکھا کہ میرے شوہر کی صورت بالکل بدل گئی ہے۔ اور مسخ ہو گئی ہے۔ جب یہ بیدار ہوئیں تو ان کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ میرے شوہر کے دین وایمان میں کچھ خلل آ جائے اس کے بعد جب کچھ دن گزرے تو اس خواب کی تعبیر سامنے آ گئی اور یہ ہوا کہ ان کے شوہر ایک عیسائی کے پاس جایا کرتے تھے اس کے پاس جانے کے نتیجے میں دل سے ایمان نکل گیا اور عیسائی بن گئے۔

اب حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا پر تو بجلی گر گئی، اسلام کی خاطر ماں باپ کو چھوڑا، وطن کو چھوڑا، سارے عزیز واقارب کو چھوڑا، اور آ کر اس دیار غیر میں مقیم ہو گئے۔ اور لے دے کر ایک شوہر جو ہمدرد اور دم ساز ہو سکتا تھا۔ وہ کافر ہو گیا، اب ان پر تو قیامت گزر گئی۔ اور کچھ دنوں کے بعد ان کے شوہر کا اسی حالت میں انتقال ہو گیا، اب یہ حبشہ کے اندر بالکل تنہا رہ گئیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا نکاح

جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں اس کی اطلاع ملی کہ ان کے شوہر عیسائی بن کر انتقال کر گئے ہیں اور حضرت ام حبیبہ دیار غیر میں اکیلی اور تنہا ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حبشہ کے بادشاہ نجاشی کو پیغام بھیجا کہ چونکہ ام حبیبہ دیار غیر میں اکیلی اور تنہا ہیں۔ ان کو میری طرف سے نکاح کا پیغام دے دو، چنانچہ نجاشی کی معرفت ان کو نکاح کا پیغام بھیجا گیا۔

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا خود اپنا واقعہ سناتی ہیں کہ ایک دن میں اسی بے بسی کے عالم میں گھر میں

بیٹھی تھی، اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو دیکھا کہ باہر ایک کنیز کھڑی ہوئی ہے۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے اس سے پوچھا کہ کہاں سے آئی ہو؟ اس کنیز نے جواب دیا کہ مجھے حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے بھیجا ہے (یہ وہی نجاشی ہیں جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر مسلمان ہو گئے تھے) انہوں نے پھر پوچھا کہ کیوں بھیجا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ مجھے اس لیے بھیجا ہے کہ آپ کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کا پیغام بھیجا ہے۔ اور نجاشی بادشاہ کی معرفت بھیجا ہے۔ حضرت ام حبیبہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتی ہیں کہ جس وقت یہ الفاظ میرے کان میں پڑے، اس وقت مجھے اس قدر مسرت اور حیرت ہوئی کہ میرے پاس اس وقت جو کچھ بھی تھا۔ وہ میں نے اٹھا کر کنیز کو دے دیا اور کہا کہ تو میرے لیے اتنی اچھی خبر لائی ہے۔ اس لیے یہ تیرا انعام ہے۔ اس کے بعد اس حالت میں نکاح ہوا کہ حضرت ام حبیبہ حبشہ ہی میں تھیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں تھے۔ اور پھر کچھ عرصہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مدینہ منورہ بلوانے کا انتظام فرمایا۔(۱)

متعدد نکاح کی وجہ

واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو متعدد نکاح فرمائے۔ ناحق شناس لوگ تو معلوم نہیں کیا کیا باتیں کرتے ہیں۔ لیکن ہر نکاح کے پیچھے بڑی عظیم الشان حکمتیں ہیں۔ اس نکاح میں دیکھ لیجیے کہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا حبشہ میں کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزار رہی تھیں۔ کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ اب اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی اس طرح دلداری نہ فرماتے تو ان کا کیا بنتا، آپ نے اس طریقے سے ان سے نکاح فرما کر ان کو مدینہ طیبہ بلوایا۔

غیر مسلم کی زبان سے تعریف

یہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے کہ جب وقت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح ہو گیا تو اس کی اطلاع مکہ مکرمہ میں حضرت ابوسفیان کو پہنچی، اور اس وقت حضرت ابوسفیان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن اور کافر تھے۔ جب ان کو یہ اطلاع ملی کہ میری بیٹی کا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو گیا ہے۔ اس وقت بیساختہ ان کی زبان پر جو جملہ آیا وہ یہ تھا کہ یہ خبر تو خوشی کی خبر ہے، اس لیے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جن کے پیغام کو رد کیا جائے۔ لہٰذا یہ تو خوش قسمتی کی بات ہے کہ ام حبیبہ (رضی اللہ عنہا) وہاں چلی گئیں۔

---

(۱) الاصابة فی تمییز الصحابة (۲۹۸/٤) لفظ "رملة"

معاہدۂ حدیبیہ کا خاتمہ

صلح حدیبیہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوسفیان کے درمیان جنگ بندی کا ایک معاہدہ ہوا تھا۔ کتب سیرت میں جس کی تفصیل موجود ہے۔ ایک سال تک حضرت ابوسفیان اور دوسرے کافروں نے اس معاہدے کی شرائط کی پابندی کی، لیکن ایک سال کے بعد انہوں نے عہد شکنی شروع کر دی۔ اس عہد شکنی کے نتیجے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان فرما دیا کہ اب ہم اس معاہدے کے پابند نہیں رہے۔ اس لیے اب ہم جب چاہیں گے مکہ مکرمہ پر حملہ کر دیں گے۔ کیونکہ ہمارے دشمنوں نے جب عہد کا پاس نہیں کیا تو اب ہم بھی اس کے پابند نہیں رہے، اس اعلان کے بعد حضرت ابوسفیان کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ کسی وقت بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ پر حملہ کر سکتے ہیں۔

آپ اس بستر کے لائق نہیں ہیں

ایک مرتبہ حضرت ابوسفیان شام سے واپس آ رہے تھے کہ مسلمانوں نے ان کو اور ان کے قافلے کو گرفتار کر لیا۔ حضرت ابوسفیان رات کے وقت میں چھپ چھپا کر مدینہ منورہ میں داخل ہوئے۔ اور یہ خیال ہوا کہ میری بیٹی تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں ہیں، لہٰذا میں ان سے بات کروں گا تو شاید میری جان بخشی ہو جائے۔ چنانچہ یہ چھپ کر حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں داخل ہو گئے۔ بیٹی نے ان کا استقبال کیا۔ جس وقت یہ گھر میں داخل ہوئے اس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر گھر میں بچھا ہوا تھا۔ حضرت ابوسفیان نے گھر میں داخل ہو کر اس بستر پر بیٹھنے کا ارادہ کیا۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا تیزی سے آگے بڑھیں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر ایک طرف ہٹا کر لپیٹ کر رکھ دیا۔

(حضرت) ابوسفیان کو بیٹی کا طرز عمل بڑا انوکھا اور عجیب محسوس ہوا اور ایک جملہ یہ کہا:

''رملہ! کیا یہ بستر میرے لائق نہیں ہے، یا میں اس بستر کے لائق نہیں ہو؟''

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا:

''ابا جان! بات یہ ہے کہ آپ اس بستر کے لائق نہیں ہیں اس واسطے کہ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر ہے اور جو آدمی مشرک ہو، میں اس کو اپنی زندگی میں اس بستر پر بیٹھنے کی اجازت نہیں دے سکتی''

اس پر (حضرت) ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) نے کہا:

''رملہ! مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم اتنی بدل جاؤ گے کہ اپنے باپ کو بھی اس بستر پر

بیٹھنے کی اجازت نہیں دوگی''(۱)

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا یہ عمل کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر اپنے باپ کو بھی بیٹھنے سے منع فرمایا۔ یہ درحقیقت اس حدیث پر عمل ہے کہ " لَّا یُوطِئْنَ فُرُشَکُمْ مَنْ تَکْرَھُوْنَ "، جن کو تم ناپسند کرتے ہو، ان لوگوں کو وہ بیویاں تمہارا بستر استعمال کرنے کی اجازت نہ دیں۔

خاوند کے بلانے پر سب کام چھوڑ دے

وَعَنْ أَبِیْ عَلِی طَلْقِ بْنِ عَلِیٍّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ:((اِذَا دَعَا الرَّجُلُ زَوْجَتَہٗ لِحَاجِتِہٖ فَلْتَأْتِہٖ وَاِنْ کَانَتْ عَلَی التَّنُّوْرِ))(۲)

حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب مرد اپنی بیوی کو اپنی حاجت کے لیے بلائے۔ تو اس عورت پر واجب ہے کہ وہ آجائے، خواہ وہ تنور پر بھی کیوں نہ ہو۔ مراد یہ ہے کہ اگرچہ وہ عورت روٹی پکانے کے کام میں مشغول ہو، اس وقت بھی اگر شوہر اپنی حاجت پوری کرنے کے لیے اس کو دعوت دے اور بلائے تو وہ انکار نہ کرے۔

نکاح جنسی تسکین کا حلال راستہ

ان سارے احکام کا مقصد درحقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مرد و عورت کے اندر فطری طور پر ایک جنسی جذبہ اور خواہش رکھی ہے۔ اور اس فطری جذبے اور خواہش کی تسکین کے لیے ایک حلال راستہ تجویز فرما دیا ہے، وہ ہے نکاح کا راستہ، اور شوہر بیوی کے تعلقات میں اس ضرورت کو پورا کرنا اولین اہمیت کا حامل ہے، اس لیے حلال کے سارے راستے کھول دیئے، تاکہ کسی بھی مرد و عورت کو حرام طریقے سے اس جذبہ اور خواہش کی تسکین کا خیال پیدا نہ ہو، بیوی کو شوہر سے تسکین ہو، اور شوہر کو بیوی سے تسکین ہو، تاکہ دوسروں کی طرف دیکھنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

نکاح کرنا آسان ہے

اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے نکاح کے رشتے کو بہت آسان بنایا۔ صرف مرد و عورت موجود ہوں،

(۱) الاصابة فی تمییز الصحابة (۲۹۸/٤) لفظ "رملہ"

(۲) سنن الترمذی، کتاب الرضاع، باب ماجاء فی حق الزوج علی المرأة، رقم: ۱۰۸۰

اور دو گواہ ہوں، اور وہ مرد عورت ان گواہوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول کر لیں۔ بس نکاح ہو گیا، حتیٰ کہ خطبہ نکاح پڑھنا بھی ضروری نہیں۔ البتہ خطبہ پڑھنا سنت ہے، اسی طرح کسی قاضی سے یا کسی اور سے نکاح پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے، اگر دوسرے سے پڑھوا لے تو یہ سنت ہے، لیکن اس کے بغیر بھی اگر مرد وعورت خود دو گواہوں کی موجوگی میں ایجاب وقبول کر لیں ایک کہے کہ میں نے تم سے نکاح کیا، اور دوسرا کہے کہ میں نے قبول کیا، بس! نکاح منعقد ہو گیا۔ نکاح کے لیے نہ تو مسجد میں جانے کی ضرورت ہے اور نہ درمیان میں تیسرے شخص کو ڈالنے کی ضرورت ہے تا کہ حلال کا راستہ آسان سے آسان تر ہو جائے۔

برکت والا نکاح

اور دوسری طرف یہ تاکید فرمائی کہ نکاح کا معاملہ اور نکاح کی تقریب سادگی اور آسانی کے ساتھ انجام دی جائے، کوئی رسم، کوئی شرط، کوئی لمبی چوڑی تقریب کرنے کی ضرورت نہیں۔ حدیث شریف میں فرمایا کہ جب اولاد بالغ ہو جائے تو اس کے نکاح کی فکر کرو، تا کہ اس کو حرام کی طرف جانے کی خواہش اور ضرورت پیدا نہ ہو، اور حلال کا راستہ آسان ہو جائے۔ ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((اَعْظَمُ النِّکَاحِ بَرَکَۃً اَیْسَرُہٗ مُؤْنَۃً))(۱)

سب سے زیادہ برکت والا نکاح وہ ہے جس میں بہت سے زیادہ آسانی ہو۔ اور سادگی ہو، نکاح کو جتنا پھیلایا جائے گا اور جتنا اس کے اندر دھوم دھڑکا ہو گا، اسی قدر اس میں برکت کم ہوتی چلی جائے گی۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا نکاح

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، یعنی ان دس خوش نصیب صحابہ میں سے ہیں جن کو حضور اقدس ﷺ نے دنیا ہی میں خوش خبری سنا دی تھی کہ یہ جنت میں جائیں گے، ایک مرتبہ جب حضور اقدس ﷺ کی مجلس میں حاضر ہوئے تو حضور اقدس ﷺ نے دیکھا کہ ان کی قمیص کے اوپر زرد نشان اور رنگ لگا ہوا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تمہاری قمیص پر یہ نشان کیسا لگا ہوا ہے؟ انہوں نے جواب میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے

(۱) مسند أحمد بن حنبل، حديث سيدة عائشة رضى الله عنها، رقم: ۲۳۳۸۸

ایک خاتون سے نکاح کرلیا ہے۔ اور نکاح کے وقت ایک خوشبو لگائی تھی۔ اور یہ خوشبو کا نشان ہے، حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ وَعَلَيْكَ أُوْلِمْ وَلَوْ بِشَاةٍ))

''اللہ تعالیٰ اس میں تمہارے لیے برکت عطا فرمائیں ولیمہ کرلو، چاہے ایک بکری سے کیوں نہ ہو''(۱)

اس حدیث میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، اور حضور ﷺ کے انتہائی قریبی صحابی ہیں، لیکن نکاح کی تقریب میں صرف یہ نہیں کہ آنحضرت ﷺ کو بلایا نہیں، بلکہ ذکر تک نہیں کیا۔ اور پھر جب خود حضور اقدس ﷺ نے رنگ کے بارے میں پوچھا تو اس کے جواب کے ضمن میں نکاح کی اطلاع دی۔ اور نکاح کی خبر سن کر حضور ﷺ نے یہ شکایت نہیں کی کہ تم اکیلے نکاح کر کے بیٹھ گئے۔ ہمیں بلایا تک نہیں۔ اس لیے کہ شریعت نے نکاح کی تقریب پر سرے سے کوئی شرط اور قید عائد نہیں کی۔

آج نکاح کو مشکل بنا دیا گیا ہے

حضرت جابر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں آئے، اور عرض کیا یا رسول اللہ! میں نے ایک خاتون سے نکاح کرلیا ہے۔(۲)

یہ حضور اقدس ﷺ کے بہت قریبی صحابہ میں سے تھے۔ اور ہر وقت حضور ﷺ سے ملتے رہتے تھے، لیکن نکاح میں شرکت کی دعوت نہیں دی۔ اس لیے کہ حضور اقدس ﷺ کے عہد مبارک میں اس کا عام رواج تھا کہ نکاح کے لیے کوئی خاص اہتمام نہیں کیا جاتا تھا یہ نہیں تھا کہ نکاح ہو رہا ہے تو ایک طوفان برپا ہے۔ مہینوں سے اس کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اور پورے خاندان میں اس کی دھوم

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب البيوع، باب ما جاء في قول الله تعالىٰ فإذا قضيت الصلاة، رقم: ۱۹۰۷ صحيح مسلم، كتاب النكاح، باب الصداق وجواز تعليم القرآن و خاتم حديث، رقم: ۲۵۵٦، سنن الترمذي، كتاب النكاح عن رسول الله، باب ما جاء في الوليمة، ۱۰۱٤، سنن النسائي، كتاب النكاح، باب التزويج على نواة من ذهب، رقم: ۳۲۹، سنن أبي داؤد، كتاب النكاح، باب قلة المهر، رقم: ۱۸۰٤، سنن ابن ماجه، كتاب النكاح، باب الوليمة، رقم ۱۸۹۷، مسند أحمد، رقم: ۱۲۲۲٤

(۲) صحيح البخاري، كتاب النفقات، باب عون المرأة زوجها في ولدها، رقم: ٤۹٤۸، صحيح مسلم، كتاب الرضاع، باب استحباب نكاح البكر، رقم: ۲٦٦٤، مسند أحمد، رقم: ۱٤٤۸۲

ہے اس کے بغیر نکاح نہیں ہو سکتا۔ شریعت نے نکاح کو جتنا آسان کیا تھا، ہم نے اس کو اپنی غلط رسموں کے ذریعہ اتنا ہی مشکل بنا دیا، اس کا نتیجہ دیکھ لیجیے کہ لڑکیاں بغیر نکاح کے گھروں میں بیٹھی ہیں۔ وہ اس لیے گھروں میں بیٹھی ہیں کہ جہیز مہیا کرنے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ یا عالی شان تقریب کرنے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ اب ان کاموں کے لیے پیسے جمع کرنے کے لیے حلال و حرام ایک ہو رہا ہے۔ یہ سب رسومات ہم نے ہندوؤں سے اور عیسائیوں سے لے لی ہیں۔ اور حضور ﷺ نے سنت کا جو طریقہ ہمارے لیے مقرر فرمایا تھا وہ ہم نے چھوڑ دیا اور آج اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حلال کے راستے بند ہیں، حلال طریقے سے خواہش پوری کرنے کے لیے بہت مال و دولت والا ہونا ضروری ہے لاکھوں روپیہ ہو۔ تب جا کر نکاح کر سکے گا۔ ورنہ نہیں، اور دوسری طرف حرام کے ذرائع چاروں طرف چوپٹ کھلے ہیں۔ جب چاہے، جس طرح چاہے پوری کر لے۔ دن رات گھر میں ٹی وی چل رہے ہیں، فلمیں آ رہی ہیں، اور اس کے ذریعہ نفسانی شہوانی جذبات کو برانگیختہ کیا جا رہا ہے۔ ان کو بھڑ کایا جا رہا ہے، اگر بازار میں نکلو تو آنکھوں کو پناہ ملنی مشکل ہے۔ اور اس کے نتیجے میں فحاشی، عریانی، بے غیرتی، بے حیائی اور بے پردگی کی لعنت مسلط ہو رہی ہیں۔ لہٰذا ان رسومات نے ہمارے معاشرے کو تباہی کے کنارے پر پہنچا دیا ہے۔

جہیز موجودہ معاشرے کی ایک لعنت

اس معاملے میں سب سے زیادہ ذمہ داری ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جو کھاتے پیتے، امیر اور دولت مند گھرانے کہلاتے ہیں۔ اس عذاب سے نجات اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کھاتے پیتے اور امیر کہلانے والے لوگ اس بات کا اقدام نہ کریں کہ ہم اپنے خاندان میں شادیاں اور نکاح سادگی کے ساتھ کریں گے، اور ان غلط رسموں کو ختم کریں گے، اس وقت تک تبدیلی نہیں آئے گی، اس لیے کہ ایک غریب آدمی تو یہ سوچتا ہے کہ مجھے اپنی سفید پوشی برقرار رکھتے ہوئے اور اپنی ناک اونچی رکھنے کے لیے یہ کام کرنا ہی ہے۔ اس کے بغیر میرا گزارہ نہیں ہوگا، اگر لڑکی کو جہیز نہیں دیں گے تو سسرال والے طعنے دیا کریں گے کہ کیا لے کر آئی تھی۔ آج جہیز کو شادی کا ایک لازمی حصہ سمجھ لیا گیا ہے۔ گھر کا سامان مہیا کرنا جو شوہر کے ذمے واجب تھا۔ وہ آج بیوی کے باپ کے ذمے واجب ہے، گویا کہ وہ باپ اپنی بیٹی اور اپنے جگر کا ٹکڑا بھی شوہر کو دے دے، اور اس کے ساتھ لاکھوں روپیہ بھی دے، گھر کا فرنیچر مہیا کرے اور اس طرح وہ دوسرے کا گھر آباد کرے۔ شریعت میں اس کی کوئی اصل موجود نہیں۔ ٹھیک ہے اگر کوئی باپ اپنی بیٹی کو کوئی چیز دینا چاہتا ہے تو وہ سادگی کے ساتھ دے دے، بہرحال جو متمول اور کھاتے پیتے

گھرانے کہلاتے ہیں۔ ان پر یہ ذمہ داری زیادہ عائد ہوتی ہے کہ وہ جب تک اس سادگی کو نہیں اپنائیں گے اور اس کو ایک تحریک کی شکل میں نہیں چلائیں گے اس وقت تک اس عذاب سے نجات ملنی مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے یہ بات ہمارے دلوں میں ڈال دے۔ آمین

عورت کو حکم دیتا کہ وہ شوہر کو سجدہ کرے

وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:
((لَوْ كُنْتُ آمِرًا أَحَدًا أَنْ يَسْجُدَ لِاَحَدٍ لَاَمَرْتُ الْمَرْأَةَ أَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا))(۱)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر میرے لیے کسی کو یہ حکم دینا جائز ہوتا کہ ایک شخص دوسرے کو سجدہ کرے تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے''

لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسرے کے آگے سجدہ کرنا جائز نہیں، لہٰذا میں یہ سجدہ کرنے کا حکم نہیں دیتا۔ لیکن اگر اس دنیا میں کسی انسان کے لیے دوسرے انسان کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔

یہ دو دلوں کا تعلق ہے

زندگی کے سفر میں جہاں مرد و عورت ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے مرد کو ''امیر'' اور ''نگران'' بنایا ہے۔ اس ''امارت'' کے علاوہ اور جتنی امارتیں ہیں وہ سب وقتی اور عارضی ہیں۔ آج ایک آدمی امیر اور حاکم بن گیا۔ یا ملک کا بادشاہ بنا دیا گیا لیکن اس کی حاکمیت اور بادشاہت اور امارت ایک مخصوص وقت تک کے لیے ہے۔ کل تک حاکم اور امیر بنا ہوا تھا، اور آج وہ جیل خانے میں ہے، کل تک بادشاہ بنا ہوا تھا۔ اور آج دو کوڑی کے لیے پوچھنے کو تیار نہیں، لہٰذا یہ امارتیں اور حکومتیں آنی جانی چیزیں ہیں۔ آج ہیں، کل نہیں۔ لیکن میاں بیوی کا تعلق زندگی بھر کا تعلق ہے۔ دم دم کا ساتھ ہے، ایک ایک لمحے کی رفاقت ہے، لہٰذا اس تعلق کے نتیجے میں مرد کو جو امارت حاصل ہوتی ہے، وہ مرتے دم تک برقرار رہتی ہے یا جب تک نکاح کا رشتہ برقرار ہے۔ اس لیے یہ ''امارت'' عام امارتوں سے مختلف ہے۔ دوسری امارتوں میں حاکم کا محکوم کے ساتھ، امیر کا رعیت کے ساتھ صرف ایک

(۱) سنن الترمذی، کتاب الرضاع، باب ماجاء فی حق الزوج علی المرأة، رقم: ۱۰۷۹، سنن ابن ماجه، کتاب النکاح، باب حق الزوج علی المرأة، رقم: ۱۸۴۳، مسند أحمد، رقم: ۱۲۱۵۳

ضابطے کا دستوری اور قانونی تعلق ہوتا ہے، لیکن میاں بیوی کا تعلق محض ضابطے، قانون اور محض خانہ پری کا تعلق نہیں ہے۔ بلکہ یہ دلوں کا جوڑ ہے، یہ دلوں کا تعلق ہے، جس کے اثرات ساری زندگی پر محیط ہیں۔ اسی واسطے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے، کیونکہ وہ اس کی زندگی بھر کے سفر کا امیر ہے۔

سب سے زیادہ قابل محبت ہستی

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے فرائض کی طرف توجہ دلاتے ہیں، جب شوہر سے خطاب تھا اس وقت ساری باتیں عورت کے حقوق کے بارے میں بیان کی جارہی تھیں کہ عورت کے یہ حقوق ہیں، عورت کے یہ حقوق ہیں۔ اب جب عورت سے خطاب ہو رہا ہے تو عورت کو اس کے فرائض کی طرف متوجہ کیا جارہا ہے کہ تمہیں یہ سمجھنا چاہئے کہ اللہ اور اللہ کے رسول کے بعد تمہارے لیے سب سے زیادہ قابل احترام اور سب سے زیادہ قابل محبت ہستی اس روئے زمین پر تمہارا شوہر ہے۔ جب تک یہ بات نہیں سمجھو گی، شوہر کے حقوق صحیح طور پر ادا نہیں کر پاؤ گی۔ البتہ اللہ اور اللہ کے رسول کا حکم سب پر مقدم ہے، جب اللہ اور اللہ کے رسول کا حکم آجائے تو پھر نہ باپ کی اطاعت، نہ ماں کی اطاعت، اور نہ شوہر کی اطاعت، لیکن اللہ اور اللہ کے رسول کے بعد شوہر کا درجہ ہے۔ اس کو خوش کرنے کی فکر کرو اور اس کے حقوق ادا کرنے کی فکر کرو، اس کی اطاعت کی فکر کرو۔

جدید تہذیب کی ہر چیز الٹی ہے

آج ہمارے دور میں ہر چیز کے اندر الٹی گنگا بہنے لگی ہے، حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ آج کی تہذیب میں ہر چیز الٹی ہوگئی ہے، یہاں تک کہ پہلے چراغ تلے اندھیرا ہوا کرتا تھا۔ اور اب بلب کے اوپر اندھیرا ہوتا ہے اور اس درجہ الٹی ہوگئی ہے کہ گھر کا کام کاج اگرچہ شرعاً عورت کے ذمے نہ ہو، لیکن حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی سنت ضرور ہے، اس لیے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا گھر کا سارا کام خود اپنے ہاتھ سے کیا کرتی تھیں۔ اور دوسری طرف عورت کو شوہر کی اطاعت کا بھی حکم دیا گیا کہ ان کی اطاعت کرو۔ اب اگر ایک عورت گھر کا کام کاج کرتی ہے اور اپنے شوہر اور بچوں کے لیے کھانا پکاتی ہے تو اس پر اس کے لیے اعلیٰ ترین اجر و ثواب لکھا جاتا ہے۔ لیکن آج کی الٹی تہذیب کا فیصلہ یہ ہے کہ عورت کا گھر میں بیٹھنا اور گھر کا کام کاج تو رجعت پسندی، دقیانوسیت اور پرانا طریقہ ہے، اور یہ عورت کو گھر کی چار دیواری میں قید کرنا ہے، لیکن اگر وہی عورت ہوائی جہاز میں ایئر ہوسٹس

بن کر چار سو آدمیوں کو کھانا کھلائے، اور ان کے سامنے ٹرے سجا کر لے جائے، اور چار سو آدمیوں کی ہولناک نگاہوں کا نشانہ بنے، ایک شخص اس سے کوئی خدمت لے رہا ہے، دوسرا شخص اس سے کوئی خدمت لے رہا ہے، اور بعض اوقات بلا وجہ خدمت لیتے ہیں، کوئی خاص ضرورت نہیں ہوتی، کسی نے بیل بجا کر اس کو بلایا، اور اس سے کہا کہ یہ تکیہ اٹھا کر دے دلو، اس خدمت کا نام آج کی جدید تہذیب میں آزادی ہے اور اگر وہی عورت گھر میں اپنے شوہر اپنے بچوں اور اپنے بہن بھائیوں کے لیے یہ خدمت انجام دے تو اس کا نام ''دقیانوسیت'' ہے اور یہ ترقی کے خلاف ہے۔

اگر وہی عورت ہوٹل میں ''ویٹرس'' بنی ہوئی ہے، اور دن رات لوگوں کی خدمت انجام دے رہی ہے، کھانا کھلا رہی ہے، تو وہ ''آزادی نسواں'' کا ایک حصہ ہے، یا وہ کسی کی سیکریٹری بن جائے۔ یا وہ عورت کسی کی اسٹینو گرافر بن جائے یہ تو آزادی ہے اور اگر یہی عورت کام گھر میں رہ کر اپنے شوہر اپنے بچوں اور ماں باپ کے لیے یہ کام کرے تو اس کو ''دقیانوسیت'' کا نام دے دیا گیا ہے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا نام خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

عورت کی ذمہ داری

حضور اقدس ﷺ فرما رہے ہیں کہ عورت کے ذمے دنیا کے کسی فرد کی خدمت واجب نہیں، نہ اس کے ذمے کوئی ذمہ داری ہے اور نہ اس کے کاندھوں پر کسی کی ذمہ داری کا بوجھ ہے، تم ہر بوجھ اور ہر ذمہ داری سے آزاد ہو۔ لیکن صرف ایک بات ہے کہ تم اپنے گھر میں قرار سے رہو، اور اپنے شوہر کی اطاعت کرو، اور اپنے بچوں کی تربیت کرو، یہ تمہارا فریضہ ہے اور اس کے ذریعہ تم قوم کی تعمیر کر رہی ہو۔ اور اس کی معمار بن رہی ہو۔ حضور اقدس ﷺ نے تمہیں عزت کا یہ مقام دیا تھا۔ اب تم میں سے جو چاہے اس عزت کے مقام کو اختیار کرے، اور جو چاہے ذلت کے مقام کو اختیار کرے۔ جو آنکھوں سے نظر آ رہا ہے۔

وہ عورت سیدھی جنت میں جائے گی

وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((أَيُّمَا امْرَأَةٍ مَاتَتْ وَزَوْجُهَا عَنْهَا رَاضٍ دَخَلَتِ الْجَنَّةَ))(۱)

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الرضاع، باب ماجاء فی حق الزوج علی المرأة، رقم: ۱۰۸۱، سنن ابن ماجه، کتاب النکاح، باب حق الزوج علی المرأة، رقم: ۱۸۴۴

''حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس عورت کا انتقال اس حالت میں ہوا کہ اس کا شوہر اس سے خوش ہو تو وہ سیدھی جنت میں جائے گی''

وہ تمہارے پاس چند دن کا مہمان ہے

عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:
((لَا تُؤْذِیْ امْرَأَةٌ زَوْجَهَا فِی الدُّنْيَا اِلَّا قَالَتْ زَوْجَتُهُ مِنَ الْحُوْرِ الْعِيْنِ لَا تُؤْذِيْهِ قَاتَلَكِ اللّٰهُ! فَاِنَّمَا هُوَ عِنْدَكِ دَخِيْلٌ يُوْشِكُ أَنْ يُفَارِقَكِ اِلَيْنَا))(۱)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کبھی کوئی بیوی اپنے شوہر کو کوئی تکلیف پہنچاتی ہے۔ (اس لیے کہ بسا اوقات عورت کی طبیعت سلامتی کی حامل نہیں ہوتی۔ اور اس کی طبیعت میں فساد اور بگاڑ ہوتا ہے۔ اور اس فساد اور بگاڑ کے نتیجے میں اپنے شوہر کو تکلیف پہنچا رہی ہے) تو اس کے شوہر کی جو بیویاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے جنت میں حوروں کی شکل میں اس کے لیے مقدر فرمائی ہیں، وہ حوریں جنت سے اس دنیاوی بیوی سے خطاب کر کے کہتی ہیں:

''تو اس کو تکلیف مت پہنچا، اس لیے کہ یہ تمہارے پاس چند دن کا مہمان ہے، اور عنقریب وہ تم سے جدا ہو کر ہمارے پاس آ جائے گا۔''

یہ بات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فساد طبیعت رکھنے والی بیوی کو متوجہ کر کے فرما رہے ہیں کہ تم اپنے شوہر کو جو تکلیف پہنچا رہی ہو۔ اس سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اس لیے کہ دنیا میں تو اس کو جو چاہو گی تکلیف پہنچا دو گی۔ لیکن آخرت میں اللہ تبارک وتعالیٰ اس کا رشتہ ایسی ''حورعین'' کے ساتھ قائم فرمائیں گے، جو ان شوہروں سے اتنی محبت کرتی ہیں کہ ان کے دل کو ابھی سے اس بات کی تکلیف ہو رہی ہے کہ دنیا میں ہمارے شوہر کے ساتھ یہ کیسا تکلیف پہنچانے والا معاملہ کیا جا رہا ہے۔

مردوں کے لیے شدید ترین آزمائش

عَنْ اُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الرضاع، باب ماجاء فی کراهية الدخول علی المغيبات، رقم: ۱۰۹۴، مسند أحمد، رقم: ۲۱۰۸۵

((مَاتَرَكْتُ بَعْدِىْ فِتْنَةً هِىَ أَضَرُّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ))(۱)

''حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے اپنے بعد کوئی فتنہ ایسا نہیں چھوڑا جو مردوں کے لیے زیادہ نقصان دہ ہو بنسبت عورتوں کے فتنے کے''

عورتوں کا فتنہ اس دنیا میں مردوں کے لیے شدید ترین فتنہ ہے، اس حدیث کی اگر تشریح لکھی جائے تو ایک ضخیم کتاب لکھی جاسکتی ہے کہ یہ عورتیں مردوں کے لیے کس کس طریقے سے فتنہ ہیں۔

عورت کس طرح آزمائش ہے؟

فتنہ کے معنی ہیں ''آزمائش'' اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو اس دنیا میں مردوں کی آزمائش کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ اور یہ عورت کس کس طریقے سے آزمائش ہے؟ ایک مختصر مجلس میں اس کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ یہ عورت اس طریقے سے بھی آزمائش ہے جس طریقے سے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ پیش آئی۔ یعنی مرد کی طبیعت میں عورت کی طرف کشش کا ایک میلان رکھ دیا گیا۔ اب اس کے حلال راستے بھی بیان کردیئے، اور حرام راستے بھی بیان کردیئے۔ اب آزمائش اس طرح ہے کہ یہ مرد حلال کا راستہ اختیار کرتا ہے یا حرام کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ یہ مرد کے لیے سب سے بڑی آزمائش ہے۔

اس کے ذریعہ دوسری آزمائش اس طرح ہے کہ یہ بیوی جو اس کے لیے حلال ہے۔ اس کے ساتھ کیسا معاملہ کرتا ہے، اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔ ویسا سلوک کرتا ہے یا اس کی حق تلفی کرتا ہے۔

تیسری آزمائش یہ ہے کہ یہ شخص بیوی کی محبت اور اس کے حقوق کی ادائیگی میں ایسا غلو اور انہماک تو نہیں کرتا کہ اس کے مقابلے میں دین کے احکام کو پس پشت ڈال دے، یہ تو اس نے سن لیا کہ بیوی کو خوش کرنا چاہئے اور اس کے ساتھ حسن سلوک کرنا چاہئے۔ لیکن اب حرام اور ناجائز کاموں میں بھی اس کی دلجوئی کر رہا ہے۔ اور اس کی صحیح دینی تربیت نہیں کر رہا ہے۔ اس طرح بھی یہ آزمائش ہے۔ اس لیے مرد کو دونوں طرف خیال رکھنا ہے۔ ایک طرف محبت کا تقاضا یہ ہے کہ بیوی پر روک

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب مایتقی من شؤم المرأة، رقم: ٤٨٠٦، صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب أکثر أهل الجنة الفقراء وأکثر أهل النار النساء، رقم: ٤٩٢٣، سنن الترمذی، کتاب الأدب عن رسول الله، باب ماجاء فی تحذیر فتنة النساء، رقم: ٢٧٥٤، سنن ابن ماجه، کتاب الفتن، باب فتنة النساء، رقم: ٣٩٨٨، مسند أحمد، رقم: ٢٥٨٢٨

ٹوک نہ کرے، اور دوسری طرف دین کا تقاضا یہ ہے خلاف شرع کاموں پر روک ٹوک کرے۔ غرض آزمائشوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی توفیق ہی سے انسان ان تمام آزمائشوں سے سرخروئی کے ساتھ اس طرح نکل سکتا ہے کہ اس کے حقوق بھی ادا کرے۔ اس کی تعلیم و تربیت کا بھی خیال رکھے۔ اس کے نفع و نقصان کا بھی خیال رکھے، اور حرام کی طرف بھی متوجہ نہ ہو، ان تمام باتوں کا خیال کرنا صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کی خاص توفیق ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے، اس لیے نبی کریم ﷺ نے ایک دعا تلقین فرمائی ہے۔ جو آپ کی ماثور دعاؤں میں سے ہے:

((اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ النِّسَآءِ))(۱)

''اے اللہ! میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں عورتوں کے فتنے سے''

اشارہ اس بات کی طرف کر دیا کہ اس آزمائش میں کھرا اترنا اور سرخرو ہونا اللہ تعالیٰ کی خاص توفیق کے بغیر ممکن نہیں، لہٰذا انسان کو اللہ تعالیٰ سے رجوع کرتے رہنا چاہئے کہ اے اللہ! مجھے اس آزمائش میں پورا اتار دیجیے، بہکنے اور پھسلنے سے اور غلطی کا مرتکب ہونے سے بچا لیجیے، اس لیے اس ماثور دعا کو اپنی دعاؤں میں شامل کر لینا چاہئے۔

ہر شخص نگہبان ہے

عَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:

((كُلُّكُمْ رَاعٍ، وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ))(۲)

یہ بڑی عجیب و غریب حدیث ہے اور جوامع الکلم میں سے ہے۔ اور ہم میں سے ہر شخص اس حدیث کا مخاطب ہے، چنانچہ فرمایا کہ تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے۔ اور ہر شخص سے اس کے زیر نگہبان اشیاء اور افراد کے بارے میں سوال ہوگا، یعنی جن چیزوں کی نگہبانی اس کے سپرد کی گئی تھی۔ اس کے بارے میں اس سے سوال ہوگا۔

''راعی'' کے اصل معنی ہوتے ہیں ''نگہبان'' چرواہے کو بھی ''راعی'' کہتے ہیں۔ اس لیے کہ

---

(۱) کنز العمال، رقم: ۳۶۸۷ (۱۸۹/۲)، جامع الاحادیث رقم: ۵۰۴۳

(۲) صحیح البخاری، کتاب الجمعة، باب الجمعة فی القریٰ والمدن، رقم: ۸۴۴، صحیح مسلم، کتاب الإمارة، باب فضیلة الإمام، عقوبة الجائر والحث علی الرفق، رقم: ۳۴۰۸، سنن الترمذی، کتاب الجهاد، باب ماجاء فی الإمام، رقم: ۱۶۲۷، سنن أبی داؤد، کتاب الخراج والإمارة والفئی، باب مایلزم الإمام من حق الرعیة، رقم: ۲۵۳۹، مسند أحمد، رقم: ۴۹۲۰

وہ بکریوں کی نگہداشت کرتا ہے۔ اور ''راعی'' کے معنی ''حاکم'' کے بھی ہوتے ہیں، اور حاکم کے جو ماتحت ہوتے ہیں۔ ان کو ''رعیت'' کہا جاتا ہے۔ اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر شخص ''راعی'' ہے۔ اور ہر شخص سے اس کی ''رعیت'' کے بارے میں سوال ہوگا کہ ان کی نگہبانی تم نے کس طرح کی؟

''امیر'' رعایا کا نگہبان ہے

((وَالْاَمِیْرُ رَاعٍ))

ہر امیر اپنے زیر نگہبانی افراد کا ''راعی'' اور ''نگہبان'' ہے۔ اور اس سے سوال ہوگا کہ تم نے ان کی کیسی نگہبانی کی۔ ''امیر'' کے بارے میں اسلام کا تصور یہ نہیں ہے کہ وہ امارت کا تاج سر پر لگا کر لوگوں سے الگ ہو کر بیٹھ جائے، بلکہ امیر کا تصور یہ ہے کہ وہ راعی ہے۔ اسی واسطے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر دریائے فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا مر جائے تو مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ قیامت کے روز مجھ سے سوال ہوگا کہ اے عمر! تیری حکومت میں ایک کتا بھوکا مر گیا تھا۔

''خلافت'' ذمہ داری کا ایک بوجھ

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ شہادت سے پہلے زخمی ہوئے تو لوگوں نے کہا کہ آپ اپنے بعد خلیفہ بنانے کے لیے کسی کو نامزد کر دیں۔ اس وقت لوگوں نے آپ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا نام لیا کہ ان کو خلافت کے لیے نامزد فرما دیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بلا شبہ جلیل القدر صحابی تھے۔ ان کے علم و فضل، تقویٰ، اخلاص کسی چیز میں کسی کو کوئی شک نہیں ہوسکتا۔ جب لوگوں نے حضرت فاروق اعظم کے سامنے ان کے بیٹے کا نام لیا تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے پہلے تو ایک جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ تم میرے بعد ایسے شخص کو مجھ سے خلیفہ نامزد کرانا چاہتے ہو جس کو اپنی بیوی کو طلاق دینا بھی نہیں آتا۔

جس کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں ایک مرتبہ اپنی اہلیہ کو ایسی حالت میں طلاق دے دی تھی، جب ان کی اہلیہ ماہواری کی حالت میں تھیں، اور ماہواری کی حالت میں طلاق دینا ناجائز ہے۔ ان کو یہ مسئلہ معلوم نہیں تھا۔ اس لیے طلاق دے دی۔ بعد میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس طلاق سے رجوع کر لو۔ چنانچہ انہوں نے اس طلاق سے رجوع کر لیا۔ اس واقعہ کی طرف حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اشارہ فرمایا کہ تم مجھ سے ایسے شخص کو خلیفہ بنوانا چاہتے ہو جسے اپنی بیوی کو طلاق دینی بھی نہیں آتی۔ میں اس کو کیسے خلیفہ بنا دوں؟

لوگوں نے پھر اصرار کیا اور کہا حضرت! وہ قصہ آیا گیا ہو گیا۔ مسئلہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے ایسا کر لیا تھا۔ اس واقعہ کی وجہ سے وہ خلافت کی اہلیت سے تو نہیں نکلے، بلکہ وہ اس کے اہل ہیں، آپ ان کو بنا دیں۔ اس کے جواب میں جو جملہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا، وہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ فرمایا کہ بات اصل میں یہ ہے کہ خلافت کا پھندا خطاب کی اولاد میں سے ایک ہی شخص کے گلے میں پڑ گیا تو کافی ہے۔ اب میں اپنے خاندان میں سے کسی اور فرد کے گلے میں یہ پھندا ڈالنا نہیں چاہتا۔ اس لیے یہ امارت اور خلافت درحقیقت ذمہ داری کا بہت بڑا بوجھ ہے۔ اور آخرت میں جب اللہ تعالیٰ کے سامنے جا کر حساب کتاب دوں تو اگر برابر سرابر بھی چھوٹ جاؤں تو بہت غنیمت سمجھوں گا۔

یہ ہے امیر کا تصور، اس کے راعی ہونے کا تصور، کہ اس نے اس امارت کے حق کو کیسے ادا کیا۔

مرد، بیوی بچوں کا نگہبان ہے

((وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلٰی أَھْلِ بَیْتِہٖ))

یعنی مرد اپنے گھر والوں کا راعی اور نگہبان ہے۔ گھر والوں میں بیوی اور بچے جو اس کے ماتحت ہیں جس فیملی کا وہ سربراہ ہے، وہ سب آ گئے۔ ہر مرد سے اس کے بارے میں سوال ہو گا کہ اس گھرانے کو تمہارے زیر انتظام دیا گیا تھا۔ بیوی بچے تھے۔ ان کے ساتھ تمہارا کس طرح معاملہ رہا؟ اور ان کی کیسی نگہبانی کی؟ ان کے حقوق کیسے ادا کیے؟ اور کیا تم نے اس بات کی نگہبانی کی کہ وہ دین پر چل رہے ہیں یا نہیں؟ کہیں وہ جہنم کی طرف تو نہیں جا رہے؟ یہ کام تم نے کیا یا نہیں؟ اس کام کا خیال تمہارے دل میں آیا یا نہیں؟ قیامت کے روز مرد سے ان تمام چیزوں کے بارے میں سوال ہو گا، جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا﴾(۱)

"اے ایمان والو! اپنے آپ کو بھی آگ سے بچاؤ، اور اپنے گھر والوں کو بھی آگ سے بچاؤ"

ایسا کرنا درست نہیں کہ خود تو آگ سے بچ کر بیٹھ گئے، خود تو نماز بھی پڑھ رہے ہیں اور روزہ بھی رکھ رہے ہیں۔ فرائض، واجبات اور نوافل و تسبیحات سب ادا ہو رہے ہیں۔ اور دوسری طرف

(۱) التحریم: ٦

اولاد غلط راستے پر جا رہی ہے، اس کی کوئی فکر نہیں ہے۔ اس کا کوئی خیال نہیں، تو پھر یاد رکھو، قیامت کے روز تم سوال سے بچ نہیں سکو گے تم سے بھی سوال ہوگا، اور اس کا عذاب بھی ہوگا کہ تم نے اپنا فریضہ کیوں انجام نہیں دیا تھا؟ اس لیے فرمایا کہ مرد اپنے گھر والوں کے لیے "راعی" ہے۔

"عورت" شوہر کے گھر اور اس کی اولاد کی نگہبان ہے

((وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلٰى بَيْتِ زَوْجِهَا وَوَلَدِهِ))

"اور عورت اپنے شوہر کے گھر پر اور اس کی اولاد پر نگہبان ہے"

گویا عورت کو دو چیزیں سپرد کی گئی ہیں: ایک شوہر کا گھر، دوسرے اس کی اولاد، یعنی گھر کی حفاظت کرے۔ گھر کا انتظام صحیح رکھے۔ گھر کے معاملات کی دیکھ بھال صحیح کرے، اور دوسرے اولاد کی دیکھ بھال صحیح کرے۔ دنیوی دیکھ بھال بھی، اور دینی دیکھ بھال بھی، یہ عورت کے فرائض میں داخل ہے۔ اور اس حدیث میں ہر ایک کے فرائض بیان کر دیئے گئے ہیں۔

خواتین حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی سنت اختیار کریں

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جنت کی خواتین کی سردار ہیں نکاح کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئیں تو حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے آپس میں یہ طے کر لیا کہ حضرت علی گھر کے باہر کے کام کریں گے، اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا گھر کے اندر کے کام کریں گی، چنانچہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بڑی محنت سے گھر کے کام انجام دیتی تھیں۔ اور بڑے شوق و ذوق سے کرتی تھیں، اور اپنے شوہر کی خدمت کرتی تھیں۔ لیکن محنت کا کام بہت زیادہ ہوتا تھا۔ وہ زمانہ آج کل کے زمانے کی طرح تو تھا نہیں آج کل تو بجلی کا سوئچ آن کر دیا اور کھانا تیار ہو گیا۔ بلکہ کھانا تیار کرنے کے لیے چکی کے ذریعہ آٹا پیستیں، تندرو کے لیے لکڑیاں کاٹ کر لاتیں اور تندور سلگاتیں۔ پھر روٹی پکاتیں۔ ایک لمبا چوڑا عمل تھا، جس میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بڑی مشقت اٹھانا پڑتی تھی، اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بڑے شوق و ذوق سے یہ مشقت اٹھاتیں تھیں۔ لیکن جب غزوہ خیبر کے موقع پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بہت مال غنیمت آیا، اس مال غنیمت میں غلام اور باندیاں بھی تھیں چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام میں ان کو تقسیم کرنا شروع کیا تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کسی نے کہا کہ آپ بھی جا کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ دیں کہ ایک کنیز اور باندی آپ کو بھی دے دیں۔ چنانچہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں حاضر ہوئیں۔ اور ان سے کہا کہ آپ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کہیں کہ چکی پیستے پیستے میرے ہاتھوں

پر نشانات پڑ گئے ہیں، اور پانی کی مشک اٹھاتے اٹھاتے سینے پر نیل پڑ گئے ہیں۔ اس وقت چونکہ مال غنیمت میں اتنے سارے غلام اور باندیاں آئی ہیں، کوئی غلام یا باندی اگر مجھے مل جائے تو میں اس مشقت سے نجات پالوں، یہ کہہ کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا واپس اپنے گھر آگئیں۔

جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لائے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کی صاحب زادی حضرت فاطمہ تشریف لائیں تھیں۔ اور یہ فرمارہی تھیں، آخر باپ تھے، اور جب ایک باپ کے سامنے چہیتی بیٹی یہ جملہ کہے کہ چکی پیستے پیستے میرے ہاتھوں میں گڑھے پڑ گئے ہیں۔ اور پانی کی مشک اٹھانے سے سینے پر نیل کے نشان آگئے ہیں۔ آپ اندازہ لگائیں کہ اس وقت باپ کے جذبات کا کیا عالم ہوگا۔ لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے گھر بلایا، اور فرمایا: فاطمہ! تم نے مجھ سے باندی یا غلام کی درخواست کی ہے۔ لیکن جب تک سارے اہل مدینہ کو غلام اور باندی میسر نہ آجائیں، اس وقت تک میں محمد کی بیٹی کو غلام اور باندی دینا پسند نہیں کرتا۔

خواتین کے لیے نسخہ کیمیا "تسبیح فاطمی"

البتہ میں تمہیں ایک ایسا نسخہ بتاتا ہوں جو تمہارے لیے غلام اور باندی سے بہتر ہوگا، وہ نسخہ یہ ہے کہ جب تم رات کے وقت بستر پر لیٹنے لگو تو اس وقت ۳۳ مرتبہ "سبحان اللہ" ۳۳ مرتبہ "الحمد للہ" اور ۳۴ مرتبہ "اللہ اکبر" پڑھ لیا کرو، یہ تمہارے لیے غلام اور باندی سے زیادہ بہتر ہوگا۔ بیٹی بھی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی تھی۔ پلٹ کر کچھ نہیں کہا بلکہ جو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسی پر مطمئن ہو گئیں۔ اور واپس تشریف لے گئیں۔ اسی وجہ سے اس تسبیح کو "تسبیح فاطمی" کہا جاتا ہے۔ (۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی کو خواتین کے لیے ایک مثال بنا دیا کہ بیوی ایسی ہو۔ قانونی اعتبار سے خواہ کچھ بھی حق ہو۔ لیکن سنت یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر کے گھر کی نگہبان ہے۔ اور اس نگہبان ہونے کی وجہ سے وہ اس کے کاموں کو اپنا کام سمجھ کر انجام دے رہی ہے۔

اولاد کی تربیت ماں کے ذمہ ہے

اور وہ عورت صرف گھر کی نگہبان نہیں ہے۔ بلکہ اس کی اولاد کی بھی نگہبان ہے۔ اولاد کی پرورش، اولاد کی خدمت، اولاد کی تربیت اور اس کی تعلیم کی ذمہ داری حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت پر ڈالی ہے۔ اگر اولاد کی تربیت صحیح نہیں ہو رہی ہے۔ ان کے اندر اسلامی آداب نہیں آرہے ہیں۔ تو

(۱) جامع الأصول (۱۰۵/٦)

اس کے بارے میں پہلے عورت سے سوال ہوگا، اور بعد میں مرد سے ہوگا۔ اس لیے کہ ان چیزوں کی پہلی ذمہ داری عورت کی ہے۔ لہٰذا عورت سے سوال ہوگا کہ تمہاری گود میں پلنے والے بچوں میں دین وایمان کیوں پیدا نہیں ہوا؟ ان کے دلوں میں اسلامی آداب کیوں پیدا نہیں ہوئے؟ اس لیے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ عورت سے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد کے بارے میں سوال ہوگا۔ آگے پھر دوبارہ وہی جملہ دھرا دیا:

((كُلُّكُمْ رَاعٍ، وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ))

کہ تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور ہر شخص سے اس کی زیر رعایت چیزوں کے بارے میں سوال ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو ان فرائض کے سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

☆☆☆

بیوی سے محبت حبِّ دنیا نہیں ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

بیوی سے محبت قابل تحسین ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے کسی سالک کے خط کے جواب میں تحریر فرمایا:

''بیوی کی محبت دنیا تو ہے مگر مباح بلکہ محمود، مگر اس شرط سے کہ غافل عن الدین نہ کرے، بیوی کے ساتھ محبت کا زیادہ ہونا عین مطلوب ہے، جب تقویٰ بڑھتا ہے تو بیوی سے محبت بڑھ جاتی ہے''(۱)

ہر وہ چیز جو گناہ پر آمادہ کرے ''دنیا'' ہے

وہ دنیا جس کی قرآن وحدیث میں مذمت آئی ہے اور جس کے بارے میں فرمایا گیا:

((حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ))(۲)

اور جس کے بارے میں فرمایا گیا:

﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾(۳)

یعنی دنیاوی زندگی دھوکہ کا سامان ہے وغیرہ، ان سب سے مراد دو صورتوں میں سے ایک ہے، ایک یہ کہ دنیا کے ساتھ ایسا تعلق ہو جائے کہ وہ تعلق انسان کو کسی گناہ پر آمادہ کر دے۔ اور گناہ کے اندر یہ بھی داخل ہے کہ اپنے ذمے جو فرائض اور واجبات ہیں، ان کے ترک پر آمادہ کر دے۔

☆ اصلاحی مجالس (۱۸۹/۴ تا ۲۰۰) بعد از نمازِ ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دارالعلوم، کراچی

(۱) انفاس عیسیٰ، ص: ۱۷۵

(۲) كنز العمال، رقم: ٦١١٤ (٣٥٣/٣)، حدیث مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے''

(۳) الحديد: ٢٠

مباحات میں انہماک ''دنیا'' ہے

دوسری صورت یہ ہے کہ اگر چہ دنیا کے ساتھ تعلق نے انسان کو براہ راست گناہ پر آمادہ نہیں کیا لیکن مباحات میں اس درجہ تک انہماک پیدا کر دیا کہ اب صبح سے لے کر شام تک دنیا کے مباحات کے علاوہ کسی اور چیز کا خیال ہی دل میں نہیں آتا، ہر وقت وہی مباحات دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی یاد اور آخرت کا خیال کبھی دل میں نہیں آتا۔ اگر چہ اس دوسری صورت کو فتویٰ کے اعتبار سے گناہ اور معصیت نہیں کہہ سکتے، کیونکہ کسی معصیت کا ارتکاب ابھی تک نہیں ہوا، لیکن تجربہ یہ ہے کہ یہ انہماک بالآخر انسان کو معصیت تک لے جاتا ہے، اس لیے دنیا کے اندر ایسا انہماک بھی نہ ہونا چاہیے۔

اگر دنیا کے ساتھ ساتھ مندرجہ بالا دو صورتیں نہ ہوں، یعنی نہ تو کسی معصیت کا ارتکاب ہو اور نہ دنیا کے اندر ایسا انہماک ہو کہ ہر وقت دنیا کی فکر دل و دماغ پر چھا جائے تو پھر یہ دنیا مضر ہونے کے بجائے اور زیادہ فائدہ مند ہو جاتی ہے، اور پھر وہ دنیا آخرت کا اور اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا زینہ بن جاتی ہے۔ لہٰذا انسان ان دو صورتوں سے بچے، پھر دنیا مضر نہیں۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

چیست دنیا از خدا غافل شدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

دنیا کی تعریف ہے اللہ تعالیٰ سے غافل ہو جانا، یہ کپڑا، یہ سونا، یہ بیوی اور یہ بچے دنیا نہیں، اگر اللہ تعالیٰ سے آخرت سے غفلت ہے تو یہ دنیا مذموم ہے اور اگر یہ غفلت نہیں ہے تو پھر خواہ مال و دولت کے انبار لگے ہوئے ہوں، تب بھی وہ دنیا مذموم نہیں۔

کیا اہل دنیا سب کافر ہیں؟

ایک بزرگ کا شعر ہے کہ ؎

اہل دنیا کافرانِ مطلق اند
ہر دم اندر بق بق و در چق چق اند

اس شعر پر اشکال ہوتا ہے کہ ان بزرگ نے اہل دنیا کو کافر قرار دے دیا کہ یہ سب کافر ہیں اور ہر وقت دنیا کے بارے میں بق بق اور چق چق میں لگے رہتے ہیں۔

اس شعر کی ایک توجیہ تو یہ ہے کہ اہل دنیا سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا سے اتنا تعلق

قائم کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے منکر ہو گئے اور واقعی کفر اختیار کر لیا۔

دوسری توجیہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی عجیب وغریب فرمائی ہے، فرمایا کہ اس شعر میں جو یہ کہا کہ ''اہل دنیا کافران مطلق اند'' اس میں لفظ ''اہل دنیا'' خبر مقدم ہے اور ''کافران مطلق اند'' مبتدا مؤخر ہے، لہٰذا اس شعر کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اہل دنیا مطلق کافر ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ''کافرانِ مطلق اہل دنیا ہیں''

''غفلت'' کا نام دنیا ہے

بہرحال! دنیا کی مال و دولت اور دنیا کے اسباب کا نام ''دنیا'' نہیں، بلکہ دنیا نام ہے اللہ تعالیٰ سے غفلت کا، اللہ تعالیٰ کے دین سے غفلت کا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے سے غفلت کا۔ اگر یہ غفلت نہ ہو تو پھر یہی دنیا آخرت کے لیے معین بن جاتی ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی تو اپنے نفس کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا ہے، اپنی بیوی کے حقوق، اپنے بچوں کے حقوق اور ملنے جلنے والوں کے حقوق ادا کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، اب اگر ان حقوق کی ادائیگی کی خاطر دنیا کما رہے ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل ہو رہی ہے۔ لہٰذا یہ کمانا کوئی غفلت نہیں اور دنیائے مذموم نہیں، بلکہ ایسی دنیا کے بارے میں فرمایا:

﴿وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ (۱)

یعنی اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرو۔ دنیا کو ''فضل اللہ'' سے تعبیر فرمایا، کیونکہ جب انسان اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ حقوق کی ادائیگی کے لیے دنیا تلاش کر رہا ہے تو وہ فضل اللہ ہے، وہ دنیائے مذموم نہیں، بلکہ دین ہے، اور آخرت کے لیے معین ہے۔

بیوی سے محبت عین دین ہے

اور حضرت والا نے یہ جو فرمایا کہ بیوی سے محبت عین مطلوب ہے، اس لیے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً﴾ (۲)

یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے درمیان محبت اور شفقت پیدا فرمائی۔ لہٰذا اس محبت کو خود اللہ تعالیٰ

(۱) الجمعة: ۱۰

(۲) الروم: ۲۱

نے پیدا فرمایا ہے اور حضور اقدس ﷺ نے حدیث شریف میں اس کا حکم دیا ہے، چنانچہ آپ نے فرمایا:

((خِیَارُکُمْ خِیَارُکُمْ لِنِسَآءِ ھِمْ وَاَنَا خِیَارُکُمْ لِنِسَائِیْ))(۱)

یعنی تم (لوگوں) میں بہتر وہ ہے جو اپنی بیویوں کے لیے بہتر ہو اور میں اپنی بیویوں کے لیے تم میں سب سے بہتر ہوں۔

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

((اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَآءِ خَیْرًا))(۲)

یعنی عورتوں کے بارے میں اچھا سلوک کرنے کی وصیت کو قبول کرلو۔ لہٰذا جب ان احکام کی تعمیل میں کوئی شخص اپنی بیوی سے محبت کررہا ہے تو وہ دنیا نہیں بلکہ عین دین ہے اور مطلوب ہے۔

تقویٰ بڑھنے سے بیوی سے محبت زیادہ ہوتی ہے

لہٰذا حضرت والا نے فرمایا کہ جب انسان کے اندر تقویٰ بڑھتا ہے تو بیوی سے محبت بڑھ جاتی ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے حقوق میرے ذمے عائد کیے گئے ہیں، لہٰذا میں ان کو ادا کرنے کا پابند ہوں، اس لیے جب وہ اس نیت سے ان حقوق کو ادا کرے گا تو اسے ثواب ملے گا۔

ہماری اور ان کی محبت میں فرق

اسی وجہ سے جتنے اولیاء کامل ہوتے ہیں، وہ اپنے بیوی بچوں سے محبت بھی بھرپور کرتے ہیں، اور ہم بھی اپنے بیوی بچوں سے محبت کرتے ہیں، البتہ ہم اتنی محبت نہیں کرتے جتنی محبت وہ کرتے

---

(۱) اس حدیث کی عبارت قابل تحقیق ہے، کیونکہ مجموعہ احادیث میں اس موضوع سے متعلق دو طرح کی روایات ملتی ہیں، ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ((خیر کم خیر کم لأھله وأنا خیر کم لأھلی)) جبکہ دوسری روایت میں یہ الفاظ یہ ہیں: ((خِیَارُکُمْ خِیَارُکُمْ لِنِسَآءِ ھِمْ)) اس روایت میں ((وَاَنَا خِیَارُکُمْ لِنِسَائِیْ)) کے الفاظ نہیں ملتے۔

(۲) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب الوصلة بالنساء، رقم: ٤٧٨٧، صحیح مسلم، کتاب الرضاع، باب الوصیة بالنساء، رقم: ٢٦٧١، سنن الترمذی، کتاب الرضاع، باب ماجاء فی حق المرأة علی زوجھا، رقم: ١٠٨٣، سنن ابن ماجه، کتاب النکاح، باب حق المرأة علی الزوج، رقم: ١٨٤١

ہیں، لیکن ہماری محبت میں اور اولیاء کرام کی محبت میں بڑا فرق ہے، اگرچہ دیکھنے میں ایک جیسی محبت معلوم ہوتی ہے کہ ہم بھی محبت کر رہے ہیں اور وہ بھی محبت کر رہے ہیں، ہم بھی بچوں سے کھیل رہے ہیں اور وہ بھی بچوں سے کھیل رہے ہیں، ہم بھی بیوی سے تعلق کا اظہار کر رہے ہیں اور وہ بھی کر رہے ہیں، لیکن حقیقت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

ان کی محبت اداء حقوق کے لیے ہے

وہ فرق یہ ہے کہ ہم لوگ دنیاوی لذات کی وجہ سے محبت کرتے ہیں، مثلاً ہم لوگ اگر بچوں سے کھیل رہے ہیں تو اس لیے کھیل رہے ہیں کہ اس میں مزہ آ رہا ہے، یا بیوی سے ہم تعلق اس لیے قائم کیے ہوئے ہیں کہ وہ موجب لذت ہے۔ اور اولیاء اللہ اس لیے محبت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا حق ہم سے وابستہ کر دیا ہے اور ان اولیاء اللہ کو ان کے ساتھ معاملہ کرنے میں وہی نور محسوس ہوتا ہے اور وہی برکات محسوس ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم کرتے وقت محسوس ہوتے ہیں۔ اس لیے ہمارے تعلق اور ان کے تعلق میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

حضور اقدس ﷺ کی ازواج مطہرات سے خوش طبعی پر تعجب

میں نے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ ایک دن حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمانے لگے کہ پہلے مجھے اس بات پر بڑا تعجب ہوتا تھا کہ حضور نبی کریم ﷺ اپنی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے کس طرح ایسی خوش طبعی کی باتیں کر لیا کرتے تھے جیسا کہ روایات میں آتی ہیں۔ مثلاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ دوڑ لگا رہے ہیں اور اپنے کندھے کے پیچھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو کھڑا کر کے حبشیوں کے کرتب دکھا رہے ہیں اور رات کو گیارہ عورتوں کی کہانی سنا رہے ہیں۔ جس ذات کا رابطہ اللہ جل شانہ کے ساتھ قائم ہو، جس پر وحی نازل ہو رہی ہو، ملائکہ اس پر اتر رہے ہوں اور ملاء اعلیٰ کے ساتھ اس کا رشتہ جڑا ہوا ہو، وہ ذات ایسی دنیا کی حقیر چیزوں کی طرف کیسے متوجہ ہو جاتی ہے؟ اس پر مجھے تعجب ہوتا تھا۔

یہ دونوں باتیں جمع ہو سکتی ہیں

بعد میں فرمایا کہ الحمدللہ، اب سمجھ میں آنے لگا کہ یہ دونوں کام ایک ساتھ ہو سکتے ہیں، اس لیے کہ بیوی بچوں کے ساتھ جو معاملہ ہو رہا ہے، درحقیقت اس کی نوعیت بدلی ہوئی ہے، اس طرح کہ وہ

معاملات بھی ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا مظہر ہیں، کیونکہ جب نیت درست کر لی تو اب دنیا کے سارے کاموں میں بھی وہی نور ہے جو خالص عبادات میں ہے۔

قطبی پڑھ کر ایصال ثواب کرنا

میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ سنا کہ وہ ایک دن قطبی کا سبق پڑھا رہے تھے جو منطق کی کتاب ہے، درس کے دوران ایک صاحب نے آ کر کہا کہ میری والدہ کا انتقال ہو گیا ہے، ایصال ثواب کی درخواست ہے۔ حضرت نے ہاتھ اٹھائے اور دعا شروع کر دی کہ یا اللہ! ہم جو یہ سبق پڑھ رہے ہیں، اس کا ثواب ان کو پہنچا دیجیے۔ وہ صاحب بڑے حیران ہوئے کہ قطبی کا بھی ایصال ثواب ہوتا ہے، قرآن شریف یا حدیث شریف پڑھ کر ایصال ثواب کرتے تو بات سمجھ آ جاتی، یہ قطبی پڑھ کر ایصال ثواب کیسے؟ حضرت نے فرمایا کہ میاں! اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے نیت درست ہو تو میرے نزدیک بخاری شریف اور قطبی کے ثواب میں کوئی فرق نہیں، جو ثواب بخاری شریف میں ہے، وہی ثواب قطبی میں بھی ہے۔ ان شاء اللہ۔

ملاحسن کے درس میں دل سے اللہ اللہ جاری تھا

میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ میرے دادا حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے پاس منطق کی کتاب ''ملاحسن'' کا سبق پڑھا کرتے تھے، اس سبق میں ہم اپنے کانوں سے سنا کرتے تھے کہ ان کے قلب سے ''اللہ اللہ'' کی آواز آ رہی ہے۔ منطق کے سبق میں یہ بات ہوتی تھی جس کو کہنے والوں نے ''گندگی'' تک کہہ دیا، گویا کہ اس سبق میں بھی انوار و برکات تھے، کیونکہ نیت درست تھی اور طریقہ درست تھا۔

اتباع سنت کو اختیار کر لو

اللہ تعالیٰ ہماری نیتوں کو درست فرما دے، آمین۔ ہر چیز میں اتباعِ سنت کی نیت ہو، کیونکہ ''سنت'' تمام زندگی کے کاموں پر حاوی ہے، جو کچھ کرو گے کہیں نہ کہیں سنت سے رشتہ مل جائے گا، لہٰذا ہر کام میں اتباعِ سنت کی نیت کرو گے تو بالآخر دنیا کے سارے کام بھی دین بن جائیں گے اور ان کے اندر بھی وہ انوار و برکات حاصل ہوں گے جو عبادات میں ہوتے ہیں اور پھر وہ دنیائے مذموم میں داخل نہ ہوں گے۔

اس کے لیے مشق کی ضرورت ہے

لیکن اس کے لیے مشق کرنی پڑتی ہے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ مدتوں میں نے اتباعِ سنت کی مشق کی ہے، مثلاً کھانا سامنے آیا، کھانا لذیذ ہے، بھوک لگی ہوئی ہے، کھانے کو دل چاہ رہا ہے، لیکن ایک لمحہ کے لیے دل میں یہ ارادہ کیا کہ دل چاہنے پر کھانا نہیں کھائیں گے، پھر دوسرے لمحے یہ بات ذہن میں لائے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ذمے ہمارے نفس کا حق رکھا ہے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب کھانا سامنے آتا تو شکر کرتے ہوئے کھانا تناول فرمالیا کرتے تھے، اب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع میں کھاؤں گا، پھر ''بسم اللہ'' پڑھ کر کھانا شروع کر دیا۔ چونکہ نیت درست ہوگئی، اس لیے اب وہ کھانا دنیا نہ رہا بلکہ دین بن گیا۔

ہر عمل کو دین بنالیں

یا مثلاً گھر کے اندر داخل ہوئے اور بچہ کھیلتا ہوا اچھا لگا، دل چاہا کہ اس کو گود میں اٹھا کر پیار کروں، لیکن ایک لمحہ کے لیے رک گئے اور یہ سوچا کہ دل کے چاہنے پر یہ کام نہیں کریں گے، پھر دوسرے لمحے یہ خیال لائے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بچوں کے ساتھ پیار فرماتے تھے، اب میں بھی آپ کی اتباع میں بچے کو اٹھا کر پیار کروں گا، پھر بچہ کو گود میں اٹھا کر پیار کرلیا تو یہ عمل بھی اتباع سنت کے نتیجے میں دین بن گیا۔

خلاصہ

خلاصہ یہ کہ صبح سے لے کر شام تک کی زندگی کے معمولات میں کوئی کام ایسا نہیں ہے جس کو حسن نیت سے اتباع سنت اور دین کا کام نہ بنایا جا سکے، جب اتباع سنت کی نیت سے وہ کام کرو گے تو وہی دنیا دین بن جائے گی۔

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور فضل سے ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

☆☆☆

والدین کی خدمت، جنت کا ذریعہ ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِى الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾(۱)

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ ایک نیا باب قائم فرمایا ہے، جو والدین کے ساتھ حسن سلوک اور صلہ رحمی کے بیان میں ہے، جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ یہ ابواب جو اس کتاب ''ریاض الصالحین'' میں چل رہے ہیں، ان کا تعلق حقوق العباد سے ہے، بعض حقوق العباد کا بیان گزر چکا ہے، ان حقوق کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات آپ سن چکے ہیں اس نئے باب میں والدین کے ساتھ حسن سلوک اور رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی کے بارے میں آیات اور احادیث لائے ہیں۔

افضل عمل کون سا؟

عَنْ اَبِىْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُ، قَالَ سَئَلْتُ النَّبِىَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَىُّ الْعَمَلِ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ؟ قَالَ: ((اَلصَّلَاةُ عَلٰى وَقْتِهَا)) قُلْتُ: ثُمَّ اَىٌّ؟ قَالَ: ((بِرُّ الْوَالِدَيْنِ)) قُلْتُ: ثُمَّ اَىٌّ؟ قَالَ: ((اَلْجِهَادُ

☆ اصلاحی خطبات (۱/۵۳ تا ۷۸)، ۲۸ اگست ۱۹۹۲ء بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرّم، کراچی۔ زیر نظر درس امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''ریاض الصالحین'' کے باب نمبر ۳۶ "باب بر الوالدین وصلة الأرحام" (صفحہ ۱۳۳ تا ۱۳۵) کا درس ہے۔

(۱) النساء: ۳٦

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ)) (۱)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب عمل کون سا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ سب سے زیادہ محبوب عمل یہ ہے کہ نماز اپنے وقت پر ادا کی جائے، میں نے پھر پوچھا کہ نماز کے بعد سب سے زیادہ محبوب عمل کون سا ہے؟ آپ نے جواب میں فرمایا کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک، میں نے پوچھا کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کے بعد تیسرے نمبر پر محبوب عمل کون سا ہے؟ تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ اللہ کے راستے میں جہاد کرنا''

اس حدیث میں ترتیب اس طرح بیان فرمائی گئی کہ سب سے افضل اور پسندیدہ عمل وقت پر نماز پڑھنے کو قرار دیا گیا، دوسرے نمبر پر والدین کے ساتھ حسن سلوک اور تیسرے نمبر پر جہاد فی سبیل اللہ کو۔

نیک کاموں کی حرص

یہاں دو باتیں سمجھنے کی ہیں، ایک یہ کہ اگر احادیث کا جائزہ لیا جائے تو یہ نظر آتا ہے کہ بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مختلف مواقع پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ پوچھا کہ سب سے افضل عمل کون سا ہے؟ اس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ فکر اور یہ حرص ظاہر ہوتی ہے کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ جو عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب اور افضل ہو اس کو انجام دینے کی کوشش کی جائے، اور وہ عمل ہماری زندگیوں میں آجائے، اس لیے کہ ہر وقت دل و دماغ پر آخرت کی فکر طاری تھی، وہ تو یہ چاہتے تھے کہ آخرت میں کسی طرح اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس کی رضا حاصل ہو جائے، اس لیے ہر وقت یہ معلوم کرنے کی فکر میں رہتے تھے کہ کس عمل میں کیا اجر و ثواب ہے، اور وہ ہمیں حاصل ہو جائے۔

آج ہم لوگ فضائل کی احادیث میں پڑھتے رہے ہیں کہ فلاں عمل میں یہ فضیلت ہے۔ فلاں عمل میں یہ فضیلت ہے پڑھتے بھی ہیں۔ سنتے بھی ہیں۔ لیکن اس کے بعد کما حقہ عمل کا داعیہ پیدا نہیں ہوتا، حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا حال یہ تھا کہ چھوٹے سے چھوٹا عمل جس کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ یہ ثواب کا کام ہے بس اس کی طرف دوڑتے تھے۔

---

(۱) صحيح البخاری، كتاب مواقيت الصلاة، باب فضل الصلاة لوقتها، رقم: ٤٩٦، سنن النسائی، كتاب المواقيت، باب فضل الصلاة لمواقيتها، رقم: ٦٠٦، مسند أحمد، رقم: ٣٦٩٥

افسوس! میں نے تو بہت سے قیراط ضائع کر دیئے

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے سامنے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث سنائی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی نماز جنازہ میں شریک ہو، تو اس کو ایک قیراط اجر ملے گا، ''قیراط'' اس زمانے میں ایک پیمانہ تھا۔ جس کے ذریعہ سونا چاندی کا وزن کیا جاتا تھا۔ اور جو شخص نماز جنازہ کے بعد اس کے پیچھے چلے اس کو دو قیراط ملیں گے، اور جو شخص اس کی تدفین میں بھی شامل ہو، اس کو تین قیراط اجر ملیں گے۔ ویسے تو ''قیراط'' ایک چھوٹا سا پیمانہ ہے۔ لیکن ایک دوسری حدیث میں آتا ہے کہ جنت کا ''قیراط'' احد پہاڑ سے بھی بڑا ہے۔

جب یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے سنائی تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے یہ حدیث پہلے نہیں سنی، جس کی وجہ سے ہم نے بہت سے قیراط ضائع کر دیئے۔ (۱)

مقصد یہ تھا کہ مجھے پہلے یہ معلوم نہیں تھا کہ نماز جنازہ پڑھنے اور جنازہ کے پیچھے چلنے، اور تدفین میں شرکت کی ایسی فضیلت ہے، اگر پہلے سے مجھے معلوم ہوتا تو میں اس کا اہتمام کرتا، اور اہتمام نہ کرنے کی وجہ سے میرے بہت سے ''قیراط'' ضائع ہو گئے۔ حالانکہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ وہ صحابی ہیں جن کا مشغلہ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر عمل اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے مطابق زندگی گزارنا تھا، جن کے نامہ اعمال میں نیکیوں کا ذخیرہ موجود ہے لیکن اس کے باوجود جب ایک نیا عمل معلوم ہوا تو انہیں اس پر افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے کیوں اب تک یہ عمل اختیار نہیں کیا تھا۔ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہی حال نظر آتا ہے کہ ہر وقت اسی فکر میں ہیں کہ ذرا سی کوئی نیکی کرنے کا موقع مل جائے جس سے اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر و ثواب میں اضافہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو۔

سوال ایک، جواب مختلف

اسی لیے بار بار صحابہ کرام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتے تھے کہ یا رسول اللہ! سب سے افضل عمل کون سا ہے؟ روایات میں یہ نظر آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف صحابہ کرام کو مختلف جواب دیئے۔ مثلاً اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ سب سے افضل عمل وقت پر نماز پڑھنا ہے، ایک حدیث پیچھے گزر چکی ہے کہ ایک صحابی کے اس سوال کے جواب میں آپ نے ارشاد فرمایا

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب فضل اتباع الجنائز، رقم الحدیث: ۱۲۲۹

کہ سب سے افضل عمل یہ ہے کہ تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تر رہے۔(۱)

یعنی ہر وقت تمہاری زبان پر اللہ کا ذکر جاری ہو، چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے، ہر حالت میں تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تر رہے، یہ عمل اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہے ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے یہ سوال کیا کہ یا رسول اللہ! سب سے افضل عمل کون سا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ سب سے افضل عمل اعمال کو پابندی کے ساتھ کرنا ہے۔(۲)

کسی صحابی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! سب سے افضل عمل کون سا ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ اللہ کے راستے میں جہاد کرنا سب سے افضل عمل ہے۔(۳)

غرض یہ کہ مختلف صحابہ کرام کو آنحضرت ﷺ نے مختلف جوابات عطا فرمائے، بظاہر اگرچہ ان جوابات میں تضاد نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں تضاد نہیں۔

ہر شخص کا افضل عمل جدا ہے

بات دراصل یہ ہے کہ ہر آدمی کے حالات کے لحاظ سے افضل عمل بدلتا رہتا ہے، کسی شخص کے لیے نماز پڑھنا سب سے افضل عمل ہے، کسی شخص کے لیے والدین کی اطاعت سب سے افضل عمل ہے، کسی شخص کے لیے جہاد سب سے افضل عمل ہے، کسی شخص کے لیے ذکر سب سے افضل عمل ہے، حالات کے لحاظ سے اور آدمیوں کے لحاظ سے فرق پڑ جاتا ہے، مثلاً بعض صحابہ کرام کے بارے میں آپ کو پہلے سے معلوم تھا کہ نماز کی تو ویسے بھی پابندی کرتے ہیں، ان کے سامنے نماز کی زیادہ فضیلت بیان کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن والدین کے حقوق میں کوتاہی ہو رہی ہو، تو اب حضور اقدس ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تمہارے حق میں سب سے افضل عمل والدین کی اطاعت ہے کسی صحابی کا عبادت کی طرف تو زیادہ دھیان تھا۔ مگر جہاد کی طرف اتنی رغبت نہیں تھی۔ ان کے حق میں فرمایا کہ تمہارے لیے سب سے افضل عمل جہاد فی سبیل اللہ ہے، کسی صحابی کو آپ نے دیکھا کہ وہ

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اله، باب ماجاء فی فضل الذکر، رقم: ۳۲۹۷، سنن ابن ماجه، کتاب الأرب، باب فضل الذکر، رقم: ۳۷۸۳، مسند أحمد، رقم: ۱۷۰۲۰

(۲) صحیح البخاری، کتاب الجمعة، باب من نام عندالسحر ،رقم: ١٠٦٤، صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرین و قصرها، باب فضیلة العمل الدائم من قیام اللیل وغیره، رقم: ۱۳۰۳، سنن الترمذی، کتاب الأرب عن رسول الله، باب ماجاء فی الفصاحة والبیان، رقم: ۲۷۸۳، مسند أحمد، رقم: ۲۲۹۱۵

(۳) مسند أحمد، رقم: ۳۵٦/۷۹

عبادت بھی کر رہے ہیں، جہاد بھی کر رہے ہیں، لیکن ذکر اللہ کی طرف اتنا التفات نہیں ہے، ان کو فرمایا کہ تمہارے حق میں سب سے افضل عمل ذکر اللہ ہے۔ لہٰذا مختلف صحابہ کرام کو ان کے حالات کے لحاظ سے آنحضرت ﷺ نے مختلف جواب دیئے۔ لیکن یہ سب فضیلت والے اعمال ہیں، یعنی وقت پر نماز پڑھنا۔ والدین کی اطاعت کرنا، جہاد فی سبیل اللہ کرنا، ہر وقت ذکر اللہ کرنا وغیرہ، البتہ لوگوں کے حالات کے لحاظ سے فضیلت بدلتی رہتی ہے۔

نماز کی افضلیت

اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے افضل اعمال کی ترتیب یہ بیان فرمائی کہ سب سے افضل عمل وقت پر نماز پڑھنا، صرف نماز پڑھنا نہیں، بلکہ وقت کا لحاظ کر کے نماز پڑھنا، بعض اوقات انسان وقت کا دھیان نہیں کرتا۔ اور وقت گزار دیتا ہے۔ اور یہ سوچتا ہے کہ نماز قضا ہوگئی تو ہونے دو۔ یہ انسان کے لیے کسی طرح بھی مناسب نہیں، بلکہ وقت کے اندر نماز ادا کرنے کی فکر کرے، قرآن کریم کی آیت ہے:

﴿فَوَيۡلٌ لِّلۡمُصَلِّيۡنَ الَّذِيۡنَ هُمۡ عَنۡ صَلَاتِهِمۡ سَاهُوۡنَ﴾(۱)

یعنی ان نمازیوں پر افسوس ہے، جو اپنی نماز کی طرف سے غفلت میں ہیں۔ نماز کا وقت آیا۔ اور چلا گیا۔ نماز ادا کرنے کی طرف دھیان نہیں دیا، یہاں تک کہ نماز قضا ہوگئی۔ ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنۡ فَاتَتۡهُ صَلَاةُ الۡعَصۡرِ فَكَاَنَّمَا وُتِرَ اَهۡلُهٗ وَمَالُهٗ))(۲)

یعنی جس شخص کی عصر کی نماز فوت ہوگئی وقت گزر گیا۔ اور نماز نہیں پڑھی۔ وہ ایسا ہے جیسا اس کے سارے گھر والے لٹ گئے اور سارا مال لٹ گیا، جس طرح وہ شخص تنگ دست اور مفلوک الحال ہے اسی طرح وہ شخص بھی مفلوک الحال ہے جس کی ایک عصر کی نماز قضا ہوگئی ہو، لہٰذا نماز کو قضاء

---

(۱) الماعون: ٤

(۲) صحيح البخاری، كتاب مواقيت الصلاة، باب إثم من فاتة العصر، رقم: ٥١٩، صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب التغليظ فی تفويت صلاة العصر، رقم: ٩٩١، سنن الترمذی، كتاب الصلاة، باب ماجاء فی السهر عن وقت صلاة العصر، رقم: ١٦٠، سنن النسائی، كتاب المواقيت، باب القشريد فی تأخير العصر، رقم: ٥٠٨، سنن أبی داؤد، كتاب العصر، باب فی وقت صلاة العصر، رقم: ٣٥١، سنن ابن ماجه، كتاب الصلاة، باب المحافظة على صلاة العصر، رقم: ٦٧٧، مسند أحمد، رقم: ٤٣١٧، مؤطا مالك، كتاب وقوت الصلاة، باب جامع الوقوت، رقم: ١٨، سنن الدارمی، كتاب الصلاة، باب فی الذی تفوته صلاة العصر، رقم: ١٢٠٢

کرنا بڑی سنگین بات ہے، اور اس پر بڑی سخت وعیدیں آئی ہیں۔ اس لیے نماز کا بھی دھیان ہونا چاہیے، اور نماز کے وقت کا بھی دھیان ہونا چاہیے۔

جہاد کی افضلیت

اس حدیث میں دوسرے نمبر پر افضل عمل ''والدین کے ساتھ حسن سلوک'' کو قرار دیا، اور تیسرے نمبر پر جہاد فی سبیل اللہ، گویا کہ والدین کی اطاعت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کو جہاد جیسی عبادت پر فوقیت عطا فرمائی ہے۔ حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ جہاد اتنی بڑی عبادت ہے، اور اس کے اتنے فضائل ہیں کہ حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص اللہ کے راستے میں جہاد کرے، اور اس جہاد میں شہید ہو جائے تو جنت میں جانے کے بعد اسے دوبارہ دنیا میں جانے کی خواہش ہوگی تاکہ مزید دس مرتبہ شہید کیا جائے اور شہید کو ملنے والے اکرام کو حاصل کر سکے۔ (۱)

ایک حدیث میں ہے کہ جب ایک انسان مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے مقامات قرب کا مشاہدہ کرے گا، اور جنت کا مشاہدہ کرے گا تو اس کے دل میں کبھی دنیا میں واپس آنے کی خواہش پیدا نہیں ہو گی، کہ میں دنیا میں واپس جاؤں، اس لیے کہ دنیا کی حقیقت کھل کر اس کے سامنے آ جائے گی۔ کہ یہ دنیا اس جنت کے مقابلے میں کتنی بے حقیقت، کتنی ناپائیدار اور کتنی گندی چیز تھی، جو جنت اس کو مل گئی ہے۔ لیکن وہ شخص جو جہاد کرتے ہوئے اللہ کے راستے میں شہید ہو چکا ہو۔ وہ تمنا کرے گا کہ کاش مجھے دوبارہ دنیا میں بھیج دیا جائے۔ اور وہاں جا کر دوبارہ جہاد کروں۔ اور پھر اللہ کے راستے میں شہید ہو جاؤں۔

اسی لیے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ میرے دل کی خواہش یہ ہے کہ میں اللہ کے راستے میں جہاد کروں، اور شہید ہو جائیں، پھر مجھے زندہ کیا جائے۔ پھر شہید ہو جاؤں، پھر زندہ کیا جائے۔ پھر شہید ہو جاؤں۔ تو جنت میں جانے کے بعد کوئی اللہ کا بندہ دنیا میں واپس آنے کی خواہش نہیں کرے گا۔ سوائے شہید کے کہ وہ اس بات کی خواہش کرے گا، جہاد کی اتنی بڑی فضیلت ہے۔ (۲)

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب تمنی المجاهد أن یرجع الی الدنیا، رقم: ۲۶۰۶، صحیح مسلم، کتاب الإمارة، باب فصل الشهادة فی سبیل الله، رقم: ۳۴۸۸، سنن الترمذی، کتاب فضائل الجهاد عن رسول الله، باب فی ثواب التشهیر، رقم: ۱۵۸۵، سنن النسائی، کتاب الجهاد، باب مایتمنیٰ اهل الجنة، رقم: ۳۱۰۹، مسند أحمد، رقم: ۱۱۵۵۶

(۲) صحیح البخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب تمنی الشهادة، رقم: ۲۵۸۸، صحیح مسلم، کتاب الإمارة، رقم: ۳۴۸۴، سنن النسائی، کتاب الجهاد، رقم: ۳۱۰۱، سنن ابن ماجه، کتاه الجهاد، باب فضل الجهاد فی سبیل الله، رقم: ۲۷۴۳، مسند أحمد، رقم: ۶۸۶۰

والدین کا حق

لیکن والدین کی اطاعت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کو جہاد پر بھی مقدم رکھا ہے، اس لیے بزرگوں نے فرمایا کہ جتنے حقوق العباد ہیں، ان میں سب سے مقدم حق والدین کا ہے، اس سے واجب الاحترام حق دنیا میں کسی اور کا نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے والدین کو انسان کے وجود کا ذریعہ بنایا ہے، اس لیے ان کا حق بھی سب سے زیادہ رکھا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ حسن سلوک کا اتنا اجر رکھا ہے کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک مرتبہ اپنے والدین کو محبت کی نگاہ سے دیکھے تو اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ اس کو ایک حج اور عمرہ کے برابر ثواب عطا فرماتے ہیں۔

ماں باپ کی محبت، بے غرض محبت

یاد رکھئے! اس دنیا میں جتنی محبتیں اور تعلقات ہیں، ان تمام محبتوں اور تعلقات میں انسان کو کوئی نہ کوئی غرض ضرور وابستہ ہے، اس دنیا میں بے غرض محبت نہیں ملے گی، سوائے والدین کی محبت کے یعنی والدین کی اپنی اولاد کے ساتھ جو محبت ہوتی ہے وہ بے غرض ہوتی ہے، اس محبت میں ان کا اپنا کوئی مفاد اور کوئی غرض شامل نہیں، اس کے علاوہ کوئی محبت بے غرض نہیں مثلاً شوہر بیوی سے محبت کرے تو اس میں غرض شامل ہے، بیوی شوہر سے محبت کرے تو اس میں غرض ہے، بھائی بھائی سے محبت کرے، یا ایک دوست دوسرے دوست سے محبت کرے، غرض یہ کہ جتنے تعلقات ہیں سب کے اندر غرض شامل ہے، ان سب میں کوئی نہ کوئی غرض کارفرما ہوتی ہے، لیکن ایک محبت غرض سے پاک ہے، وہ ماں باپ کی محبت ہے، یعنی ماں باپ اپنی اولاد سے جو محبت کرتے ہیں اس میں ان کی ذات کی کوئی غرض شامل نہیں ہوتی ان کا جذبہ تو ہوتا ہے کہ اپنی جان بھی چلی جائے۔ لیکن اولاد کو فائدہ پہنچ جائے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حقوق میں ان کا درجہ سب سے زیادہ رکھا، اور جہاد فی سبیل اللہ پر بھی اس کو مقدم فرمایا۔

والدین کی خدمت، ایک عظیم سعادت

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صحابی حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور آکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرا بہت دل چاہتا ہے کہ میں اللہ کے راستے میں جہاد کروں، اور جہاد سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے راضی ہو جائیں، اور اس پر مجھے اجر و ثواب عطا

فرمائیں۔ صرف اسی غرض کے لیے جہاد میں جانا چاہتا ہوں، حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم واقعی ثواب حاصل کرنے کے لیے جہاد کرنا چاہتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا، ہاں! یا رسول اللہ، میں صرف ثواب حاصل کرنا چاہتا ہوں، آپ نے فرمایا کہ کیا تمہارے والدین زندہ ہیں؟ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے والدین زندہ ہیں، آپ نے فرمایا کہ جاؤ اور جا کر ان کی خدمت کرو، اس لیے کہ اگر تمہیں اجر حاصل کرنا ہے تو پھر والدین کی خدمت کر کے تمہیں جو اجر حاصل ہوگا وہ اجر جہاد سے بھی حاصل نہیں ہوگا۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

((فَفِيْهِمَا فَجَاهِدْ))

یعنی جا کر ان کی خدمت کر کے جہاد کرو، ان روایات میں والدین کی خدمت کو جہاد سے بھی زیادہ فوقیت عطا فرمائی۔(۱)

اپنا شوق پورا کرنے کا نام دین نہیں

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک بات فرمایا کرتے تھے۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنے کی ہے۔ فرماتے تھے کہ بھائی! اپنا شوق پورا کرنے کا نام دین نہیں، بلکہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی اتباع کا نام دین ہے، یہ دیکھو کہ اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے اس وقت کا کیا تقاضا ہے؟ بس! اس تقاضے کو پورا کرو، اس کا نام دین ہے اس کا نام دین نہیں کہ مجھے فلاں چیز کا شوق ہوگیا ہے، اس شوق کو پورا کر رہا ہوں، مثلاً کسی کو اس بات کا شوق ہوگیا کہ میں ہمیشہ صف اول میں نماز پڑھوں، کسی کو اس بات کا شوق ہوگیا کہ میں جہاد پر جاؤں، کسی کو اس بات کا شوق ہوگیا کہ میں تبلیغ و دعوت کے کام میں نکلوں، اگرچہ یہ سب کام دین کے کام ہیں۔ اور باعث اجر و ثواب ہیں، لیکن یہ دیکھو کہ اس وقت کا تقاضا کیا ہے؟ مثلاً گھر کے اندر والدین بیمار ہیں، اور انہیں تمہاری خدمت کی ضرورت ہے، لیکن تمہیں تو اس بات کا شوق لگا ہوا ہے صف اول میں جا کر جماعت سے نماز

---

(۱) صحيح البخاری، كتاب الجهاد والسير، باب الجهاد بإذن الأبدين: ۲۷۸۲، صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب بر الوالدين وأنهما أحق به، رقم: ٤٦٢٣، سنن الترمذی، كتاب الجهاد عن رسول الله، باب ماجاء فيمن خرج فی الغزو وترك أبويه، رقم: ١٥٩٤، سنن النسائی، كتاب الجهاد، باب الرخصة فی التخلف لمن له والدان، رقم: ۳۰۵۲، سنن أبی داؤد، كتاب الجهاد، باب فی الرجل يغزو وأبواه كارهان، رقم: ۲۱٦۷، مسند أحمد، رقم: ٦٢٥٧

پڑھوں، اور والدین اتنے بیمار ہیں کہ حرکت کرنے کے قابل نہیں، اب اس وقت تمہارے لیے اللہ کی طرف سے تقاضا یہ ہے کہ صف اول کی نماز کو چھوڑو، اور والدین کی خدمت انجام دو اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرو، اور نماز گھر کے اندر تنہا پڑھ لو، اب اگر اس وقت تم نے والدین کو اس حال میں چھوڑ دیا کہ وہ حرکت کرنے کے قابل نہیں، اور تم اپنا شوق پورا کرنے کے لیے مسجد میں چلے گئے اور صف اول میں جا کر شامل ہو گئے تو یہ دین کی اتباع نہ ہوئی بلکہ اپنا شوق پورا کرنا ہو گا۔

یہ حکم اس صورت میں ہے کہ جب مسجد کہیں دور ہے، مسجد آنے جانے میں وقت لگے گا، اور والدین کی حالت ایسی ہے کہ ان کو تکلیف ہو گی۔ لیکن اگر مسجد گھر کے بالکل قریب ہے اور والدین کی حالت ایسی ہے کہ ان کو بیٹے کے تھوڑی دیر کے دور رہنے سے تکلیف نہ ہو گی یا کوئی اور خدمت کرنے والا موجود ہے تو اس صورت میں اس کو مسجد میں جا کر جماعت ہی سے نماز ادا کرنی چاہیے۔

اپنے شوق کا نام دین نہیں

ہمارے حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی ایک مثال دی، فرمایا کہ فرض کریں کہ ایک ویرانے جنگل میں ایک شخص اور صرف اس کی بیوی ہے۔ اور کوئی شخص قریب میں موجود نہیں، اس حالت میں نماز کا وقت ہو گیا اور مسجد آبادی کے اندر فاصلے پر ہے، اب یہ شخص اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ چونکہ نماز کا وقت ہو گیا ہے اس لیے میں تو مسجد میں جا کر جماعت سے نماز ادا کروں گا، اس کی بیوی کہتی ہے کہ اس ویرانے جنگل کے اندر میں تنہا ہوں۔ کوئی پاس نہیں۔ اب اگر تم نماز کے لیے دور آبادی میں چلے گئے تو اس ویرانے میں خوف کی وجہ سے میری تو جان نکل جائے گی۔ لیکن شوہر کہتا ہے کہ جماعت سے صف اول میں نماز پڑھنے کی بڑی فضیلت ہے، میں تو صف اول میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کروں گا۔ اور اس فضیلت کو میں حاصل کروں گا۔ چاہے کچھ ہو جائے۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ دین نہ ہوا، یہ تو صف اول میں نماز پڑھنے کا شوق ہو گیا، اس شوق کو پورا کر رہا ہے، اس لیے کہ اس وقت دین کا تقاضا تو یہ ہے کہ جماعت کی نماز کو چھوڑو۔ اور وہیں پر تنہا نماز پڑھو، اگر ایسا نہیں کرو گے تو پھر اپنا شوق پورا کرنا ہو جائے گا۔ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہ ہو گی۔

یا مثلاً گھر میں والدین بیمار ہیں، بیوی بچے ہیں، اور ان کو آپ کی خدمت کی ضرورت ہے، لیکن آپ کو تبلیغ میں جانے کا شوق ہو گیا۔ اور آپ نے کہا کہ میں تبلیغ میں جاتا ہوں۔ دیکھئے ویسے تبلیغ میں جانا بڑا ثواب کا کام ہے، لیکن اس حالت میں جب کہ والدین یا بیوی بچوں کو تمہاری خدمت کی

ضرورت ہے اور تمہاری خدمت کے بغیر ان کا کام نہیں چلے گا۔ تو اس حالت میں یہ اپنا شوق پورا کرنا ہوگا یہ دین کا تقاضا نہ ہوگا۔ اور دین اپنا شوق پورا کرنے کا نام نہیں، بلکہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا حکم ماننے کا نام دین ہے، جس وقت جس کام کا تقاضا ہے، اس وقت اس کو انجام دو۔

آپ نے اس حدیث میں دیکھا کہ ایک صحابی آئے، اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں جہاد میں جانا چاہتا ہوں، لیکن آپ نے ان کو منع فرما دیا، اور فرمایا کہ تمہارے لیے حکم یہ ہے کہ جا کر والدین کی خدمت کرو۔

حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کا تذکرہ

حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ، حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں موجود ہیں، اور مسلمان ہیں، اور وہ چاہتے بھی ہیں کہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کی زیارت کروں، اور آنحضرت ﷺ کی زیارت وہ سعادت اور خوش نصیبی ہے کہ شاید اس روئے زمین پر اس سے بڑی سعادت اور خوش نصیبی کوئی اور نہیں ہوگی اور آپ ﷺ اس دنیا سے تشریف لے جائیں تو پھر آپ کے جانے کے بعد یہ شرف حاصل نہیں ہوسکتا۔ لیکن حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ نے حضور اقدس ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں لیکن میری والدہ بیمار ہیں، اور ان کو میری خدمت کی ضرورت ہے، آنحضرت ﷺ نے ان کو حاضر ہونے سے منع فرما دیا۔ اور یہ فرما دیا کہ تم یہاں میری زیارت اور ملاقات کے لیے مت آؤ۔ بلکہ والدہ کی خدمت کرو۔ (۱)

بھلا بتلائیے! کیسا بھی صاحب ایمان ہو، اس کے دل میں حضور ﷺ کی زیارت کا کتنا شوق ہوگا۔ اور جب آپ اس دنیا میں بقید حیات تھے، اس وقت آپ سے ملاقات اور آپ کی زیارت کا شوق کا کیا عالم ہوگا جب کہ آج یہ حالت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے امتی آپ کے روضہ اقدس کی زیارت کے لیے کتنے بے تاب اور بے چین رہتے ہیں، کہ ایک مرتبہ حاضری ہو جائے، اور روضہ اقدس کی زیارت ہو جائے۔ لیکن آپ کی زیارت کے شوق، اس کی بے چینی اور بیتابی کو ماں کی خدمت پر قربان کر دیا، آپ نے حکم فرما دیا کہ ماں کی خدمت کرو، اور میری زیارت اور ملاقات کی سعادت کو چھوڑ دو، چنانچہ حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ نے آپ کے حکم پر اس سعادت کو چھوڑ دیا۔ جس کے نتیجے میں ''صحابیت'' کا مقام چھوٹ گیا۔ اس لیے کہ ''صحابیت'' کا درجہ آپ کی ملاقات اور زیارت پر

(۱) صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل أویس القرني، رقم: ٤٦١٣، مسند أحمد، رقم: ٢٥٧، سنن الدارمي، المقدمة، رقم: ٤٤٠

موقوف ہے اور ''صحابی'' وہ مقام ہے کہ کوئی شخص ولایت اور بزرگی کے چاہے کتنے بڑے مقام پر پہنچ جائے مگر وہ کسی ''صحابی'' کے گرد تک نہیں پہنچ سکتا۔

''صحابیت'' کا مقام

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ تبع تابعین میں سے ہیں۔ مشہور بزرگ فقیہ، محدث گزرے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے ان سے ایک عجیب سوال کیا۔ سوال یہ کیا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ افضل ہیں، یا حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ؟ سوال کرنے والے شخص نے یہ سوال اس طرح ترتیب دیا کہ صحابہ کرام میں سے ان صحابی کا انتخاب کیا جن کے بارے میں لوگوں نے طرح طرح کی مختلف باتیں مشہور کر رکھی ہیں، اور اہل سنت کا یہ عقیدہ ہے کہ جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی لڑائی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہوئی تو اس لڑائی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ برحق تھے، اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے اجتہادی غلطی ہوئی تھی۔ اس عقیدے پر تقریباً ساری امت متفق ہے۔ بہرحال! صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تو ان صحابی کو لیا جن کی شخصیت متنازع فیہ رہی ہے، اور دوسری طرف سوال میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کا انتخاب کیا۔ جن کو عدل وانصاف اور تقویٰ طہارت وغیرہ میں ''عمر ثانی'' کہا جاتا ہے۔ اور یہ دوسری صدی ہجری کے مجدد ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت اونچا مقام عطا فرمایا تھا۔ بہرحال! حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے اس سوال کے جواب میں فرمایا کہ بھائی! تم یہ پوچھ رہے ہو کہ حضرت معاویہ افضل ہیں یا حضرت عمر بن عبدالعزیز افضل ہیں؟ ارے! حضرت معاویہ تو درکنار حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد کرتے ہوئے جو مٹی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی ناک میں گئی تھی، وہ مٹی بھی ہزار عمر بن عبدالعزیز سے افضل ہے، اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی بدولت اللہ تعالیٰ نے ''صحابیت'' کا جو مقام حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو عطا فرمایا تھا، ساری زندگی انسان کوشش کرتا رہے، تب بھی ''صحابیت'' کا وہ مقام حاصل نہیں کر سکتا''(۱)

ماں کی خدمت کرتے رہو

بہرحال! حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کو یہ فرما دیا کہ ہماری زیارت کی ضرورت نہیں، اور ''صحابیت'' کا مقام حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ماں کی خدمت کرو۔ اگر ہم جیسا کوئی ناداشناس ہوتا تو یہ کہتا کہ یہ ''صحابیت'' کی دولت بعد میں تو ملنے والی نہیں، اگر ماں بیمار ہے

(۱) البدایة والنهایة (۱۳۹/۱)

تو کیا ہوا، کسی نہ کسی ضرورت کے تحت گھر سے باہر نکلنا ہوتا ہی ہے، اس لیے اس ضرورت کے تحت گھر سے چلے جاؤ۔ اور جا کر نبی کریم ﷺ کی زیارت کر کے واپس آ جاؤ۔ مگر وہاں تو اپنا شوق پورا کرنا پیش نظر نہیں تھا، اپنی ذاتی خواہش پوری نہیں کرنی تھی۔ بلکہ وہاں تو صرف اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کا شوق تھا۔ اس لیے آپ کی زیارت کو چھوڑ دیا۔ اور گھر میں ماں کی خدمت میں لگے رہے حتیٰ کہ حضور نبی کریم ﷺ کا وصال ہو گیا، اور حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی زیارت نہ کر سکے۔

ماں کی خدمت کا صلہ

پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کو ماں کی خدمت کا یہ صلہ عطا فرمایا کہ حضور اقدس ﷺ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اے عمر! کسی زمانے میں ''قرن'' یعنی یمن کے علاقے سے ایک آدمی مدینہ آئے گا۔ جس کے یہ اوصاف یہ حلیہ ہوگا، جب یہ آدمی تمہیں مل جائے تو اے عمر! اپنے حق میں ان سے دعا کرانا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ان کی دعائیں قبول فرمائیں گے۔

چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ جب بھی یمن سے کوئی قافلہ مدینہ طیبہ آتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ جا کر ان سے سوال کرتے کہ اس قافلے میں اویس قرنی نامی کوئی شخص ہیں؟ جب ایک مرتبہ قافلہ آیا اور آپ کو معلوم ہو گیا کہ اس میں اویس قرنی تشریف لائے ہیں۔ تو آپ بہت خوش ہوئے، جا کر ان سے ملاقات کی اور ان کا نام دریافت کیا اور جو حلیہ نبی کریم ﷺ نے بتایا تھا۔ وہ حلیہ بھی موجود تھا۔ تو پھر آپ نے ان سے درخواست کی کہ آپ میرے حق میں دعا فرمائیں۔ حضرت اویس قرنی نے سوال کیا کہ آپ مجھ سے دعا کرانے کیوں کر تشریف لائے؟ اس پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے یہ وصیت فرمائی تھی کہ جب ''قرن'' سے یہ صاحب آئیں تو ان سے اپنے حق میں دعا کرانا، اللہ تعالیٰ ان کی دعا کو قبول فرمائیں گے۔ جب حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ نے یہ سنا کہ حضور اقدس ﷺ نے یہ فرمایا تھا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کہ حضور اقدس ﷺ نے مجھے یہ نسبت عطا فرمائی۔(۱)

دیکھئے! حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اپنے حق میں دعا کراؤ۔ یہ چیز ان کو کس طرح حاصل ہوئی یہ چیز ان کو والدہ کی خدمت اور نبی کریم ﷺ کی اطاعت

(۱) صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل أويس القرني، رقم: ٤٦١٣، مسند أحمد، رقم: ٢٥٧، سنن الدارمي، المقدمة، رقم: ٤٤٠

کی بدولت حاصل ہوئی۔ انہوں نے یہ دیکھا کہ میرے حضور ﷺ نے مجھے جس کام کا حکم دیا ہے۔ اب میں اس پر عمل کروں گا چاہے کچھ ہو جائے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جاںنثاری

کون صحابی ایسا تھا جو حضور اقدس ﷺ کا جاںنثار اور وفا کار نہ ہو، میں نے ایک مضمون میں ایک بات لکھی اور وہ بات صحیح لکھی تھی کہ ہر صحابی کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی شخص اپنی جان دے کر کسی دوسرے کی زندگی میں اضافہ کرنے کے قابل ہوتا تو تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سرکار دو عالم ﷺ کی زندگی کے ایک سانس کے اوپر اپنی ساری جانیں نچھاور کرنے کے لیے تیار ہو جاتے، وہ صحابہ اتنے فدا کار تھے ان کا تو یہ حال تھا کہ وہ کسی وقت یہ نہیں چاہتے کہ حضور ﷺ کا جلوۂ انور نگاہوں سے روپوش ہو، یہاں تک جنگ کے میدان میں بھی یہ بات گوارہ نہیں تھی۔

حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ، جن کو جنگ احد میں حضور اقدس ﷺ نے اپنے دست مبارک سے تلوار عطا فرمائی تھی۔ چنانچہ جب دشمنوں کی طرف مقابلے کے لیے نکلے تو اس وقت دشمنوں کی طرف سے حضور اقدس ﷺ پر تیروں کی بوچھاڑ آ رہی تھی۔ اس وقت حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ تیروں کی طرف پشت کر کے اور حضور اقدس ﷺ کی طرف چہرہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ اور سارے تیر اپنی پشت پر لینے لگے۔ سینے پر اس لیے نہ لیے کہ اگر تیروں کو اپنے سینے پر سامنے سے روکیں تو حضور اقدس ﷺ کی طرف پشت ہوتی۔ اور حضور اقدس ﷺ کا جلوہ جہاں آراء نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ لہٰذا جنگ کی حالت میں بھی یہ احتیاط کہ پشت حضور اقدس ﷺ کی طرف نہ ہو، بلکہ پشت تیروں کی طرف رہے۔ اور چہرہ حضور اقدس ﷺ کی طرف ہو۔(۱)

بہر حال! صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو اپنا ایک ایک لمحہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں گزارنے کے لیے بے چین تھے لیکن حضور اقدس ﷺ نے ان صحابہ میں سے کسی کو شام بھیج دیا۔ کسی کو یمن بھیج دیا، کسی کو مصر بھیج دیا، اور یہ حکم دیا کہ وہاں جا کر میرے دین کا پیغام پہنچاؤ۔ جب یہ حکم آ گیا تو اب حضور کی خدمت میں رہنے کا شوق قربان کر دیا۔ اور حضور اقدس ﷺ کے حکم کی تعمیل کو مقدم رکھا۔ اور مدینہ طیبہ سے روانہ ہو گئے۔

ہمارے حضرت والا ایک عجیب بات بیان فرمایا کرتے تھے، یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ کہ دین وقت کے تقاضے پر عمل کرنے کا نام ہے۔ یہ دیکھو کہ اس وقت کا کیا تقاضا ہے؟ وہ کام انجام دو،

(۱) المعجم الکبیر، رقم: ۱۵۳۵٦ (۳۳٦/۱۳)، مجمع الزوائد (۱۱۳/٦)

لہٰذا اگر وقت کا تقاضا والدین کی خدمت ہے، پھر جہاد بھی اس کے آگے بے حقیقت ہے تبلیغ بھی اس کے آگے بے حقیقت ہے، پھر نماز باجماعت بھی اس کے آگے بے حقیقت ہے، چاہے ان سب عبادات کے اپنے فضائل کتنے زیادہ ہوں اس لیے ہمیشہ اس بات کو مدنظر رکھنا چاہیے۔

والدین کی خدمت گزاری کی اہمیت

والدین کی خدمت کے بارے میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے یہ بیان فرمادیا کہ والدین کی خدمت ساری عبادتوں پر مقدم ہے، چنانچہ قرآن کریم میں والدین کی خدمت کے بارے میں ایک دو نہیں بلکہ متعدد آیات نازل فرمائیں، چنانچہ ایک آیت میں ارشاد فرمایا کہ

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا﴾(۱)

یعنی ہم نے انسان کو والدین کے ساتھ اچھائی کرنے کی نصیحت کی کہ والد کے ساتھ اچھائی کا معاملہ کرو اور ایک دوسری آیت میں ارشاد فرمایا:

﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾(۲)

یعنی ایک یہ کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اور دوسرے یہ کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو، دیکھئے اس آیت میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کو توحید کے ساتھ ملا کر ذکر کیا، کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ توحید، اور والدین کے ساتھ حسن سلوک گویا کہ توحید کے بعد انسان کا سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ وہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کرے۔

جب والدین بوڑھے ہو جائیں......

پھر اس کے آگے کیا خوبصورت انداز میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ﴾(۳)

یعنی اگر تمہاری زندگی میں تمہارے والدین بڑھاپے کو پہنچ جائیں۔ تو پھر ان والدین کو کبھی ''اف'' بھی مت کہنا۔ اور بڑھاپے کا ذکر اس لیے کیا کہ جب ماں باپ بوڑھے ہو جاتے ہیں تو بڑھاپے کے اثر سے بعض اوقات ذہن نارمل نہیں رہتا۔ اور اس کی وجہ سے بعض اوقات غلط ملط

---

(۱) العنکبوت:۸

(۲) الاسراء: ۲۳

(۳) الاسراء: ۲۳

باتوں پر اصرار بھی کرتے ہیں، اس لیے خاص طور پر بڑھاپے کا ذکر کیا کہ چاہے ماں باپ وہ باتیں کہہ رہے ہیں جو تمہارے خیال میں غلط اور ناحق ہی کیوں نہ ہوں، لیکن تمہارا کام یہ ہے کہ ''اف'' بھی مت کہو، اور ان سے جھڑک کر بات نہ کرنا، اور ان سے ہمیشہ عزت کے ساتھ بات کرنا، اور آگے فرمایا کہ

﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيْرًا﴾(۱)

ان کے سامنے اپنے آپ کو ذلیل کر کے رکھنا، اور یہ دعا مانگتے رہنا کہ یا اللہ! ان کے اوپر رحمت فرمایئے۔ جس طرح انہوں نے مجھے بچپن میں پالا تھا۔ بڑھاپے کے اندر اگر ماں باپ کے مزاج میں ذرا سا چڑچڑاپن پیدا ہو گیا تو اس سے گھبرا کر ''اف'' مت کہو، اس کا خاص طور پر ذکر فرمایا۔

ڈائری کا ایک ورق

میں نے ایک کتاب میں ایک قصہ پڑھا تھا۔ معلوم نہیں کہ سچا ہے یا جھوٹا، لیکن بڑا سبق آموز واقعہ ہے، وہ یہ کہ ایک صاحب بوڑھے ہو گئے، انہوں نے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلا کر فاضل بنا دیا۔ ایک دن گھر کے صحن میں باپ بیٹھے ہوئے تھے، اتنے میں ایک کوا گھر کی دیوار پر آ کر بیٹھ گیا تو باپ نے بیٹے سے پوچھا کہ بیٹا! یہ کیا چیز ہے؟ اس نے کہا: ابا جان! یہ کوا ہے، تھوڑی دیر کے بعد پھر باپ نے پوچھا بیٹا! یہ کیا ہے؟ بیٹے نے کہا: ابا جان! ابھی تو آپ کو بتایا تھا کہ یہ کوا ہے، تھوڑی دیر گزرنے کے بعد پھر باپ نے پوچھا کہ بیٹا! یہ کیا ہے؟ اب بیٹے کے لہجے میں تبدیلی آ گئی اور اس نے جھڑک کر کہا کہ ابا جان! کوا ہے کوا، پھر تھوڑی دیر کے بعد باپ نے پوچھا کہ بیٹا! یہ کیا ہے۔ اب بیٹے سے رہا نہ گیا۔ اس نے کہا کہ آپ ہر وقت ایک بات پوچھتے رہتے ہیں ہزار مرتبہ کہہ دیا کہ یہ کوا ہے؟ آپ کی سمجھ میں نہیں آتی۔ بہر حال، اس طرح بیٹے نے باپ کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد باپ اپنے کمرے میں اٹھ کر گیا اور ایک پرانی ڈائری نکال کر لایا، اور اس ڈائری کا ایک صفحہ کھول کر بیٹے کو دکھاتے ہوئے کہا کہ بیٹا! یہ ذرا پڑھنا، کیا لکھا ہے؟ چنانچہ اس نے پڑھا تو اس میں یہ لکھا تھا کہ آج میرا چھوٹا بیٹا صحن میں بیٹھا ہوا تھا۔ اور میں بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک کوا آ گیا، تو بیٹے نے مجھ سے ۲۵ مرتبہ پوچھا کہ ابا جان یہ کیا ہے؟ تو میں نے ۲۵ مرتبہ اس کو جواب دیا کہ بیٹا، یہ کوا ہے، اور مجھے اس ادا پر بڑا پیار آیا۔ اس کے پڑھنے کے بعد باپ نے کہا! بیٹا دیکھو! باپ اور بیٹے میں یہ فرق

---

(۱) الاسراء: ۲۴

ہے، جب تم بچے تھے تو تم نے مجھ سے ۲۵ مرتبہ پوچھا۔ اور میں نے ۲۵ مرتبہ بالکل اطمینان سے نہ صرف جواب دیا بلکہ میں نے اس بات کا اظہار کیا کہ مجھے اس کی ادا پر بڑا پیار آیا، آج جب میں نے تم سے صرف ۵ مرتبہ پوچھا تو تمہیں اتنا غصہ آ گیا۔

والدین کے ساتھ حسن سلوک

بہرحال! اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ یہ بات یاد رکھو! کہ بڑھاپے کی عمر تک پہنچنے کے بعد ماں باپ کے اندر تھوڑا سا چڑچڑا پن بھی پیدا ہو جائے گا۔ ان کی بہت سی باتیں ناگوار بھی معلوم ہوں گی۔ لیکن اس وقت تم یہ یاد رکھنا کہ تمہارے بچپن میں اس سے کہیں زیادہ ناگوار باتیں تمہارے ماں باپ نے برداشت کی ہیں۔ لہٰذا تمہیں بھی ان کی ناگوار باتوں کو برداشت کرنا ہے، یہاں تک کہ اگر ماں باپ کافر بھی ہوں تو ان کے بارے میں بھی قرآن کریم نے فرمایا:

﴿وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا﴾(۱)

یعنی اگر تمہارے والدین کافر مشرک ہوں، تو پھر شرک میں تو ان کی اطاعت مت کرنا لیکن عام زندگی کے اندر ان کے ساتھ حسن سلوک پھر بھی ضروری ہے، اس لیے کہ اگرچہ وہ کافر ہے، لیکن تمہارا باپ ہے، تو والدین کی اطاعت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی اتنی تاکید فرمائی ہے، آج کی دنیا ہر معاملے میں الٹی جارہی ہے، اب تو باقاعدہ اس بات کی تربیت دی جارہی ہے کہ والدین کی اطاعت، ان کا احترام ان کی عظمت کا نقش اولاد کے دلوں سے مٹا دیا جائے۔ اور باقاعدہ اس کی تربیت ہو رہی ہے، اور یہ کہا جاتا ہے کہ ماں باپ بھی انسان ہیں، اور ہم بھی انسان ہیں، ہم میں اور ان میں کیا فرق ہے، ان کا ہم پر کیا حق ہے۔

جب انسان دین سے دور ہو جاتا ہے، اور اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کا جذبہ ماند پڑ جاتا ہے، اور آخرت کی فکر ختم ہو جاتی ہے تو اس وقت اس قسم کی باتیں پیدا ہو جاتی ہیں، اللہ تعالیٰ اس سے ہماری حفاظت فرمائے۔ آمین

والدین کی نافرمانی کا وبال

بہرحال! یہ عرض کرنا تھا کہ والدین کی اطاعت واجب ہے اگر والدین کسی کام کا حکم دیں تو

(۱) لقمان: ۱۵

وہ کام کرنا اولاد کے ذمے شرعاً فرض ہو جاتا ہے، اور بالکل ایسا فرض ہو جاتا ہے جیسا کہ نماز پڑھنا فرض ہے بشرطیکہ ماں باپ جس کام کا حکم دے رہے ہیں، وہ شرعاً جائز ہو۔ اور اگر اولاد وہ کام نہ کرے تو یہ ایسا گناہ ہے، جیسا نماز چھوڑ دینا گناہ ہے، اسی کو ''عقوق الوالدین'' کہا جاتا ہے، یعنی والدین کی نافرمانی، اور بزرگوں نے فرمایا کہ والدین کی نافرمانی کا وبال یہ ہوتا ہے کہ مرتے وقت کلمہ نصیب نہیں ہوتا۔

ایک عبرت ناک واقعہ

ایک شخص کا واقعہ لکھا ہے کہ اسی کی موت کا وقت آ گیا، اور نزع کا وقت ہے، سب لوگ یہ کوشش کر رہے ہیں کہ زبان سے کلمہ پڑھ لے۔ مگر زبان پر کلمہ جاری نہیں ہوتا، چنانچہ لوگ ایک بزرگ کو لائے، اور ان سے پوچھا کہ اس کا کیا حل نکالا جائے اس کی زبان پر کلمہ جاری نہیں ہو رہا ہے، ان بزرگ نے فرمایا کہ اگر اس کی والدہ یا والد حیات ہوں تو ان سے اس کے لیے معافی مانگو، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے والدین کی نافرمانی کی ہے، اس کے نتیجے میں اس پر یہ وبال آیا ہے، اور جب تک ان کی طرف سے معافی نہیں ہوگی، اس وقت تک اس کی زبان پر کلمہ جاری نہیں ہوگا۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ والدین کہ نافرمانی کرنا، اور ان کا دل دکھانا کتنی خطرناک اور وبال کی چیز ہے، حضور نبی کریم ﷺ نے ہر ہر قدم پر اپنی تعلیمات میں والدین کا احترام، اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا لحاظ رکھا۔ جو صحابہ آپ سے مشورہ کرنے آتے تو آپ ان کو حسن سلوک کا مشورہ دیتے۔

علم کے لیے والدین کی اجازت

ہمارے ہاں دارالعلوم میں بعض مرتبہ بعض طالب علم داخلے کے لیے آتے ہیں، ان کو پڑھنے کا شوق ہے۔ عالم بننے اور درس نظامی پڑھ کر فارغ التحصیل ہونے کا شوق ہے، لیکن جب ان سے پوچھا جاتا کہ والدین کی اجازت سے آئے ہو؟ تو معلوم ہوتا کہ والدین کی اجازت کے بغیر آئے ہیں، اور وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم کیا کریں والدین ہمیں اجازت نہیں دے رہے تھے، اس لیے ہم بغیر اجازت کے چلے آئے ہیں میں ان سے کہتا ہوں کہ یاد رکھیں، مولوی بننا کوئی فرض نہیں والدین کی اطاعت کرنا فرض ہے ہاں! اگر والدین اتنا علم بھی حاصل کرنے سے روک دیں جس سے انسان ایک مسلمان جیسی زندگی گزار سکے، مثلاً نماز کا طریقہ سیکھنے سے روکیں، تو اس صورت میں والدین کی اطاعت نہیں، لیکن مولوی بننا (پورے دین کا علم حاصل کرنا) فرض وو واجب نہیں، لہٰذا جب تک

والدین اس کی اجازت نہ دیں اس وقت تک وہ نہ کرے، اور اگر اجازت کے بغیر مولوی بننے میں لگے گا تو وہی بات ہوگی جو ہمارے حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ اپنا شوق پورا کرنا ہوگا۔ یہ دین کا کام نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی حقیقت سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

جنت حاصل کرنے کا آسان راستہ

یاد رکھو! جب تک والدین حیات ہیں تو وہ اتنی بڑی نعمت ہیں کہ اس روئے زمین پر انسان کے لیے اس سے بڑی نعمت کوئی اور نہیں جیسا کہ حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اگر ماں باپ کو محبت اور پیار کی نظر سے دیکھ لو تو ایک حج اور ایک عمرہ کا ثواب ہے۔(۱)

اس لیے ایک دوسری حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مردود ہو وہ شخص جو اپنے والدین کو بڑھاپے کی حالت میں پائے، پھر وہ ان کی خدمت کر کے اپنے گناہ معاف نہ کرالے۔(۲)

اس لیے کہ اگر ماں باپ بوڑھے ہیں تو جنت حاصل کرنا اتنا آسان ہے جس کی کوئی حد نہیں، ذرا سی ان کی خدمت کر لو گے تو ان کے دل سے دعا نکل جائے گی۔ اور تمہاری آخرت سنور جائے گی۔ بہانے بہانے سے تم جنت کما سکتے ہو، بہر حال! والدین جب تک حیات ہوں ان کو نعمت سمجھ کر ان کی قدر کریں، اس لیے کہ جب والدین اٹھ جاتے ہیں تو اس وقت حسرت ہوتی ہے کہ ہم نے زندگی کے اندر ان کی کوئی قدر نہ کی، ان کے ساتھ حسن سلوک کر کے جنت نہ کمائی، بعد میں افسوس ہوتا ہے۔

والدین کی وفات کے بعد تلافی کی صورت

اکثر و بیشتر یہ ہوتا ہے کہ والدین کے مرنے کے بعد اولاد کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ہم نے کتنی بڑی نعمت کھو دی اور ہم نے اس کا حق ادا نہ کیا، اس کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے ایک راستہ رکھا ہے، فرمایا کہ اگر کسی نے والدین کے حقوق میں کوتاہی کی ہو، اور ان سے فائدہ نہ اٹھایا ہو، تو اس کی تلافی کے دو راستے ہیں، ایک ان کے لیے ایصال ثواب کی کثرت کرنا۔ جتنا ہو سکے ان کو ثواب پہنچائیں۔ صدقہ دے کر ہو، یا نوافل پڑھ کر ہو، یا قرآن کریم کی تلاوت کر کے ذریعہ ہو، اس کے ذریعہ اس کی تلافی ہو جاتی ہے، دوسرے یہ کہ والدین کے جو اعزہ و اقرباء دوست احباب ہیں، ان

(۱) الدر المنثور (٥/٢٦٤)، جامع الأحاديث، رقم: ٢٠٨٢١ (١٩/٣٠٤)
(۲) مسند أحمد، رقم: ١٨٢٥٤

کے ساتھ حسن سلوک کرے اور ان کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کرے جیسا باپ کے ساتھ کرنا چاہیے اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس کوتاہی کی تلافی فرما دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

ماں کے تین حق باپ کا ایک حق

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: جَآءَ رَجُلٌ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! مَنْ اَحَقُّ النَّاسِ بِحُسْنِ صُحْبَتِیْ؟ قَالَ: ((اُمُّكَ)) قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: ((اُمُّكَ)) قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ ((اُمُّكَ)) قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ ((اَبُوْكَ))(۱)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور آ کر پوچھا کہ یا رسول اللہ! ساری دنیا کے انسانوں میں سب سے زیادہ میرے حسن سلوک کا مستحق کون ہے؟ کس کے ساتھ میں سب سے زیادہ اچھا سلوک کروں؟ آپ نے فرمایا: تمہاری ماں یعنی سارے انسانوں میں سب سے زیادہ تمہارے حسن سلوک کی مستحق تمہاری ماں ہے، ان صاحب نے پھر سوال کیا کہ اس کے بعد کون ہے؟ آپ نے دوبارہ جواب دیا: تمہاری ماں، ان صاحب نے پھر سوال کیا کہ اس کے بعد کون ہے؟ آپ نے پھر جواب دیا: تمہاری ماں ان صاحب نے پھر سوال کیا کہ اس کے بعد کون ہے؟ تو چوتھے نمبر پر فرمایا: تمہارا باپ۔

تین مرتبہ ماں کا نام لیا، آخر میں چوتھے نمبر پر باپ کا نام لیا، اس واسطے علماء کرام نے اس حدیث سے استنباط کرتے ہوئے فرمایا کہ ماں کا حق حسن صحبت میں باپ سے بھی زیادہ ہے ماں کے تین حق ہیں، اور باپ کا ایک حق ہے، اس لیے کہ بچے کی پرورش کے لیے ماں جتنی مشقتیں جھیلتی ہے، باپ اس کا چوتھائی بھی نہیں جھیلتا، اس لیے اللہ تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین حصے ماں کے بیان فرمائے۔ اور ایک حصہ باپ کا بیان فرمایا۔

باپ کی تعظیم، ماں کی خدمت

اسی لیے بزرگوں نے فرمایا کہ اگر کوئی ہدیہ یا تحفہ دینا ہو تو ماں کو زیادہ دینا چاہیے، بزرگوں نے یہ بھی فرمایا کہ دو چیزیں علیحدہ ہیں، ایک ہے ''تعظیم'' اس میں تو باپ کا حق ماں پر مقدم ہے، اور

(۱) صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب بر الوالدین وأنهما أحق به، رقم: ٤٦٢٢

دوسری چیز ہے ''حسن سلوک'' اور ''خدمت'' اس میں ماں کا حق باپ پر مقدم ہے۔لیکن جہاں تک خدمت کا تعلق ہے،اس میں ماں کا حق مقدم ہے،اور باپ کے مقابلے میں تین چوتھائی زیادہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قدرتی طور پر ماں کے اندر یہ بات رکھی ہے کہ ماں کے ساتھ اولاد کی بے تکلفی زیادہ ہوتی ہے، بہت سی باتیں بیٹا کھل کر باپ سے نہیں کہہ سکتا،لیکن ماں کے سامنے وہ کہہ دیتا ہے تو شریعت نے اس کا بھی لحاظ رکھا ہے چنانچہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں بزرگوں کا بیان کیا ہوا یہ اصول لکھا ہے کہ اولاد باپ کی تعظیم زیادہ کرے، اور ماں کی خدمت زیادہ کرے، اس اصول کے ذریعہ احادیث کے درمیان بھی تطبیق ہو جاتی ہے۔

ماں کی خدمت کا نتیجہ

بہرحال! ماں کی خدمت وہ چیز ہے جو انسان کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیتی ہے جیسا کہ آپ نے حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کے واقعے میں دیکھا، اور بھی بہت سے بزرگوں کا یہی حال ذکر کیا گیا ہے، مثلاً امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں یہ بات مشہور ہے، کہ ایک عرصہ تک صرف ماں کی خدمت میں مشغولی کی وجہ سے علم حاصل نہیں کر سکے،لیکن بعد میں جب ان کی خدمت سے فارغ ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے علم کے اندر بہت اونچا مقام عطا فرمایا،لہٰذا اس خدمت کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔

واپس جا کر ان کے ساتھ حسن سلوک کرو

وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمَرِوبْنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: اَقْبَلَ رَجُلٌ اِلٰى نَبِيِّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: اُبَايِعُكَ عَلَى الْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ اَبْتَغِى الْاَجْرَ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى، قَالَ: ((فَهَلْ لَكَ مِنْ وَالِدَيْكَ اَحَدٌ حَيٌّ؟)) قَالَ: نَعَمْ، بَلْ كِلَاهُمَا، قَالَ: ((فَتَبْتَغِى الْاَجْرَ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى؟)) قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: ((فَارْجِعْ اِلٰى وَالِدَيْكَ فَاَحْسِنْ صُحْبَتَهُمَا))(۱)

یہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، فرماتے ہیں کہ ایک شخص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں آپ کے پاس دو چیزوں پر بیعت کرنے آیا ہوں، ایک ہجرت پر اور ایک

(۱) صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب الوالدين وأنهما أحق به، رقم: ٤٦٢٤، مسند أحمد، رقم: ٦٢٣٩

جہاد پر، یعنی میں اپنا وطن چھوڑ کر مدینہ طیبہ میں رہنے کے لیے ہجرت کے ارادے سے آیا ہوں، اور آپ کے ساتھ جہاد کرنے کی نیت سے آیا ہوں، اور میں اپنے اللہ تعالیٰ سے اجر وثواب کا طلب گار ہوں، تو آپ ﷺ نے اس سے پوچھا کہ کیا تمہارے والدین میں سے کوئی زندہ ہے؟ اس شخص نے جواب دیا ہاں بلکہ والد اور والدہ دونوں زندہ ہیں، آپ نے فرمایا کہ کیا تم واقعی اجر وثواب چاہتے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ جی ہاں! یا رسول اللہ، آپ نے جواب دیا کہ میرے ساتھ جہاد کرنے کے بجائے تم اپنے والدین کے پاس واپس جاؤ، اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرو"

دیکھئے! اس حدیث میں اپنے ساتھ جہاد کرنے کی فضیلت کو والدین کے ساتھ حسن سلوک پر قربان فرمادیا، اور ان کو واپس فرمادیا، ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ جہاد کی تیاری ہورہی تھی، ایک صاحب حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں جہاد میں شریک ہونے کے لیے آیا ہوں، اور فخر کے طور پر بیان کیا کہ میں جہاد میں شرکت کرنے کا اتنا سچا طالب ہوں کہ جہاد میں شرکت کے لیے اپنے والدین کو روتا چھوڑ کر آیا ہوں، مطلب یہ تھا کہ میرے والدین مجھے نہیں چھوڑتے تھے، اور مجھے جہاد میں شرکت کی اجازت نہیں دے رہے تھے، لیکن اس کے باوجود میں ان کو اس حالت میں چھوڑ کر آیا ہوں کہ وہ میری جدائی کی وجہ سے رو رہے تھے، تو آنحضرت ﷺ نے اس شخص سے فرمایا:

((اِرْجِعْ فَاَضْحِکْهُمَا کَمَا اَبْکَیْتَهُمَا))(۱)

واپس جاؤ، اور ان کو جس طرح روتا چھوڑا تھا، اب جا کر ان کو ہنساؤ اور ان کو راضی کرو، تمہیں میرے ساتھ جہاد پر جانے کی اجازت نہیں۔

دین "حفظ حدود" کا نام ہے

یہ ہے حفظ حدود، اسی لیے ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ دین نام ہے "حفظ حدود" کا یہ کوئی دین نہیں کہ جب جہاد کی فضیلت سن لی تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جہاد کے لیے روانہ ہوگئے۔ بلکہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے حکموں کی رعایت کرتے ہوئے ہر موقع پر کام کرنا ہوتا ہے، میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ آج کل لوگ یک باگے ہوگئے ہیں،

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب الجهاد، باب افي الرجل يغزو وأبواه كارهان، رقم: ٢١٦٦، سنن ابن ماجه، كتاب الجهاد، باب الرجل يغزو وله أبهران، رقم: ٢٧٧٢، مسند أحمد: ٦٦١٥

جیسے اگر گھوڑے کی ایک باگ ہو تو وہ ایک صرف ایک ہی طرف چلے گا۔ دوسری طرف دھیان بھی نہیں دے گا، اسی طرح لوگ بھی یک باگ ہو گئے، یعنی جب یہ سن لیا کہ فلاں کام بڑی فضیلت والا ہے بس اس کی طرف دوڑ پڑے۔ اور یہ نہیں دیکھا کہ ہمارے ذمہ اور کیا حقوق واجب ہیں، اور دوسرے کاموں کی کیا حد ہے؟

اہل اللہ کی صحبت

اور یہ ''حفظ حدود'' کی بات عادۃ اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی، جب تک کسی اللہ والے کی صحبت میسر نہ آئے، زبان سے میں نے بھی کہہ دیا، اور آپ نے سن بھی لیا، کتابوں میں بھی یہ بات لکھی ہے، لیکن کس موقع پر کیا طرز عمل اختیار کرنا ہے، اور کس موقع پر کس چیز کو ترجیح دینی ہے، یہ بات کسی کامل شیخ کی صحبت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی، اور آدمی افراط وتفریط ہی میں مبتلا رہتا ہے شیخ کامل ہی بتاتا ہے کہ اس وقت کیا کام کرنا ہے، وہ بتاتا ہے کہ اس وقت میرے لیے کیا چیز بہتر ہے، اور کیا چیز بہتر نہیں، حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس اصلاح کے لیے لوگ آتے تو آپ بہت سے لوگوں کے وظیفے چھڑا دیتے، اور دوسرے کاموں پر لگا دیتے، اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ اگر یہ اس کام پر لگا رہے گا تو حدود کی حفاظت نہیں کرے گا۔

شریعت، سنت، طریقت

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ ''حقوق'' تمام تر شریعت ہے، یعنی شریعت حقوق کا نام ہے، اللہ کے حقوق، اور بندوں کے حقوق اور ''حدود'' تمام تر سنت ہے یعنی سنت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کس حق کی کیا حد ہے، حق اللہ کی حد کہاں تک ہے، اور حق العبد کی حد کہاں تک ہے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں یہ بتاتی ہیں کہ کس حق پر کس حد تک عمل کیا جائے گا۔ اور ''حفظ حدود'' تمام تر طریقت ہے، یعنی طریقت جس کو تصوف اور سلوک کہا جاتا ہے۔ ان حدود کی حفاظت کا نام ہے، یعنی وہ حدود جو سنت سے ثابت ہیں، ان کی حفاظت تصوف اور سلوک کے ذریعہ ہوتی ہے، خلاصہ یہ ہے کہ ''شریعت'' تمام تر حقوق، سنت تمام تر حدود اور طریقت تمام تر حفظ حدود، بس! اگر یہ تین چیزیں حاصل ہو جائیں تو پھر کسی چیز کی حاجت نہیں، لیکن یہ چیزیں اس وقت تک حاصل نہیں ہوتیں جب تک انسان کسی اللہ والے کے سامنے رگڑے نہ کھائے اور کسی شیخ کامل کے حضور اپنے آپ کو پامال نہ کرے۔

قال را بگزار صاحب حال شو
پیش مردے کامل پامال شو

جب تک آدمی کسی مرد کامل کے سامنے اپنے آپ کو پامال نہیں کرے گا۔ اس وقت تک یہ بات حاصل نہیں ہوگی۔ بلکہ افراط وتفریط میں ہی مبتلا رہے گا کبھی ادھر جھک گیا، کبھی ادھر جھک گیا۔ سارے تصوف کا مقصد ہی یہ ہے کہ انسان کو افراط وتفریط سے بچائے اور اس کو اعتدال پر لائے، اور اس کو یہ بتائے کہ کس وقت دین کا کیا تقاضا ہے، اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

☆☆☆

اولاد کی تربیت کیسے کریں؟ ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

﴿يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ﴾(۱)

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے آگے اس کتاب ''ریاض الصالحین'' میں ایک نیا باب قائم فرمایا ہے، جس کے ذریعہ یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ انسان کے ذمے صرف خود اپنی اصلاح ہی واجب نہیں ہے، بلکہ اپنے گھر والوں، اپنے بیوی بچوں اور اپنے ماتحت جتنے بھی افراد ہیں، ان کی اصلاح کرنا ان کو دین کی طرف لانے کی کوشش کرنا، ان کو فرائض و واجبات کی ادائیگی کی تاکید کرنا، اور گناہوں سے اجتناب کی تاکید کرنا بھی انسان کے ذمے فرض ہے اس مقصد کے تحت یہ باب قائم فرمایا ہے، اور اس میں کچھ آیات قرآنی اور کچھ احادیث نبوی نقل کی ہیں۔

خطاب کا پیارا عنوان

یہ آیت جو ابھی میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی، یہ درحقیقت اس باب کا بنیادی عنوان ہے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾

یعنی اے ایمان والو۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے

☆ اصلاحی خطبات (۱/۲۲-۵۰)، ۱۷ جولائی ۱۹۹۲ء، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، گلشن اقبال، کراچی۔ زیر نظر درس امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''ریاض الصالحین'' کے باب نمبر ۳۴ "باب وجوب أمره أهله وأولاده المميزين وسائر من في رعيته بطاعة الله تعالىٰ ونهيهم عن المخالفة وتأديبهم ومنعهم عن ارتكاب منهي عنه" (صفحہ ۱۳۰ تا ۱۳۲) کا درس ہے۔

(۱) التحریم: ٦

خطاب کرنے کے لیے جگہ جگہ ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں، ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ کا عنوان اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے استعمال فرماتے ہیں۔ یہ بڑا پیارا عنوان ہے، یعنی اے ایمان والو، اے وہ لوگو جو ایمان لائے، اس خطاب میں بڑا پیار ہے، اس لیے کہ خطاب کا ایک طریقہ یہ ہے کہ مخاطب کا نام لے کر خطاب کیا جائے، اے فلاں اور خطاب کا دوسرا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کو اس رشتے کا حوالہ دے کر خطاب کیا جائے جو خطاب کرنے والے کا اس سے قائم ہے، مثلاً ایک باپ اپنے بیٹے کو بلائے تو اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اس بیٹے کا نام لے کر اس کو پکارے کہ اے فلاں اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس کو ''بیٹا'' کہہ کر پکارے کہ اے بیٹے، ظاہر ہے کہ بیٹا کہہ کر پکارنے میں جو پیار، جو شفقت اور جو محبت ہے، اور سننے کے لیے اس میں جو لطف ہے، وہ پیار اور لطف نام لے کر پکارنے میں نہیں ہے۔

لفظ ''بیٹا'' ایک شفقت بھرا خطاب

شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی قدس اللہ سرہ، اتنے بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ ہم نے تو ان کو اس وقت دیکھا تھا جب پاکستان میں تو کیا، ساری دنیا میں علم و فضل کے اعتبار سے ان کا ثانی نہیں تھا۔ ساری دنیا میں ان کے علم و فضل کا لوہا مانا جاتا تھا، کوئی ان کو ''شیخ الاسلام'' کہہ کر مخاطب کرتا، کوئی ان کو ''علامہ'' کہہ کر مخاطب کرتا، بڑے تعظیمی القاب ان کے لیے استعمال کیے جاتے تھے، کبھی کبھی وہ ہمارے گھر تشریف لاتے تھے، اس وقت ہماری دادی بقید حیات تھیں، ہماری دادی صاحبہ رشتے میں حضرت علامہ کی ممانی لگتی تھیں، اس لیے وہ ان کو ''بیٹا'' کہہ کر پکارتی تھیں، اور ان کو دعا دیتی تھیں کہ ''بیٹا! جیتے رہو'' جب ہم ان کے منہ سے یہ الفاظ اتنے بڑے علامہ کے لیے سنتے، جنہیں دنیا ''شیخ الاسلام'' کے لقب سے پکار رہی تھی تو اس وقت ہمیں بڑا عجیب محسوس ہوتا تھا، لیکن علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میں حضرت مفتی صاحب (مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ) کے گھر میں دو مقصد سے آتا ہوں۔

ایک یہ کہ حضرت مفتی صاحب سے ملاقات، دوسرے یہ ہے کہ اس وقت روئے زمین پر مجھے ''بیٹا'' کہنے والا سوائے ان خاتون کے کوئی اور نہیں ہے، صرف یہ خاتون مجھے بیٹا کہہ کر پکارتی ہیں، اس لیے میں بیٹا کا لفظ سننے کے لیے آتا ہوں، اس کے سننے میں جو لطف اور پیار محسوس ہوتا ہے وہ مجھے کوئی اور لقب سننے میں محسوس نہیں ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کی قدر اس شخص کو ہوتی ہے جو اس کہنے والے کے جذبے سے آشنا ہو، وہ اس کو جانتا ہے کہ مجھے یہ جو "بیٹا" کہہ کر پکارا جا رہا ہے، یہ کتنی بڑی نعمت ہے، ایک وقت ایسا آتا ہے جب انسان یہ لفظ سننے کو ترس جاتا ہے۔

چنانچہ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ کا خطاب کر کے اس رشتے کا حوالہ دیتے ہیں۔ جو ہر صاحب ایمان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی باپ اپنے بیٹے کو "بیٹا" کہہ کر پکارے، اور اس لفظ کو استعمال کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ آگے جو بات باپ کہہ رہا ہے وہ شفقت، محبت اور خیر خواہی سے بھری ہوئی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی قرآن کریم میں جگہ جگہ ان الفاظ سے مسلمانوں کو خطاب فرما رہے ہیں۔ انہی جگہوں میں سے ایک جگہ یہ ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَیْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ﴾(۱)

اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو بھی آگ سے بچاؤ، وہ آگ کیسی ہے؟ آگے اس آگ کی صفت بیان فرمائی کہ اس آگ کا ایندھن لکڑیاں اور کوئلے نہیں ہے، بلکہ اس آگ کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے، اور اس آگ کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے فرشتے مقرر ہیں جو بڑے غیظ اور تندخو ہیں سخت مزاج ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان کو جس بات کا حکم دیتے ہیں، وہ اس حکم کی کبھی نافرمانی نہیں کرتے، اور وہی کام کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔

ذاتی عمل نجات کے لیے کافی نہیں

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرما دیا کہ بات صرف یہاں تک ختم نہیں ہوتی کہ بس اپنے آپ کو آگ سے بچا کر بیٹھ جاؤ، اور اس سے مطمئن ہو جاؤ کہ بس میرا کام ہو گیا، بلکہ اپنے اہل و عیال کو بھی آگ سے بچانا ضروری ہے آج یہ منظر بکثرت نظر آتا ہے کہ آدمی اپنی ذات میں بڑا دیندار ہے، نماز و کا اہتمام ہے، صف اول میں حاضر ہو رہا ہے، روزے رکھ رہا ہے، زکوٰۃ ادا کر رہا ہے، اللہ کے راستے میں مال خرچ کر رہا ہے، اور جتنے اوامر و نواہی ہیں، ان پر عمل کرنے کی کوشش کر رہا ہے، لیکن اس کے گھر کو دیکھو، اس کی اولاد کو دیکھو، بیوی بچوں کو دیکھو تو ان میں اور اس میں زمین آسمان کا فرق ہے، یہ کہیں جا رہا ہے، وہ کہیں جا رہے ہیں، اس کا رخ مشرق کی طرف ہے، ان کا رخ

(۱) التحریم: ٦

مغرب کی طرف ہے، ان میں نماز کی فکر ہے، نہ فرائض دینیہ کو بجا لانے کا احساس ہے، اور نہ گناہوں کو گناہ سمجھنے کی فکر ہے، بس: گناہوں کے سیلاب میں بیوی بچے بہہ رہے ہیں، اور یہ صاحب اس پر مطمئن ہیں کہ میں صف اول میں حاضر ہوتا ہوں، اور با جماعت نماز ادا کرتا ہوں، خوب سمجھ لیں۔ جب اپنے گھر والوں کو آگ سے بچانے کی فکر نہ ہو، خود انسان کی اپنی نجات نہیں ہوسکتی، انسان یہ کہہ کر جان نہیں بچا سکتا کہ میں تو خود اپنے عمل کا مالک تھا، اگر اولاد دوسری طرف جا رہی تھی تو میں کیا کرتا، اس لیے کہ ان کو بچانا بھی تمہارے فرائض میں شامل تھا، جب تم نے اس میں کوتاہی کی تو اب آخرت میں تم سے مواخذہ ہوگا۔

اگر اولاد نہ مانے تو کیا کریں؟

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ، درحقیقت اس میں ایک شبہ کے جواب کی طرف اشارہ فرمایا جو شبہ عام طور پر ہمارے دلوں میں پیدا ہوتا ہے وہ شبہ یہ ہے کہ آج جب لوگوں سے یہ کہا جاتا ہے کہ اپنی اولاد کو بھی دین کی تعلیم دو، کچھ دین کی باتیں ان کو سکھاؤ، ان کو دین کی طرف لاؤ، گناہوں سے بچانے کی فکر کرو، تو اس کے جواب میں عام طور پر بکثرت لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اولاد کو دین کی طرف لانے کی بڑی کوشش کی، مگر کیا کریں کہ ماحول اور معاشرہ اتنا خراب ہے کہ بیوی بچوں کو بہت سمجھایا، مگر وہ مانتے نہیں ہیں اور زمانے کی خرابی سے متاثر ہو کر انہوں نے دوسرا راستہ اختیار کر لیا ہے، اور اس راستے پر جا رہے ہیں۔ اور راستہ بدلنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اب ان کا عمل ان کے ساتھ ہے ہمارا عمل ہمارے ساتھ ہے، اب ہم کیا کریں۔ اور دلیل میں یہ پیش کرتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا تو آخر کار کافر رہا، اور حضرت نوح علیہ السلام اس کو طوفان سے نہ بچا سکے، اسی طرح ہم نے بہت کوشش کر لی ہے، وہ نہیں مانتے تو ہم کیا کریں؟

دنیاوی آگ سے کس طرح بچاتے ہو؟

چنانچہ قرآن کریم نے اس آیت میں ''آگ'' کا لفظ استعمال کر کے اس اشکال اور شبہ کا جواب دیا ہے۔ وہ یہ کہ یہ بات ویسے اصولی طور پر تو ٹھیک ہے کہ اگر ماں باپ نے اولاد کو بے دینی سے بچانے کی اپنی طرف سے پوری کوشش کر لی ہے تو ان شاء اللہ ماں باپ پھر بری الذمہ ہو جائیں گے، اور اولاد کے کیے کا وبال اولاد پر پڑے گا۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ماں باپ نے اولاد کو بے دینی

سے بچانے کی کوشش کس حد تک کی ہے؟ اور کس درجے تک کی ہے؟ قرآن کریم نے ''آگ'' کا لفظ استعمال کر کے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ ماں باپ کو اپنی اولاد کو گناہوں سے اس طرح بچانا چاہیے جس طرح ان کو آگ سے بچاتے ہیں۔

فرض کریں کہ ایک بہت بڑی خطرناک آگ سلگ رہی ہے، جس آگ کے بارے میں یقین ہے کہ اگر کوئی شخص اس آگ کے اندر داخل ہو گیا تو زندہ نہیں بچے گا، اب آپ کا نادان بچہ اس آگ کو خوش منظر اور خوبصورت سمجھ کر اس کی طرف بڑھ رہا ہے، تو اب بتاؤ تم اس وقت کیا کرو گے؟ کیا تم اس پر اکتفا کرو گے کہ دور سے بیٹھ کر بچے کو نصیحت کرنا شروع کر دو کہ بیٹا! اس آگ میں مت جانا۔ یہ بڑی خطرناک چیز ہوتی ہے۔ اگر جاؤ گے تو تم جل جاؤ گے، اور مر جاؤ گے؟ کیا کوئی صرف زبانی نصیحت پر اکتفا کرے گا؟ اور اس نصیحت کے باوجود اگر بچہ اس آگ میں چلا جائے تو کیا وہ ماں باپ یہ کہہ کر بری الذمہ ہو جائیں گے کہ ہم نے تو اس کو سمجھا دیا تھا۔ اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔ اس نے نہیں مانا اور خود ہی اپنی مرضی سے آگ میں کود گیا تو میں کیا کروں؟ دنیا میں کوئی ماں باپ ایسا نہیں کریں گے، اگر وہ اس بچے کے حقیقی ماں باپ ہیں تو اس بچے کو آگ کی طرف بڑھتا ہوا دیکھ کر ان کی نیند حرام ہو جائے گی، ان کی زندگی حرام ہو جائے گی اور جب تک اس بچے کو گود میں اٹھا کر اس آگ سے دور نہیں لے جائیں گے، اس وقت تک ان کو چین نہیں آئے گا۔

اللہ تعالیٰ یہ فرما رہے ہیں کہ جب تم اپنے بچے کو دنیا کی معمولی سی آگ سے بچانے کے لیے صرف زبانی جمع خرچ پر اکتفا نہیں کرتے تو جہنم کی وہ آگ جس کی حد و نہایت نہیں، اور جس کا دنیا میں تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس آگ سے بچے کو بچانے کے لیے زبانی جمع خرچ کو کافی کیوں سمجھتے ہو؟ لہٰذا یہ سمجھنا کہ ہم نے انہیں سمجھا کر اپنا فریضہ ادا کر لیا، یہ بات آسانی سے کہنے کی نہیں ہے۔

آج دین کے علاوہ ہر چیز کی فکر ہے

حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کی جو مثال دی جاتی ہے کہ ان کا بیٹا کافر رہا، وہ اس کو آگ سے نہیں بچا سکے یہ بات درست نہیں اس لیے کہ یہ بھی تو دیکھو کہ انہوں نے اس کو راہ راست پر لانے کی نو سو سال تک لگاتار کوشش کی، اس کے باوجود جب راہ راست پر نہیں آیا تو اب ان کے اوپر کوئی مطالبہ اور کوئی مواخذہ نہیں۔ لیکن ہمارا یہ حال ہے کہ ایک دو مرتبہ کہا اور پھر فارغ ہو کر بیٹھ گئے کہ ہم نے تو کہہ دیا، حالانکہ ہونا یہ چاہیے کہ ان کو گناہوں سے اسی طرح بچاؤ جس طرح ان کو حقیقی آگ سے بچاتے ہو، اگر اس طرح نہیں بچا رہے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ فریضہ ادا نہیں ہو رہا ہے۔ آج

تو یہ نظر آ رہا ہے کہ اولاد کے بارے میں ہر چیز کی فکر ہے، مثلاً یہ تو فکر ہے کہ بچے کی تعلیم اچھی ہو، اس کا کیریئر اچھا بنے یہ فکر ہے کہ معاشرے میں اس کا مقام اچھا ہو، یہ فکر تو ہے کہ اس کے کھانے پینے اور پہننے کا انتظام اچھا ہو جائے، لیکن دین کی فکر نہیں۔

''تھوڑا سا بے دین ہو گیا''

ہمارے ایک جاننے والے تھے، جو اچھے خاصے پڑھے لکھے تھے۔ دیندار اور تہجد گزار تھے، ان کے لڑکے نے جدید انگریزی تعلیم حاصل کی، جس کے نتیجے میں اس کو کہیں اچھی ملازمت مل گئی ایک دن وہ بڑی خوشی کے ساتھ بتانے لگے کہ ماشاء اللہ ہمارے بیٹے نے اتنا پڑھ لیا، اب اس کو ملازمت مل گئی اور معاشرے میں اس کو بڑا مقام حاصل ہو گیا، البتہ تھوڑا سا بے دین تو ہو گیا، لیکن معاشرے میں اس کا کیریئر بڑا شاندار بن گیا ہے۔

اب اندازہ لگائیے کہ ان صاحب نے اس بات کو اس طرح بیان کیا کہ ''وہ بچہ ذرا سا بے دین تو ہو گیا۔ مگر اس کا کیریئر بڑا شاندار بن گیا'' معلوم ہوا کہ بے دین ہونا کوئی بڑی بات نہیں ہے، بس ذرا سی گڑبڑ ہو گئی ہے، حالانکہ وہ صاحب خود بڑے دیندار اور تہجد گزار آدمی تھے۔

''جان'' تو نکل گئی ہے

ہمارے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ ایک واقعہ سنایا کرتے تھے کہ ایک شخص کا انتقال ہو گیا، لیکن لوگ اس کو زندہ سمجھ رہے تھے، چنانچہ لوگوں نے ڈاکٹر کو بلایا۔ تا کہ اس کا معائنہ کرے کہ اس کو کیا بیماری ہے؟ یہ کوئی حرکت کیوں نہیں کر رہا ہے، چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ یہ بالکل ٹھیک ٹھاک آدمی ہے۔ سر سے لے کر پاؤں تک تمام اعضاء ٹھیک ہیں۔ بس ذرا سی جان نکل گئی ہے۔

بالکل اسی طرح ان صاحب نے اپنے بیٹے کے بارے میں کہا کہ ''ماشاء اللہ اس کا کیریئر تو بڑا شاندار بن گیا ہے، بس ذرا سا بے دین ہو گیا ہے۔'' گویا کہ ''بے دین'' ہونا کوئی ایسی بات نہیں جس سے بڑا نقص پیدا ہوتا ہے۔

نئی نسل کی حالت

آج ہمارا یہ حال ہے کہ اور ہر چیز کی فکر ہے، مگر دین کی طرف توجہ نہیں، بھائی، اگر یہ دین اتنی

ہی نا قابل توجہ چیز تھی تو پھر آپ نے نماز پڑھنے کی اور تہجد گزاری کی اور مسجدوں میں جانے کی تکلیف کیوں فرمائی؟ آپ نے بھی اپنے بیٹے کی طرح اپنا کیریر بنالیا ہوتا۔ شروع سے اس بات کی فکر نہیں کہ بچے کو دین کی تعلیم سکھائی جائے آج یہ حال ہے کہ پیدا ہوتے ہی بچے کو ایسی نرسری میں بھیج دیا جاتا ہے جہاں اس کو کتا بلی تو سکھایا جاتا ہے، لیکن اللہ کا نام نہیں سکھایا جاتا، دین کی باتیں نہیں سکھائی جاتیں۔ اس وقت وہ نسل تیار ہو کر ہمارے سامنے آچکی ہے، اور اس نے زمام اقتدار سنبھال لی ہے۔ زندگی کی باگ دوڑ اس کے ہاتھ میں آگئی ہے، جس نے پیدا ہوتے ہی اسکول کالج کی طرف رخ کیا، اور ان کے اندر ناظرہ قرآن شریف پڑھنے کی بھی اہلیت موجود نہیں، نماز پڑھنا نہیں آتا۔ اگر اس وقت پورے معاشرے کا جائزہ لے کر دیکھا جائے تو شاید اکثریت ایسے لوگوں کی ملے جو قرآن شریف ناظرہ نہیں پڑھ سکتے، جنہیں نماز صحیح طریقے سے پڑھنا نہیں آتی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بچے کے پیدا ہوتے ہی ماں باپ نے یہ فکر تو کی کہ اس کو کون سے انگلش میڈیم اسکول میں داخل کیا جائے لیکن دین کی تعلیم کی طرف دھیان اور فکر نہیں۔

آج اولاد ماں باپ کے سر پر سوار ہے

یاد رکھو، اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایک سنت ہے، جو حدیث شریف میں بیان کی گئی ہے کہ جو شخص کسی مخلوق کو راضی کرنے کے لیے اللہ کو ناراض کرے تو اللہ تعالیٰ اسی مخلوق کو اس پر مسلط فرما دیتے ہیں، مثلاً ایک شخص نے ایک مخلوق کو راضی کرنے کے لیے گناہ کیا، اور گناہ کر کے اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا، تو بالآخر اللہ تعالیٰ اسی مخلوق کو اس پر مسلط فرما دیتے ہیں، تجربہ کر کے دیکھو۔

آج ہماری صورت حال یہ ہے کہ اپنی اولاد اور بچوں کو راضی کرنے کی خاطر یہ سوچتے ہیں کہ ان کا کیریر اچھا ہو جائے، ان کی آمدنی اچھی ہو جائے۔ اور معاشرے میں ان کا ایک مقام بن جائے، ان تمام کاموں کی وجہ سے ان کو دین نہ سکھایا، اور دین نہ سکھا کر اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہی اولاد جس کو راضی کرنے کی فکر تھی۔ وہی اولاد ماں باپ کے سر پر مسلط ہو جاتی ہے۔ آج آپ خود معاشرے کے اندر دیکھ لیں کہ کس طرح اولاد اپنے ماں باپ کی نافرمانی کر رہی ہے۔ اور ماں باپ کے لیے عذاب بنی ہوئی ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ ماں باپ نے ان کو صرف اس لیے بے دینی کے ماحول میں بھیج دیا، تا کہ ان کو اچھا کھانا پینا میسر آ جائے، اور اچھی ملازمت مل جائے، اور ان کو ایسے بے دینی کے ماحول میں آزاد چھوڑ دیا جس میں ماں باپ کی عزت اور عظمت کا کوئی خانہ نہیں ہے، جس میں ماں باپ کے حکم کی اطاعت کا بھی کوئی خانہ نہیں ہے، وہ اگر کل کو اپنی نفسانی خواہشات

کے مطابق فیصلے کرتا ہے، تو اب ماں باپ بیٹھے رو رہے ہیں کہ ہم نے تو اس مقصد کے لیے تعلیم دلائی تھی، مگر اس نے یہ کر لیا۔ ارے بات اصل میں یہ ہے تم نے اس کو ایسے راستے پر چلایا، جس کے نتیجے میں وہ تمہارے سروں پر مسلط ہو، تم ان کو جس قسم کی تعلیم دلوا رہے ہو، اور جس راستے پر لے جا رہے ہو، اس تعلیم کی تہذیب تو یہ ہے کہ جب ماں باپ بوڑھے ہو جائیں تو اب وہ گھر میں رکھنے کے لائق نہیں، ان کو نرسنگ ہوم (Nursing Home) میں داخل کر دیا جاتا ہے اور پھر صاحبزادے پلٹ کر بھی نہیں دیکھتے کہ وہاں ماں باپ کس حال میں ہیں، اور کس چیز کی ان کو ضرورت ہے۔

باپ ''نرسنگ ہوم'' میں

مغربی ممالک کے بارے میں تو ایسے واقعات بہت سنتے تھے کہ بوڑھا باپ ''نرسنگ ہوم'' میں پڑا ہوا ہے، وہاں اس باپ کا انتقال ہو گیا، وہاں کے منیجر نے صاحب زادے کو فون کیا کہ جناب، آپ کے والد صاحب کا انتقال ہو گیا ہے، تو جواب میں صاحب زادے نے کہا کہ مجھے بڑا افسوس ہے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ اب آپ براہ کرم ان کی تجہیز و تکفین کا انتظام کر دیں۔ اور براہ کرم بل مجھے بھیج دیجئے میں بل کی ادائیگی کر دوں گا۔ وہاں کے بارے میں تو یہ بات سنی تھی۔ لیکن ابھی چند روز پہلے مجھے ایک صاحب نے بتایا کہ یہاں کراچی میں بھی ایک ''نرسنگ ہوم'' قائم ہو گیا ہے۔ جہاں بوڑھوں کی رہائش کا انتظام ہے، اس میں بھی یہی واقعہ پیش آیا کہ ایک صاحب کا وہاں انتقال ہو گیا۔ اس کے بیٹے کو اطلاع دی گئی، بیٹے صاحب نے پہلے تو آنے کا وعدہ کر لیا۔ لیکن بعد میں معذرت کرتے ہوئے کہا کہ مجھے تو اس وقت فلاں میٹنگ میں جانا ہے۔ اس لیے آپ ہی اس کے کفن دفن کا بندوبست کر دیں، میں نہیں آ سکوں گا۔ یہ وہ اولاد ہے جس کو راضی کرنے کی خاطر تم نے خدا کو ناراض کیا، اس لیے وہ اب تمہارے اوپر مسلط کر دی گئی۔ جیسا کہ حدیث میں صراحت موجود ہے کہ جس مخلوق کو راضی کرنے کے لیے خدا کو ناراض کرو گے اللہ تعالیٰ اسی مخلوق کو تمہارے اوپر مسلط کر دیں گے۔

جیسا کرو گے ویسا بھرو گے

جب وہ اولاد سر پر مسلط ہو گئی تو اب ماں باپ بیٹھے رو رہے ہیں کہ اولاد دوسرے راستے پر جا رہی ہے، ارے جب تم نے شروع ہی سے اس کو ایسے راستے پر ڈالا، جس کے ذریعہ اس کا ذہن بدل جائے، اس کا خیال بدل جائے، اس کی سوچ بدل جائے تو اس کا انجام یہی ہونا تھا۔

اندرون قعر دریا تختہ بندم کردہ ای
بازی گوئی کہ دامن ترمکن ہوشیار باش

پہلے میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر مجھے سمندر کے اندر ڈبو دیا، اس کے بعد کہتے ہو کہ ہوشیار! دامن تر مت کرنا، بھائی: اگر تم نے پہلے اس کو کچھ قرآن شریف پڑھایا ہوتا۔ اس کو کچھ حدیث نبوی سکھائی ہوتی۔ وہ حدیث سکھائی ہوتی جس میں رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آدمی جب دنیا سے چلا جاتا ہے تو تین چیزیں اس کے لیے کارآمد ہوتی ہیں، ایک علم ہے جسے وہ چھوڑ گیا، جس سے لوگ نفع اٹھا رہے ہیں، مثلاً کوئی آدمی کوئی کتاب تصنیف کر گیا۔ اور لوگ اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، یا کوئی آدمی علم دین پڑھاتا تھا، اب اس کے شاگرد آگے علم پڑھا رہے ہیں، اس سے اس مرنے والے شخص کو بھی فائدہ پہنچتا رہتا ہے۔ یا کوئی صدقہ جاریہ چھوڑ گیا۔ مثلاً کوئی مسجد بنا دی۔ کوئی مدرسہ بنا دیا۔ کوئی شفاخانہ بنا دیا۔ کوئی کنواں بنا دیا۔ اور لوگ اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، ایسے عمل کا ثواب مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ اور تیسری چیز نیک اولاد ہے، جو وہ چھوڑ گیا۔ وہ اس کے حق میں دعائیں کریں۔ (۱) تو اس کا عمل مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے، کیونکہ ماں باپ کی تربیت کے نتیجے میں اولاد جو کچھ کر رہی ہے، وہ سب ماں باپ کے نامہ اعمال میں لکھا جا رہا ہے۔ اگر یہ حدیث پڑھائی ہوتی تو آج باپ کا یہ انجام نہ ہوتا۔ لیکن چونکہ اس راستے پر چلایا ہی نہیں۔ اس لیے اس کا انجام بد آنکھوں کے سامنے ہے۔

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور اولاد کی فکر

بھائی اولاد کو دین کی طرف لانے کی فکر اتنی ہی لازمی ہے جتنی اپنی اصلاح کی فکر لازم ہے، اولاد کو صرف زبانی سمجھانا کافی نہیں۔ جب تک اس کی فکر اس کی تڑپ اسی طرح نہ ہو جس طرح اگر دہکتی ہوئی آگ کی طرف بچہ بڑھ رہا ہو، اور آپ اس کو لپک کر جب تک اٹھا نہیں لیں گے، اس وقت تک آپ کو چین نہیں آئے گا، اسی طرح کی تڑپ یہاں بھی ہونی ضروری ہے۔ پورا قرآن کریم اس حکم کی تاکید سے بھرا ہوا ہے، چنانچہ انبیاء علیہم السلام کے واقعات کا ذکر فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ﴾ (۲)

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب الزهد، رقم: ٧٤٢٤

(۲) مريم: ٥٥

یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا کرتے تھے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں فرمایا کہ جب ان کا انتقال ہونے لگا تو اپنی ساری اولاد اور بیٹوں کو جمع کیا کوئی شخص اپنی اولاد کو اس فکر کے لیے جمع کرتا ہے کہ میرے مرنے کے بعد تمہارا کیا ہوگا؟ کس طرح کماؤ گے؟ لیکن حضرت یعقوب علیہ السلام اپنی اولاد کو جمع کر رہے ہیں اور یہ پوچھ رہے ہیں کہ بتاؤ! میرے مرنے کے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟(۱)

ان کو اگر فکر ہے تو عبادت کی فکر ہے۔ بس! اپنی اولاد اپنے اہل وعیال کے بارے میں اس فکر کو پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

قیامت کے روز ماتحتوں کے بارے میں سوال ہوگا

بات صرف اہل وعیال کی حد تک محدود نہیں، بلکہ جتنے بھی ماتحت ہیں، جن پر انسان اپنا اثر ڈال سکتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کسی جگہ افسر ہے اور کچھ لوگ اس کے ماتحت کام کر رہے ہیں۔ قیامت کے دن اس شخص سے سوال ہوگا کہ تم نے اپنے ماتحتوں کو دین پر لانے کی کوشش کی تھی؟ ایک استاذ ہے اس کے ماتحت بہت سے شاگرد پڑھتے ہیں۔ قیامت کے روز اس استاد سے سوال ہوگا کہ تم نے اپنے شاگردوں کو راہ راست پر لانے کے سلسلے میں کیا کام کیا؟ ایک مستاجر ہے۔ اس کے ماتحت بہت سے مزدور محنت مزدوری کرتے ہیں، قیامت کے روز اس مستاجر سے سوال ہوگا کہ تم نے اپنے ماتحتوں کو دین پر لانے کے سلسلے میں کیا کوشش کی تھی؟ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

((كُلُّكُمْ رَاعٍ، وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ))(۲)

یہ گناہ حقیقت میں آگ ہیں

یہ آیت جو شروع میں تلاوت کی، اس آیت کے تحت میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ جو فرمایا کہ اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ، یہ اس طرح کہا جا رہا ہے جیسے کہ آگ سامنے نظر

(۱) البقرہ: ۱۳۳

(۲) صحيح البخاری، كتاب الجمعة، باب الجمعة فی القریٰ والمدن، رقم: ٨٤٤، صحيح مسلم، كتاب الإمارة، باب فضيلة الإمام، عقوبة الجائر والحث على الرفق، رقم: ٣٤٠٨، سنن الترمذی، كتاب الجهاد، باب ماجاء فی الإمام، رقم: ١٦٢٧، سنن أبی داؤد، كتاب الخراج والإمارة والفئی، باب مایلزم الإمام من حق الرعية، رقم: ٢٥٣٩، مسند أحمد، رقم: ٤٩٢٠

آ رہی ہے۔ حالانکہ اس وقت کوئی آگ بھڑکتی ہوئی نظر نہیں آ رہی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہ جتنے گناہ ہوتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ یہ سب حقیقت میں آگ ہیں۔ چاہے دیکھنے میں یہ گناہ لذیذ اور خوش منظر معلوم ہو رہے ہوں، لیکن حقیقت میں یہ سب آگ ہیں۔ اور یہ دنیا جو گناہوں سے بھری ہوئی ہے، وہ ان گناہوں کی وجہ سے جہنم بنی ہوئی ہے۔ لیکن حقیقت میں گناہوں سے مانوس ہو کر ہماری حس مٹ گئی ہے، اس لیے گناہوں کی ظلمت اور آگ محسوس نہیں ہوتی۔ ورنہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ صحیح حس عطا فرماتے ہیں اور ایمان کا نور عطا فرماتے ہیں۔ ان کو یہ گناہ واقعۃً آگ کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ یا ظلمت کی شکل میں نظر آتے ہیں۔

حرام کے ایک لقمے کا نتیجہ

دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک شخص کی دعوت پر اس کے گھر کھانا کھانے چلا گیا، ابھی صرف ایک لقمہ ہی کھایا تھا کہ یہ احساس ہو گیا کہ کھانے میں کچھ گڑبڑ ہے شاید یہ حلال کی آمدنی نہیں ہے، جب تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ واقعۃً حلال کی آمدنی نہیں تھی، لیکن وہ حرام آمدنی کا لقمہ نادانستہ طور پر حلق کے اندر چلا گیا۔ حضرت مولانا فرماتے تھے کہ میں نے اس پر توبہ استغفار کی۔ لیکن اس کے باوجود دو مہینے تک اس حرام لقمے کی ظلمت محسوس ہوتی رہی اور دو ماہ تک بار بار یہ خیال اور وسوسہ آتا رہا کہ فلاں گناہ کرلو فلاں گناہ کرلو، اور گناہ کے داعیے دل میں پیدا ہوتے رہے۔ اللہ تعالیٰ جن لوگوں کے دلوں کو مجلی اور مزکی فرماتے ہیں انہیں ان گناہوں کی ظلمت کا احساس ہوتا ہے۔ ہم لوگ چونکہ ان گناہوں سے مانوس ہو گئے ہیں اس لیے ہمیں معلوم نہیں ہوتا۔

اندھیرے کے عادی ہو گئے ہیں

ہم لوگ یہاں شہروں میں بجلی کے عادی ہو گئے ہیں ہر وقت شہر بجلی کے قمقموں سے جگمگا رہا ہے، اب اگر چند منٹ کے لیے بجلی چلی جائے۔ تو طبیعت پر گراں گزرتا ہے اس لیے کہ نگاہیں بجلی کی روشنی اور اس کی راحت کی عادی ہیں، جب وہ راحت چھن جاتی ہے تو سخت تکلیف ہوتی ہے، اور وہ ظلمت بہت بری لگتی ہے، البتہ بہت سے دیہات ایسے ہیں کہ وہاں کے لوگوں نے بجلی کی شکل تک نہیں دیکھی، وہاں ہمیشہ اندھیرا رہتا ہے۔ کبھی بجلی کے قمقمے وہاں جلتے ہی نہیں ہیں ان کو کبھی اندھیرے کی تکلیف نہیں ہوتی، اس لیے کہ انہوں نے بجلی کے قمقموں کی روشنی دیکھی ہی نہیں، البتہ جس

نے یہ روشنی دیکھی ہے، اس سے جب یہ روشنی چھن جاتی ہے۔ تو اس کو تکلیف ہوتی ہے۔

یہی ہماری مثال ہے کہ ہم صبح شام گناہ کرتے رہتے ہیں اور ان گناہوں کی ظلمت کے عادی ہو گئے ہیں، اس لیے اس ظلمت کا احساس نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ ہمیں ایمان کا نور عطا فرمائے۔ تقویٰ کا نور عطا فرماء، تب ہمیں معلوم ہو کہ ان گناہوں کے اندر کتنی ظلمت ہے، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ گناہ درحقیقت آگ ہی ہیں، اسی لیے قرآن کریم نے فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ أَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا﴾(۱)

یعنی جو لوگ یتیموں کا مال ظلماً کھاتے ہیں، وہ درحقیقت اپنے پیٹوں میں آگ کھا رہے ہیں

اس آیت کے تحت اکثر مفسرین نے یہ فرمایا کہ یہ مجاز اور استعارہ ہے کہ آگ کھا رہے ہیں، یعنی حرام کھا رہے ہیں، جس کا انجام بالآخر جہنم کی آگ کی شکل میں ان کے سامنے آئے گا، لیکن بعض مفسرین نے بیان فرمایا کہ یہ مجاز اور استعارہ نہیں ہے، بلکہ حقیقت ہے یعنی وہ حرام کا جو لقمہ کھا رہے ہیں، وہ واقعی آگ ہے، لیکن اس وقت بے حسی کی وجہ سے آگ معلوم نہیں ہو رہی ہے۔ لہٰذا جتنے گناہ ہمارے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ حقیقت میں آگ ہیں اور حقیقت میں دوزخ کے انگارے ہیں۔ لیکن ہمیں اپنی بے حسی کی وجہ سے نظر نہیں آتے۔

اللہ والوں کو گناہ نظر آتے ہیں

اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو چشم بصیرت عطا فرماتے ہیں، ان کو ان کی حقیقت نظر آتی ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں صحیح اور مستند روایتوں میں ہے کہ جس وقت کوئی آدمی وضو کر رہا ہوتا، یا غسل کر رہا ہوتا تو آپ اس کے بہتے ہوئے پانی میں گناہوں کی شکلیں دیکھ لیتے تھے کہ یہ فلاں فلاں گناہ بہتے ہوئے جا رہے ہیں۔

ایک بزرگ تھے۔ جب وہ اپنے گھر سے باہر نکلتے تو چہرے پر کپڑا ڈال لیتے تھے۔ کسی شخص نے ان بزرگ سے پوچھا کہ حضرت! آپ جب بھی باہر نکلتے ہیں تو چہرے پر کپڑا ڈال کر نکلتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ ان بزرگ نے جواب میں فرمایا کہ میں کپڑا اٹھا کر باہر نکلنے پر قادر نہیں، اس لیے کہ جب میں باہر نکلتا ہوں تو کسی انسان کی شکل نظر نہیں آتی، بلکہ ایسا نظر آتا ہے کہ کوئی کتا ہے کوئی خنزیر ہے، کوئی بھیڑیا ہے، کوئی گدھا ہے، اور مجھے انسانوں کی شکلیں ان صورتوں میں نظر آتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گناہ ان شکلوں میں متشکل ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔ بہرحال، چونکہ ان گناہوں کی

---

(۱) النساء: ۱۰

حقیقت ہم پر منکشف نہیں ہے، اس لیے ہم ان گناہوں کو لذت اور راحت کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ گندگی اور نجاست ہے آگ اور ظلمت ہے۔

یہ دنیا گناہوں کی آگ سے بھری ہوئی ہے

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ دنیا جو گناہوں کی آگ سے بھری ہوئی ہے، اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کسی کمرے میں گیس بھر گئی ہو، اب وہ گیس حقیقت میں آگ ہے، صرف دیا سلائی لگانے کی دیر ہے، ایک دیا سلائی دکھاؤ گے تو پورا کمرہ آگ سے دھک جائے گا، اسی طرح یہ بداعمالیاں یہ گناہ جو معاشرے کے اندر پھیلے ہوئے ہیں۔ حقیقت میں آگ ہیں، صرف ایک صور پھونکنے کی دیر ہے، جب صور پھونکا جائے گا تو یہ معاشرہ آگ سے دھک جائے گا، ہمارے یہ برے اعمال بھی درحقیقت جہنم ہے، ان سے اپنے آپ کو بھی بچاؤ، اور اپنے اہل وعیال کو بھی بچاؤ۔

پہلے خود نماز کی پابندی کرو

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے دوسری آیت یہ بیان فرمائی ہے:

﴿وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا﴾ (۱)

یعنی اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو، اور خود بھی اس نماز کی پابندی کرو، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے عجیب ترتیب رکھی ہے بظاہر یہ ہونا چاہیے تھا کہ پہلے خود نماز قائم کرو۔ اور پھر اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو، لیکن یہاں ترتیب الٹ دی ہے کہ پہلے اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو، اور پھر خود بھی اس کی پابندی کرو۔ اس ترتیب میں اس بات کی طرف اشارہ فرمادیا کہ تمہارا اپنے گھر والوں کو یا اولاد کو نماز کا حکم دینا اس وقت تک موثر اور فائدہ مند نہیں ہوگا، جب تک تم ان سے زیادہ اس کی پابندی نہیں کروگے۔ اب زبان سے تو تم نے ان کو کہہ دیا کہ نماز پڑھو۔ لیکن خود اپنے اندر نماز کا اہتمام نہیں ہے۔ تو اس صورت میں ان کو نماز کے لیے کہنا بالکل بے کار جائے گا۔ لہٰذا اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دینے کا ایک لازمی حصہ یہ ہے کہ ان سے زیادہ پابندی خود کرو۔ اور ان کے لیے ایک مثال اور نمونہ بنو۔

---

(۱) طٰہٰ: ۱۳۲

بچوں کے ساتھ جھوٹ مت بولو

حدیث شریف میں ہے کہ حضور اقدس ﷺ کے سامنے ایک خاتون نے اپنے بچے کو گود میں لینے کے لیے بلایا، بچہ آنے میں تردد کر رہا تھا، تو اس خاتون نے کہا تم ہمارے پاس آؤ، ہم تمہیں کچھ چیز دیں گے۔ اب وہ بچہ آ گیا۔ آنحضرت ﷺ نے اس خاتون سے پوچھا کہ تم نے بچے کو یہ جو کہا کہ ہمارے پاس آؤ، ہم تمہیں کچھ چیز دیں گے، تو کیا تمہاری واقعی کچھ دینے کی نیت تھی؟ اس خاتون نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ! میرے پاس ایک کھجور تھی۔ اور یہ کھجور اس کو دینے کی نیت تھی، آپ نے فرمایا کہ اگر دینے کی نیت نہ ہوتی تو یہ تمہاری طرف سے بہت بڑا جھوٹ ہوتا، اور گناہ ہوتا۔(۱)

اس لیے کہ تم بچے سے جھوٹا وعدہ کر رہی ہو گویا اس کے دل میں بچپن سے یہ بات ڈال رہے ہو کہ جھوٹ بولنا اور وعدہ خلافی کرنا کوئی ایسی بری بات نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ بیوی بچوں کو جو بھی حکم دو، پہلے خود اس پر عمل کرو، اور اس کی پابندی دوسروں سے زیادہ کرو۔

بچوں کو تربیت دینے کا انداز

آگے علامہ نووی رحمہ اللہ احادیث لائے ہیں:

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالیٰ عَنْهُ قَالَ: اَخَذَ الْحَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا تَمْرَةً مِّنْ تَمْرِ الصَّدَقَةِ فَجَعَلَهَا فِيْ فِيْهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((كَخْ كَخْ، اِرْمِ بِهَا، اَمَا عَلِمْتَ اَنَّا لَا نَاْكُلُ الصَّدَقَةَ!؟))(۲)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت فاطمہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ جب کہ ابھی بچے ہی تھے۔ ایک مرتبہ صدقہ کی کھجوروں میں سے ایک کھجور اٹھا کر اپنے منہ میں رکھ لی، جب حضور اقدس ﷺ نے دیکھا تو فوراً فرمایا: ''کخ کخ'' عربی میں یہ لفظ ایسا ہے جیسے ہماری زبان میں ''تھو تھو'' کہتے ہیں یعنی اگر بچہ کوئی چیز منہ میں ڈال دے، اور اس کی شناعت

---

(۱) سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب فی التشدید فی الکذب، رقم: ۴۳۳۹، مسند أحمد، رقم: ۱۵۱۴۷

(۲) صحیح البخاری، کتاب الزکاة، باب مایذکر فی الصدقة للنبی وآله، رقم: ۱۳۹۶، صحیح مسلم، کتاب الزکاة، باب تحریم الزکاة علی رسول الله وعلی آله...... الخ، رقم: ۱۷۷۸، مسند أحمد، رقم: ۱۶۲۹، سنن الدارمی، کتاب الزکاة، باب الصدقة لاتحل للنبی ولا لأهل بیته، رقم: ۱۵۸۵

کے اظہار کے ساتھ وہ چیز اس کے منہ سے نکلوانا مقصود ہو تو یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے، بہر حال! حضور اقدس ﷺ نے فرمایا ''کخ کخ'' یعنی اس کو منہ سے نکال کر پھینک دو، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم یعنی بنو ہاشم صدقے کا مال نہیں کھاتے۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے نواسے ہیں۔ اور ایسے محبوب نواسے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ مسجد نبوی میں خطبہ دے رہے تھے۔ اس وقت حضرت حسن رضی اللہ عنہ مسجد میں داخل ہو گئے۔ تو حضور اقدس ﷺ منبر سے اترے، اور آگے بڑھ کر ان کو گود میں اٹھا لیا۔ اور بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا کہ حضور اقدس ﷺ نماز پڑھ رہے ہیں۔ اور یہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ آپ کے کندھے پر سوار ہو گئے اور جب آپ سجدے میں جانے لگے تو آپ نے ان کو ایک ہاتھ سے پکڑ کر نیچے اتار دیا، اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آپ کو گود میں لیتے اور فرماتے:

((مَبْخَلَةٌ وَمَجْبَنَةٌ))(۱)

یعنی یہ اولاد ایسی ہے کہ انسان کو بخیل بھی بنا دیتی ہے، اور بزدل بھی بنا دیتی ہے۔ اس لیے کہ انسان اولاد کی وجہ سے بعض اوقات بخیل بن جاتا ہے، اور بعض اوقات بزدل بن جاتا ہے۔ ایک طرف تو حضور ﷺ کو حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے اتنی محبت ہے، دوسری طرف جب انہوں نے نادانی میں ایک کھجور بھی منہ میں رکھ لی تو آنحضرت ﷺ کو یہ گوارا نہ ہوا کہ وہ اس کھجور کو کھا جائیں۔ مگر چونکہ ان کو پہلے سے اس چیز کی تربیت دینی تھی۔ اس لیے فوراً وہ کھجور منہ سے نکلوائی۔ اور فرمایا کہ یہ ہمارے کھانے کی چیز نہیں ہے۔

بچوں سے محبت کی حد

اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ فرما دیا کہ بچے کی تربیت چھوٹی چھوٹی چیزوں سے شروع ہوتی ہے۔ اسی سے اس کا ذہن بنتا ہے، اسی سے اس کی زندگی بنتی ہے۔ یہ حضور اقدس ﷺ کی سنت ہے۔ آج کل یہ عجیب منظر دیکھنے میں آتا ہے کہ ماں باپ کے اندر بچوں کو غلط باتوں پر ٹوکنے کا رواج ہی ختم ہو گیا ہے۔ آج سے پہلے بھی ماں باپ بچوں سے محبت کرتے تھے۔ لیکن وہ عقل اور تدبیر کے ساتھ محبت کرتے تھے۔ لیکن آج کل یہ محبت اور لاڈ اس درجے تک پہنچ چکا ہے کہ بچے کتنے ہی غلط کام کرتے رہیں، غلط حرکتیں کرتے رہیں، لیکن ماں باپ ان غلطیوں پر ٹوکتے ہی نہیں،

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب الأدب، باب برّ الوالد والإحسان إلى البنات، رقم: ٣٦٥٦، مسند أحمد، رقم: ١٦٩٠٤

ماں باپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ نادان بچے ہیں ان کو ہر قسم کی چھوٹ ہے، ان کی روک ٹوک کرنے کی ضرورت نہیں۔ ارے بھائی، یہ سوچو کہ اگر وہ بچے نادان ہیں مگر تم تو نادان نہیں ہو، تمہارا فرض ہے کہ ان کو تربیت دو، اگر کوئی بچہ ادب کے خلاف، تمیز کے خلاف یا شریعت کے خلاف کوئی غلط کام کر رہا ہے۔ تو اس کو بتانا ماں باپ کے ذمے فرض ہے، اس لیے کہ وہ بچہ اسی طرح بدتہذیب بن کر بڑا ہو گیا تو اس کا وبال تمہارے اوپر ہے کہ تم نے اس کو ابتداء سے اس کی عادت نہیں ڈالی۔ بہر حال! اس حدیث کو یہاں لانے کا مقصد یہ ہے کہ بچوں کی چھوٹی چھوٹی حرکتوں کو بھی نگاہ میں رکھو۔

حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آپ بیتی میں اپنا ایک قصہ لکھا ہے کہ جب میں چھوٹا بچہ تھا تو ماں باپ نے میرے لیے ایک چھوٹا سا خوبصورت تکیہ بنا دیا تھا، جیسا کہ عام طور پر بچوں کے لیے بنایا جاتا ہے، مجھے اس تکیہ سے بڑی محبت تھی، اور ہر وقت میں اس کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ایک دن میرے والد صاحب لیٹنا چاہ رہے تھے۔ ان کو تکیے کی ضرورت پیش آئی تو میں نے والد صاحب سے کہا کہ ابا جی! میرا تکیہ لے لیجیے یہ کہہ کر میں نے اپنا تکیہ ان کو اس طرح پیش کیا، جس طرح کہ میں نے اپنا دل نکال کر باپ کو دے دیا، لیکن جس وقت وہ تکیہ میں نے ان کو پیش کیا، اسی وقت والد صاحب نے مجھے ایک چپت رسید کیا۔ اور کہا کہ ابھی سے تو اس تکیے کو اپنا تکیہ کہتا ہے، مقصد یہ تھا کہ تکیہ تو درحقیقت باپ کی عطاء ہے، لہٰذا اس کو اپنی طرف منسوب کرنا یا اپنا قرار دینا غلط ہے۔

حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس وقت تو مجھے بہت برا لگا کہ میں نے تو اپنا دل نکال کر باپ کو دے دیا تھا۔ اس کے جواب میں باپ نے ایک چپت لگا دیا۔ لیکن آج سمجھ میں آیا کہ کتنی باریک بات پر اس وقت والد صاحب نے تنبیہ فرمائی تھی۔ اور اس کے بعد سے ذہن کا رخ بدل گیا۔ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ماں باپ کو نظر رکھنی پڑتی ہے، تب جا کر بچے کی تربیت صحیح ہوتی ہے، اور بچہ صحیح طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے۔

کھانا کھانے کا ایک ادب

عَنْ اَبِیْ حَفْصٍ عُمَرَ بْنِ اَبِیْ سَلَمَةَ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِالْاَسَدِ رَبِیْبِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: کُنْتُ غُلَامًا فِیْ حَجْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ، وَکَانَتْ یَدِیْ تَطِیْشُ فِی الصَّحْفَةِ، فَقَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((يَا غُلَامُ سَمِّ اللّٰهَ، وَكُلْ بِيَمِينِكَ، وَكُلْ مِمَّا يَلِيكَ)) فَمَا زَالَتْ تِلْكَ طِعْمَتِي بَعْدُ.(۱)

حضرت عمر بن ابوسلمہ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوتیلے بیٹے ہیں۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا، جو ام المومنین ہیں، ان کے پچھلے شوہر سے یہ صاحبزادے پیدا ہوئے تھے۔ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا تو یہ ان کے ساتھ ہی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تھے، اس لیے یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ربیب یعنی سوتیلے بیٹے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے بڑی محبت وشفقت فرمایا کرتے تھے، اور ان کے ساتھ بڑی بے تکلفی کی باتیں کیا کرتے تھے، وہ فرماتے ہیں کہ جس وقت میں چھوٹا بچہ تھا۔ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کرزیر پرورش تھا، ایک روز کھانا کھاتے ہوئے میرا ہاتھ پیالے میں ادھر سے ادھر حرکت کر رہا تھا، یعنی کبھی ایک طرف سے لقمہ اٹھایا۔ کبھی دوسری طرف سے۔ اور کبھی تیسری طرف سے لقمہ اٹھالیا۔ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس طرح کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا اے لڑکے! کھانا کھاتے وقت بسم اللہ پڑھو۔ اور داہنے ہاتھ سے کھاؤ، اور برتن کا جو حصہ تمہارے سامنے ہے، وہاں سے کھاؤ، ادھر ادھر سے ہاتھ بڑھا کر کھانا ٹھیک نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو دیکھ کر اس پر تنبیہ فرماتے اور صحیح ادب سکھاتے۔

اسلامی زندگی کے سنہری آداب

ایک اور صحابی حضرت عکراش بن زویب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، کہ میں ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، جب کھانا سامنے آیا تو میں نے یہ حرکت شروع کی کہ ایک نوالہ ادھر سے لیا۔ اور دوسرا نوالہ ادھر سے لے لیا۔ اور اس طرح برتن کے مختلف حصوں سے کھانا شروع کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا اے عکراش، ایک جگہ سے کھاؤ، اس لیے کہ کھانا ایک جیسا ہے ادھر ادھر سے کھانے سے بدتہذیبی بھی معلوم ہوتی ہے۔ اور بدسلیقی ظاہر ہوتی ہے۔ اس لیے ایک جگہ سے کھاؤ، حضرت عکراش رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک جگہ سے کھانا شروع کر دیا۔ جب کھانے سے فارغ ہوئے تو ایک بڑا تھال لایا گیا جس میں مختلف قسم کی کھجوریں بکھری ہوئی تھیں۔ چونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے فرما چکے تھے کہ ایک جگہ سے کھاؤ۔ اس لیے میں نے دو کھجوریں

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الأطعمة، باب التسمية على الطعام والأكل باليمين، رقم: ٤٩٥٧، صحيح مسلم، كتاب الأشربة، باب آداب الطعام والشراب وأحكامهما، رقم: ٣٧٦٧، سنن ابن ماجه، كتاب الأطعمة، باب الأكل باليمين، رقم: ٣٢٥٨

ایک جگہ سے کھانی شروع کر دیں۔ اور آنحضرت ﷺ کبھی ایک طرف سے کھجور اٹھاتے، کبھی دوسری طرف سے اٹھاتے۔ اور مجھے جب ایک طرف سے کھاتے ہوئے دیکھا تو آپ نے پھر فرمایا کہ اے عکراش! تم جہاں سے چاہو کھاؤ، اس لیے کہ یہ مختلف قسم کی کھجوریں ہیں۔ اب اگر ایک طرف سے کھاتے رہے۔ پھر دل تمہارا دوسری قسم کی کھجور کھانے کو چاہ رہا ہے۔ تو ہاتھ بڑھا کر وہاں سے کھجور اٹھا کر کھاؤ۔ (۱)

گویا کہ اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے یہ ادب سکھایا کہ اگر ایک ہی قسم کی چیز ہے تو پھر صرف اپنی طرف سے کھاؤ، اور اگر مختلف قسم کی چیزیں ہیں تو دوسرے اطراف سے بھی کھا سکتے ہو۔ اپنی اولاد اور اپنے صحابہ کی ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر حضور اقدس ﷺ کی نگاہ تھی۔ یہ سارے اداب خود بھی سیکھنے کے ہیں اور اپنے گھر والوں کو سکھانے کے ہیں یہ اسلامی آداب ہیں جن سے اسلامی معاشرہ ممتاز ہوتا ہے۔

سات سال کے بچوں کو نماز پڑھائیں

عَنْ عَمْرِوبْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((مُرُوْا أَوْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ وَهُمْ أَبْنَاءُ سَبْعٍ وَاضْرِبُوْهُمْ عَلَيْهَا، وَهُمْ أَبْنَاءُ عَشْرٍ، وَفَرِّقُوْا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ))(۲)

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اپنی اولاد کو نماز کا حکم دو جب وہ سات سال کے ہو جائیں یعنی سات سال کے بچے کو نماز پڑھنے کی تاکید کرنا شروع کرو، اگرچہ اس کے ذمے نماز فرض نہیں ہوئی لیکن اس کو عادی بنانے کے لیے سات سال کی عمر سے تاکید کرنا شروع کر دو، اور جب دس سال کی عمر ہو جائے، اور پھر بھی نماز نہ پڑھے تو اس کو نماز نہ پڑھنے پر مارو، اور دس سال کی عمر میں بچوں کے بستر الگ الگ کر دو، ایک بستر میں دو بچوں کو نہ سلاؤ۔

سات سال سے پہلے تعلیم

اس حدیث میں پہلا حکم یہ دیا کہ سات سال کی عمر سے نماز کی تاکید شروع کر دو، اس سے

(۱) سنن الترمذي، كتاب الأطعمة عن رسول الله، باب ماجاء في التسمية في الطعام، رقم: ۱۷۷۱، سنن ابن ماجه، كتاب الأطعمة، باب الأكل مما يليك، رقم: ۳۲٦٥

(۲) سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب متى يؤمر الغلام بالصلاة، رقم: ٤١٧، مسند أحمد، رقم: ٦٤٠٢

معلوم ہوا کہ سات سال سے پہلے اس کو کسی چیز کا مکلّف کرنا مناسب نہیں، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جب تک بچے کی عمر سات سال تک نہ پہنچ جائے، اس پر کوئی بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے، جیسے کہ بعض لوگ سات سال سے پہلے روزہ رکھوانے کی فکر شروع کر دیتے ہیں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس کے بہت مخالف تھے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ اللہ میاں تو سات سال سے پہلے نماز پڑھانے کو نہیں کہہ رہے ہیں، مگر تم سات سال سے پہلے اس کو روزہ رکھوانے کی فکر میں ہو، یہ ٹھیک نہیں۔ اسی طرح سات سال سے پہلے نماز کی تاکید کی کوشش بھی درست نہیں۔ اسی لیے کہا گیا کہ سات سال سے کم عمر کے بچے کو مسجد میں لانا ٹھیک نہیں۔ البتہ کبھی کبھار اس کو اس شرط کے ساتھ مسجد میں لا سکتے ہیں کہ وہ مسجد کو گندگی وغیرہ سے ملوث نہیں کرے گا۔ تاکہ وہ تھوڑا تھوڑا مانوس ہو جائے۔ لیکن سات سال سے پہلے اس پر باقاعدہ بوجھ ڈالنا درست نہیں۔

بلکہ ہمارے بزرگ فرماتے ہیں کہ سات سال سے پہلے تعلیم کا بوجھ ڈالنا بھی مناسب نہیں۔ سات سال سے پہلے کھیل کود کے اندر اس کو پڑھا دو، لیکن باقاعدہ اس پر تعلیم کا بوجھ ڈالنا، اور باقاعدہ اس کو طالب علم بنا دینا ٹھیک نہیں۔ آج کل ہمارے یہاں یہ وبا ہے کہ بس بچہ تین سال کا ہوا تو اس کو پڑھانے کی فکر شروع ہوگئی، یہ غلط ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب وہ تین سال کا ہو جائے تو اس کو گھر کی تعلیم دے دو۔ اس کو اللہ و رسول کا کلمہ سکھا دو، اس کو کچھ دین کی باتیں سمجھا دو، اور یہ کام گھر میں رکھ کر جتنا کر سکتے ہو، کرلو باقی اس کو مکلّف کر کے باقاعدہ نرسری میں بھیجنا۔ اور ضابطے کا طالب علم بنا دینا اچھا نہیں۔

قاری فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ

ہمارے بزرگ حضرت مولانا قاری فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔ قرآن کریم کا زندہ معجزہ تھے، جن لوگوں نے ان کی زیارت کی ہے۔ ان کو معلوم ہو گا۔ ساری زندگی قرآن کریم کے پڑھنے پڑھانے میں گزاری، اور حدیث میں جو یہ دعا آتی ہے کہ یا اللہ! قرآن کریم کو میری رگ میں پیوست کر دیجیے۔ میرے خون میں پیوست کر دیجیے، میرے جسم میں پیوست کر دیجیے، میری روح میں پیوست کر دیجیے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی یہ دعا ان کے حق میں پوری طرح قبول ہوگئی کہ قرآن کریم ان کے رگ و پے میں پیوست تھا۔

قاری صاحب قرآن کی تعلیم کے معاملے میں بڑے سخت تھے جب کوئی بچہ ان کے پاس آتا

تو اس کو بہت اہتمام کے ساتھ پڑھاتے تھے، اور اس کو پڑھنے کی بہت تاکید کرتے تھے، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی فرماتے تھے کہ جب تک بچے کی عمر سات سال نہ ہو جائے، اس وقت تک اس پر تعلیم کا باقاعدہ بوجھ ڈالنا درست نہیں، اس لیے کہ اس سے اس کی نشو ونما رک جاتی ہے، اور اسی مذکورہ بالا حدیث میں استدلال فرماتے تھے کہ حضور اقدس ﷺ نے بچوں کو نماز کا حکم دینے کے لیے سات سال عمر کی قید لگائی ہے۔

جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو پھر رفتہ رفتہ اس پر تعلیم کا بوجھ ڈالا جائے۔ یہاں تک کہ جب بچہ دس سال کا ہو جائے تو اس وقت آپ نے نہ صرف تادیباً مارنے کی اجازت دی۔ بلکہ مارنے کا حکم دیا کہ اب وہ نماز نہ پڑھے تو اس کو مارو۔

بچوں کو مارنے کی حد

یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ استاد کے لیے یا ماں باپ کے لیے بچے کو اس حد تک مارنا جائز ہے، جس سے بچے کے جسم پر مار کا نشان نہ پڑے۔ آج کل یہ جو بے تحاشہ مارنے کی جوریت ہے یہ کسی طرح بھی جائز نہیں۔ جیسا کہ ہمارے یہاں قرآن کریم کے مکتبوں میں مار کٹائی کا رواج ہے۔ اور بعض اوقات اس مار پٹائی میں خون نکل آتا ہے، زخم ہو جاتا ہے، یا نشان پڑ جاتے ہیں، یہ عمل اتنا بڑا گناہ ہے کہ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ اس گناہ کی معافی کی کیا شکل ہوگی؟ اس لیے کہ اس گناہ کی معافی کس سے مانگے؟ اگر اس بچے سے مانگے تو وہ نابالغ بچہ معاف کرنے کا اہل نہیں ہے، اس لیے کہ اگر نابالغ بچہ معاف بھی کر دے تو شرعاً اس کی معافی کا اعتبار نہیں اس لیے حضرت والا فرمایا کرتے تھے اس کی معافی کا کوئی راستہ سمجھ میں نہیں آتا، اتنا خطرناک گناہ ہے۔ اس لیے استاد اور ماں باپ کو چاہیے کہ وہ بچے کو اس طرح نہ ماریں کہ اس سے زخم ہو جائے یا نشان پڑ جائے، البتہ ضرورت کے تحت جہاں مارنا ناگزیر ہو جائے، صرف اس وقت مارنے کی اجازت دی گئی ہے۔

بچوں کو سزا دینے کا شرعی طریقہ

اس کے لیے حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی قدس اللہ سرہ نے ایک عجیب نسخہ بتایا ہے، اور ایسا نسخہ وہی بتا سکتے تھے، یاد رکھنے کا ہے، فرماتے تھے کہ جب کبھی اولاد کو مارنے کی ضرورت محسوس ہو، یا اس پر غصہ کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو جس وقت غصہ آ رہا ہو اس وقت نہ مارو، بلکہ بعد میں جب

غصہ ٹھنڈا ہو جائے تو اس وقت مصنوعی غصہ پیدا کر کے مارلو اس لیے کہ جب طبعی غصہ کے وقت اگر مارو گے یا غصہ کرو گے تو پھر حد پر قائم نہیں رہو گے، بلکہ حد سے تجاوز کر جاؤ گے، اور چونکہ ضرورۃً مارنا ہے، اس لیے مصنوعی غصہ پیدا کر کے پھر مارلو، تاکہ اصل مقصد بھی حاصل ہو جائے، اور حد سے گزرنا بھی نہ پڑے۔

اور فرمایا کرتے تھے کہ میں نے ساری عمر اس پر عمل کیا کہ طبعی غصے کے وقت نہ کسی کو مارا اور نہ ڈانٹا، پھر جب غصہ ٹھنڈا ہو جاتا تو اس کو بلا کر مصنوعی قسم کا غصہ پیدا کر کے وہ مقصد حاصل کر لیتا۔ تاکہ حدود سے تجاوز نہ ہو جائے۔ کیونکہ غصہ ایک ایسی چیز ہے کہ اس میں انسان اکثر و بیشتر حد پر قائم نہیں رہتا۔

بچوں کو تربیت دینے کا طریقہ

اسی لیے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ایک اصول بیان فرمایا کرتے تھے۔ جو اگرچہ کلی اصول تو نہیں ہے، اس لیے کہ حالات مختلف بھی ہو سکتے ہیں لیکن اکثر و بیشتر اس اصول پر عمل کیا جا سکتا ہے کہ جس وقت کوئی شخص غلط کام کر رہا ہو، ٹھیک اس وقت میں اس کو سزا دینا مناسب نہیں ہوتا۔ بلکہ وقت پر ٹوکنے سے بعض اوقات نقصان ہوتا ہے، اس لیے بعد میں اس کو سمجھا دو، یا سزا دینی ہو تو سزا دے دو، دوسرے یہ کہ ہر ہر کام پر بار بار ٹوکتے رہنا بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک مرتبہ بٹھا کر سمجھا دو۔ کہ فلاں وقت تم نے یہ غلط کام کیا۔ فلاں وقت یہ غلط کیا اور پھر ایک مرتبہ جو سزا دینی ہے دے دو۔ واقعہ یہ ہے کہ غصہ ہر انسان کی جبلت میں داخل ہے، اور یہ ایسا جذبہ ہے کہ جب ایک مرتبہ شروع ہو جاتے تو بعض اوقات انسان اس میں بے قابو ہو جاتا ہے اور پھر حدود پر قائم رہنا ممکن نہیں رہتا، اس لیے کہ اس کا بہترین علاج وہی ہے، جو ہمارے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تجویز فرمایا۔ بہر حال! اس سے یہ معلوم ہوا کہ اگر ضرورت محسوس ہو تو کبھی کبھی مارنا بھی چاہیے، آج کل اس میں افراط و تفریط ہے، اگر ماریں گے تو حد سے تجاوز کر جائیں گے، یا پھر بالکل مارنا چھوڑ دیا ہے، اور یہ سمجھتے ہیں کہ بچے کو کبھی نہیں مارنا چاہیے، یہ دونوں باتیں غلط ہیں وہ افراط ہے، اور یہ تفریط ہے، اعتدال کا راستہ وہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرما دیا۔

تم میں سے ہر شخص نگران ہے

آخر میں وہی حدیث لائے ہیں جو پیچھے کئی مرتبہ آ چکی ہے:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((كُلُّكُمْ رَاعٍ، وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، اَلْإِمَامُ رَاعٍ وَمَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالرَّجُلُ رَاعٍ فِيْ اَهْلِهِ وَمَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ فِيْ بَيْتِ زَوْجِهَا وَمَسْئُوْلَةٌ عَنْ رَعِيَّتِهَا، وَالْخَادِمُ رَاعٍ فِيْ مَالِ سَيِّدِهِ وَمَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، فَكُلُّكُمْ رَاعٍ، وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ))(۱)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا فرماتے ہیں کہ تم میں سے ہر شخص راعی ہے، نگہبان ہے، ذمہ دار ہے، اور ہر شخص سے قیامت کے روز اس کی ذمہ داری اور نگہبانی کے بارے میں سوال ہوگا، امام یعنی سربراہ حکومت ذمہ دار ہے، اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں آخرت میں سوال ہوگا کہ تم نے ان کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا؟ ان کی کیسی تربیت کی؟ اور ان کے حقوق کا کتنا خیال رکھا؟ اور مرد اپنے گھر والوں کا بیوی بچوں کا نگران اور نگہبان ہے قیامت کے روز اس سے سوال ہوگا کہ بیوی بچے جو تمہارے سپرد کیے گئے تھے ان کی کیسی تربیت کی، ان کے حقوق کس طرح ادا کیے؟ عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگہبان ہے، جو چیز اس کی نگہبانی میں دی گئی ہے۔ اس کے بارے میں اس سے قیامت کے روز سوال ہوگا کہ تم نے اس کی کس طرح نگہبانی کی؟ اور نوکر اپنے آقا کے مال میں نگہبان ہے۔ یعنی اگر آقا نے پیسے دیئے ہیں تو وہ پیسے اس کے لیے امانت ہے وہ اس کا ذمہ دار ہے، اور آخرت کے دن اس سے اس کے بارے میں سوال ہوگا کہ تم نے اس امانت کا حق کس طرح ادا کیا؟

لہٰذا تم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی کی حیثیت سے راعی ہے اور جس چیز کی نگہبانی اس کے سپرد کی گئی ہے، قیامت کے روز اس سے اس کے بارے میں سوال ہوگا۔

اپنے ماتحتوں کی فکر کریں

اس حدیث کو آخر میں لانے کی منشا یہ ہے کہ بات صرف باپ اور اولاد کی حد تک محدود نہیں، بلکہ زندگی کے جتنے شعبے ہیں، ان سب میں انسان کے ماتحت کچھ لوگ ہوتے ہیں، مثلاً گھر کے اندر اس کے ماتحت بیوی بچے ہیں، دفتر میں اس کے ماتحت کچھ افراد کام کرتے ہوں گے، اگر کوئی دکاندار

(۱) صحيح البخاری، كتاب الجمعة، باب الجمعة في القرىٰ والمدن، رقم: ۸٤٤، صحيح مسلم، كتاب الإمارة، باب فضيلة الإمام، عقوبة الجائر والحث على الرفق، رقم: ۳٤۰۸، سنن الترمذی، كتاب الجهاد، باب ماجاء في الإمام، رقم: ۱٦۲۷، سنن أبي داؤد، كتاب الخراج والإمارة والفئی، باب مايلزم الإمام من حق الرعية، رقم: ۲۵۳۹، مسند أحمد، رقم: ٤۹۲۰

ہے، تو اس دکان میں اس کے ماتحت کوئی آدمی کام کرتا ہوگا، اگر کسی شخص نے فیکٹری لگائی ہے، تو اس فیکٹری میں اس کے ماتحت کچھ عملہ کام کرتا ہوگا، یہ سب اس کے ماتحت اور تابع ہیں لہٰذا ان سب کو دین کی بات پہنچانا اور ان کو دین کی طرف لانے کی کوشش کرنا انسان کے ذمے ضروری ہے۔ یہ نہ سمجھے کہ میں اپنی ذات یا اپنے گھر کی حد تک ذمہ دار ہوں، بلکہ جو لوگ تمہارے زیر دست اور ماتحت ہیں، ان کو جب تم دین کی بات بتاؤ گے تو تمہاری بات کا بہت زیادہ اثر ہوگا، اور اس اثر کو وہ لوگ قبول کریں گے۔ اور اگر تم نے ان کو دین کی بات نہیں بتائی تو اس میں تمہارا قصور ہے۔ اور اگر وہ دین پر عمل نہیں کر رہے ہیں تو اس میں تمہارا قصور ہے کہ تم نے ان کو دین کی طرف متوجہ نہیں کیا، اس لیے جہاں کہیں جس شخص کے ماتحت کچھ لوگ کام کرنے والے موجود ہیں ان تک دین کی باتیں پہنچانے کی فکر کریں۔

صرف دس منٹ نکال لیں

اس میں شک نہیں کہ آج کل زندگیاں مصروف ہوگئیں ہیں، اوقات محدود ہو گئے ہیں، لیکن ہر شخص اتنا تو کر سکتا ہے کہ چوبیس گھنٹے میں سے پانچ دس منٹ روزانہ اس کام کے لیے نکال لے کہ اپنے ماتحتوں کو دین کی بات سنائے گا۔ مثلاً کوئی کتاب پڑھ کر سنا دے، کوئی وعظ پڑھ کر سنا دے، ایک حدیث کا ترجمہ سنا دے، جس کے ذریعہ دین کی بات ان کے کان میں پڑتی رہے۔ یہ کام تو ہر شخص کر سکتا ہے، اگر یہ شخص اس کام کی پابندی کر لے تو ان شاء اللہ اس حدیث پر عمل کرنے کی سعادت حاصل ہو جائے گی، اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ سب کو بھی اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

☆☆☆

بیٹی کی پرورش، دخول جنت کا ذریعہ ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَّضِيَ اللّٰهُ تَعَالىٰ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ حَتّٰى تُدْرِكَا دَخَلْتُ اَنَا وَهُوَ فِي الْجَنَّةِ كَهَاتَيْنِ وَأَشَارَ مُحَمَّدٌ (بن عبد العزيز) بِالسَّبَّابَةِ وَالْوُسْطىٰ وَبَابَانِ يُعَجَّلَانِ فِي الدُّنْيَا: اَلْبَغْيُ وَقَطِيْعَةُ الرَّحِمِ))(۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جو شخص دو لڑکیوں کہ پرورش کرے یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائیں تو میں اور وہ دونوں جنت میں اس طرح داخل ہوں گے (آپ نے اپنی دو انگلیوں کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ جس طرح شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی ملی ہوئی ہیں اس طرح وہ شخص جنت میں میرے ساتھ مل کر داخل ہوگا) اور فرمایا کہ دو کام ایسے ہیں کہ جن کی سزا انسان کو دنیا میں مل جاتی ہے ایک ظلم اور دوسرے قطع رحمی''

اس حدیث میں نبی پاک نے دو باتیں بیان فرمائی پہلی تو لڑکیوں کی پرورش اور تربیت کی فضیلت بیان فرمائی اور کتنی بڑی فضیلت بیان فرمائی کہ میرے ساتھ جنت میں داخل ہوگا کہ لڑکیوں کہ پرورش اور تربیت کرنے والا جنت میں اس طرح میرے ساتھ ہوگا جس طرح دو انگلیاں ساتھ ساتھ ہوتی ہیں۔

اس سے بڑی سعادت انسان کی کیا ہوسکتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس طرح جنت میں

☆ ضبط وترتیب: محمد جنید سرور، جامعہ اشرفیہ، لاہور (2/3/2009)

(۱) المستدرك للحاكم رقم: ۷۳۵۰ (۱۶۳/۶) شرح السنة للبغوی (۲۰۸/۳)، الأدب المفرد رقم: ۸۹٤ (۳۰۸/۱)، كنز العمال رقم: ٤٥٣٧٢،

داخل ہو۔

اس کا اصل پس منظر تو یہ ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں عرب لوگ لڑکیوں کو بہت برا سمجھتے تھے، قرآن مجید میں ہے:

﴿وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمَٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ﴾ (۱)

''حالانکہ ان میں سے کسی کو جب بیٹی کی ولادت کی خوشخبری دی جاتی ہے جو اس نے خدائے رحمٰن کی طرف منسوب کر رکھی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ دل ہی دل میں گھٹتا رہتا ہے''

بعض اہل عرب تو لڑکیوں کو اس درجہ برا سمجھتے تھے کہ لڑکی کو زندہ درگور کر دیتے تھے، چنانچہ قرآن مجید نے کہا ہے:

﴿أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ﴾ (۲)

''یا اسے زمین میں گاڑ دے''

یعنی وہ لڑکی کو لوگوں سے چھپاتا پھرتا کہ میں کتنا بدنصیب ہوں کہ میرے ہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے وہ پریشان ہو کر سوچتا تھا کہ اب میں اس کو رکھنے کی ذلت برداشت کروں یا اس کو زمین میں دفن کردوں۔

تو لڑکیوں کا گھر میں ہونا اور ان کی پرورش کرنا اس کو اہل عرب بہت معیوب سمجھتے تھے اور لڑکیوں کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی، تو اس معاشرہ میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہ سب جاہلیت کی باتیں ہیں اور اگر کوئی شخص لوگوں کے طعنوں اور عیب بینی کی پرواہ کئے بغیر بچیوں کی پرورش کرے تو وہ جنت میں میرے ساتھ اس طرح ہوگا جس طرح دو انگلیوں ساتھ ساتھ ہوتی ہیں۔

اصل پس منظر تو اس کا یہ ہے لیکن اس جاہلیت کے اثرات اب بھی کچھ نہ کچھ انسانوں میں پائے جاتے ہیں اگر لڑکا ہو جائے تو خوشیاں مناتے ہیں اور اگر لڑکی ہو جائے تو زبان سے خواہ کچھ نہ کہیں لیکن دل میں ضرور ملال ہوتا ہے، غم کا احساس ہوتا ہے کہ لڑکی کیوں ہوگئی لڑکا پیدا ہو جاتا، حالانکہ حضور ﷺ نے یہ عظیم بشارت لڑکے کی پرورش کے بارے میں نہیں فرمائی بلکہ لڑکی کی پرورش کے بارے میں فرمائی ہے۔

---

(۱) الزخرف:۱۷

(۲) النحل:۵۹

تو لڑکی تو ایک عظیم نعمت ہے اگر کسی کے ہاں لڑکی پیدا ہو تو یہ ایک عظیم نعمت ہے کہ اس پر نبی کریم ﷺ کے ساتھ جنت میں معیت کی بشارت دی گئی ہے۔ اس لئے بچی کی پیدائش پر رنجیدہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس حدیث کا مصداق بننے کی توفیق عطا فرمائی۔

ہمارے معاشرے میں بھی جاہلیت کے اثرات کچھ نہ کچھ پائے جاتے ہیں اور بچیوں کی پیدائش کو برا سمجھا جاتا ہے اور لڑکی کی پیدائش پر غمزدہ ہونے لگتے ہیں اور خاص طور پر اگر کسی کے ہاں نرینہ اولاد نہ ہو اور لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوں تو وہ تو بچی کی پیدائش پر انتہائی رنجیدہ ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ کو ستم رسیدہ سمجھتا ہے غمگین ہوتا ہے، یہ سب باتیں جاہلیت کی ہیں۔

اللہ جل جلالہ ہی فیصلہ کرنے والے ہیں اور وہ سب جانتے ہیں کہ کس کے حق میں کیا بہتر ہے اور کس کے حق میں کیا مفید ہے، اگر لڑکا ہو جاتا اور تمہارا نافرمان بن جاتا، تمہیں تکلیفیں پہنچاتا تو وہ بہتر تھا یا یہ لڑکی ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے سعادت عطا فرمادی۔

اس واسطے اللہ کی تقدیر پر راضی رہنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو ہمارے بارے میں لکھا ہے وہی ہمارے حق میں بہتر ہے انسان یہ فیصلہ نہیں کرسکتا۔

اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشهادة ہے، وہ ماکان وما یکون (جو ہو کچھ ہو چکا اور جو ہونے والا ہے) سب سے باخبر ہے، وہی جانتا ہے کہ بندوں کے حق میں کیا بہتر ہے، اس لئے ہمیشہ اس کے فیصلے پر راضی رہنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ کس کے حق میں کیا چیز بہتر ہے۔ انسان پتہ نہیں لگا سکتا کہ وہ جس بات کی تمنا کر رہا ہے کہ وہ اس کے حق میں بہتر ہوگی یا نقصان دہ ثابت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ﴾ (۱)

''اور جن چیزوں میں ہم نے تم کو ایک دوسرے پر فوقیت دی ہے، ان کی تمنا نہ کرو''

یہ اللہ جل جلالہ کی تقسیم ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَةَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ﴾ (۲)

''بھلا کیا یہ لوگ ہیں جو تمہارے رب کی رحمت تقسیم کریں گے؟ دنیوی زندگی میں

(۱) النساء:۳۲

(۲) الزخرف:۳۲

ان کی روزی کے ذرائع بھی ہم نے ہی ان کے درمیان تقسیم کرر کھے ہیں اور ہم نے ہی ان میں ایک کو دوسرے پر درجات میں فوقیت دی ہے“

اس واسطے ان باتوں پر غمگین ہونا جاہلیت کی باتیں ہیں، اس لئے انسان کو یہ سوچنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے کتنی عظیم نعمت عطا فرمادی کہ رسول اللہ ﷺ کا ساتھ جنت میں نصیب ہوگا۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ لڑکیوں کی پرورش جب وہ پیدا ہو جائیں تو کرنی ہی پڑتی ہے کوئی بھی مسلمان ہو یا کافر، فاسق ہو یا صالح، لیکن اگر آدمی اس پرورش کے دوران اس حدیث کو مد نظر رکھے گا اور اس حدیث کو سامنے رکھ کر بیٹی کی تربیت کرے گا تو اس پورے عرصے میں اس کا یہ سارا عمل اللہ کی رحمت سے عبادت بن جائے، اس کے لئے کمائے گا تو عبادت، اس کو کھلائے گا تو عبادت، اس کو خوش کرے گا تو عبادت، اس کا دل بہلا رہا ہے تو عبادت، اس کے لئے لباس کا انتظام کرے گا تو عبادت، یہ سارے اوقات جو اس کی تربیت و پرورش پر خرچ کرے گا اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے عبادت بن جائیں گے۔ جب نیت کرے گا کہ میں حضور ﷺ کے اس ارشاد پر عمل کرنے کے لئے یہ سب کچھ کر رہا ہوں۔

یہ نیت ایک ایسی چیز ہے جو مٹی کو بھی سونا بنانے والی ہے۔ کرنا تو ہے لیکن اگر رسول اللہ ﷺ کی اتباع کی نیت سے کرلے تو ساری زندگی ثواب لکھا جاتا رہے گا۔

اس فضیلت کی ایک تو یہ وجہ تھی کہ لوگ لڑکیوں کو معیوب سمجھتے تھے اور دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے (واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم) کہ لڑکیوں کی پرورش لڑکوں کے مقابلے میں تھوڑی سی زیادہ نازک ہوتی ہے۔ نزاکت اس میں زیادہ ہے کیونکہ لڑکے آگے چل کر خود کفیل ہو جاتے ہیں، اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاتے ہیں، لڑکیوں کا معاملہ یہ ہے کہ اس کی ساری ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے مردوں پر رکھی ہے۔ جب تک نکاح نہیں ہوتا اس کی ذمہ داری باپ پر ہے باپ نہ ہو تو بھائیوں پر ہے، شادی ہو جائے اس کی ساری ذمہ داری خاوند پر آجاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو دنیا کے کام دھندوں سے فارغ رکھا ہے۔ تاکہ وہ باہر نکل کر خراب نہ ہو اور دوسروں کو خراب نہ کرے۔ اس لئے اس کی ساری ذمہ داری مرد پر یا باپ یا بھائی پر یا بالآخر شوہر رکھی ہے۔ اس لئے باپ کو اس پر خرچ بھی زیادہ کرنا پڑتا ہے۔

اس کی تربیت نازک اس لئے ہے کہ اس کی حفاظت بھی کرنی ہے، اس کو باہر نکالنے میں بڑی احتیاط بھی کرنی ہے، ساتھ ساتھ اس کی تعلیم و تربیت بھی زیادہ کرنی ہے۔ تعلیم و تربیت کے دوران اس کی حفاظت کی احتیاط کا کام لڑکوں کی بہ نسبت زیادہ دشوار اور محنت طلب ہے۔ اس لئے اس کی زیادہ فضیلت رکھی گئی ہے۔ اس لئے جس کو اللہ تعالیٰ نے بچیوں کی نعمت عطا فرمائی ہو، اسے خوش ہونا چاہئے

اور اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے اور اس نعمت کی قدر کرنی چاہئے اور اس نیت سے تربیت کرنی چاہئے کہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم پر عمل کرنے کی نیت سے اس کی پرورش کر رہا ہوں۔

دوسرا فقرہ جو اس حدیث میں بیان فرمایا وہ یہ ہے:

''دو گناہ ایسے ہیں جن کی سزا اللہ تعالیٰ دنیا ہی میں جلدی عطا فرما دیتے ہے''

بہت سارے گناہ تو وہ ہیں جن کی سزا اللہ تعالیٰ نے آخرت کی طرف مؤخر کر رکھی ہے۔ کہ جب آخرت میں حساب ہوگا جنت جہنم کا فیصلہ ہوگا اس وقت ان گناہوں کی سزا بھی دے دی جائے گی۔ لیکن یہ دو گناہ ایسے ہیں جن کی سزا آخرت میں تو ہوگی ہی لیکن آخرت سے پہلے دنیا میں بھی کسی نہ کسی وقت دی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔

یہاں مختصر مضمون ہے لیکن ابوداؤد اور ترمذی وغیرہ کی حدیث میں زیادہ تفصیل کے ساتھ ہے کہ یہ دو گناہ ایسے ہیں کہ آخرت کے عذاب کے علاوہ دنیا میں بھی ان کی سزا دی جاتی ہے۔

ایک گناہ ہے ''بغی''، یعنی ظلم، کسی بھی انسان پر ظلم کرنا، یہ ایسا گناہ ہے جس کی سزا اللہ تبارک وتعالیٰ آخرت میں بھی دیتے ہیں اور دنیا کے اندر بھی اس مبتلائے عذاب کر دیا جاتا ہے۔

بعض اوقات اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ڈھیل ہوتی ہے، خود اللہ رب العزت قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿سَنَسْتَدْرِجُهُم مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ وَأُمْلِي لَهُمْ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ﴾(۱)

''ہم انہیں اس طرح دھیرے دھیرے تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ انہیں پتہ بھی نہیں چلے گا۔ اور میں انہیں ڈھیل دے رہا ہوں یقین رکھو میری تدبیر بڑی مضبوط ہے''

بعض اوقات ہم ڈھیل دیتے ہیں بعض اوقات ہم ظالم کو دیکھتے ہیں بڑے مزے میں ہے بظاہر بڑا خوشحال ہے، عیش کی زندگی گزار رہا ہے، تو وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ڈھیل ہوتی ہے، بالآخر یہ انجام ہوتا ہے کہ دنیا کے اندر کسی نہ کسی وقت اسے پکڑ لیا جاتا ہے، اور کسی بھی طریقے سے پکڑ لیا جاتا ہے، بعض اوقات لوگوں کو اس گرفت کا علم ہوتا ہے اور بعض اوقات نہیں ہوتا، لیکن گرفت ہوتی ضرور ہے اور اللہ تعالیٰ اسے پکڑ لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی گرفت بڑی سخت ہے۔ اگر کسی ظالم کو پھلتا پھولتا دیکھو تو یہ نہ سمجھو کہ یہ خوشحال ہو رہا ہے بلکہ اسے اللہ کی طرف سے ڈھیل دی جارہی اس کی رسی دراز ہو رہی ہے لیکن کسی بھی وقت جب اللہ تعالیٰ اسے پکڑے گا، جب گرفت آئے گی تو سب کچھ پتہ

---

(۱) القلم: ٤٤-٤٥

چل جائے سب اگلا پچھلا بھول جائے گا۔

﴿وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ﴾ (۱)

''اور اس بڑے عذاب سے پہلے بھی ہم انہیں کم درجے کے عذاب کا مزہ بھی ضرور چکھائیں گے''

تو ظلم سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی پناہ مانگیں اور کسی بھی انسان پر ظلم کرنے سے بچیں کہ یہ بڑی سخت چیز اور بہت بڑا جرم ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے۔

دوسری چیز بیان فرمائی، قطیعۃ الرحم، یعنی رشتوں کے حقوق کی حق تلفی، اللہ تعالیٰ نے رشتہ داروں کے بہت سے حقوق رکھے ہیں:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ﴾ (۲)

''بے شک اللہ انصاف کا، احسان کا، اور رشتہ داروں کو ان کے حقوق دینے کا حکم دیتا ہے''

اگر کوئی شخص رشتہ داروں کے حقوق کو پامال کرے کسی بھی طرح پامال کرے، اللہ تعالیٰ نے ان کے جو حقوق رکھے ہیں وہ ان کو نہ دے۔ والدین کا حق ہے، بہن بھائیوں کا حق ہے، بچوں کا حق ہے، اور رشتہ داروں کے حقوق ہیں اگر کوئی شخص ان کے حقوق ادا نہ کرے اور قطع تعلقی کرلے، ان سے ملنا چھوڑ دے، سلام نہ کرے، اس سے بات چیت بند ہے یہ سب قطع رحمی میں داخل ہے۔ اگر ناجائز اور ناحق طریقے پر ایسا کرے تو یہ ایسا بڑا گناہ ہے کہ اس سزا آخرت سے پہلے دنیا میں ہی مل جاتی ہے کسی نہ کسی شکل میں۔ آخرت میں تو ملنی ہے۔

تو ان دو چیزوں کا خاص طور پر رسول اللہ ﷺ نے ذکر فرمایا کہ ان سے بچنے کی کوشش کرو ایک ظلم اور دوسرا قطع رحمی، کیونکہ ان سے آخرت بھی خراب ہوگی اور دنیا بھی خراب ہوگی۔ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو اس سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

☆☆☆

---

(۱) السجدة: ۲۱

(۲) النحل: ۹۰

چھوٹے پر زیادتی کی صورت میں معافی کا طریقہ ☆

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ، اَمَّابَعْدُ!

ایک ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

''بعض اوقات یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر ہم صریح الفاظ میں (اپنے سے چھوٹے سے) معافی مانگیں گے تو یہ گستاخ ہو کر زیادہ نافرمانی کرے گا، بعض اوقات یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر ہم معافی مانگیں گے تو یہ شرمندہ ہوگا، مگر یہ عذر اس وقت ہیں جب اس سے تعلق رکھنا چاہیں، تو ان صورتوں میں صرف اس کو خوش کر دینا امید ہے کہ معافی کے قائم مقام ہو جائے گا۔ اور بعض اوقات اس سے (آئندہ) تعلق ہی نہیں رکھنا، جیسے ملازم کو موقوف کر دیا، یا ملازم خود (ملازمت) چھوڑ کر جانے لگا، تو اس وقت ضروری ہے کہ زیادتی ہو جانے کی صورت میں اس سے صریح معافی مانگی جائے، کیونکہ یہاں وہ دونوں عذر موجود نہیں، اس میں اگر رکاوٹ ہو تو میرے نزدیک اس کا سبب ضرور ''کبر'' ہے، گو اپنے کو بڑا نہ سمجھے، مگر کبر کے مقتضیٰ پر عمل تو ہوا، غایت سے غایت (زیادہ سے زیادہ) کبر اعتقادی نہ ہوگا، مگر کبر عملی تو ضرور ہے، اگر کوئی (شخص) کبر کی تقسیم کو تسلیم نہ کرے تب بھی ظلم تو ہوا، جس سے معافی مانگنا واجب ہے، لہٰذا معافی نہ مانگنے میں اگر کبر کا گناہ نہ ہوا تو ظلم کا (گناہ) تو ہوا''(۱)

یہ مسئلہ اکثر لوگوں کو بکثرت پیش آتا ہے، مثلاً اگر کوئی شخص افسر ہے اور لوگ اس کے ماتحت کام کرتے ہیں، اس کو یہ مسئلہ پیش آتا ہے، اسی طرح باپ کو اپنے بیٹے کے ساتھ یہ مسئلہ پیش آتا ہے، اسی طرح استاد کو اپنے شاگردوں کے ساتھ یہ مسئلہ پیش آتا ہے، اسی طرح شیخ کو اپنے مریدوں کے

☆ اصلاحی مجالس (۲/ ۷۴ تا ۹۳) بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دار العلوم، کراچی
(۱) انفاس عیسیٰ، ص: ۱۵۸

ساتھ پیش آتا ہے، وہ یہ کہ بعض اوقات اپنے ماتحت کو یا اپنے بیٹے کو یا اپنے شاگرد کو یا اپنے مرید کو کسی غلطی پر تنبیہ کرنے میں زیادتی ہو جاتی ہے، جتنی تنبیہ کرنی چاہیے تھی اس سے زیادہ کر دی، یا جتنا اس کو ڈانٹنا چاہیے تھا اس سے زیادہ ڈانٹ دیا، یا جتنی سزا دنی چاہیے تھی اس سے زیادہ دے دی، یا سزا کا موقع نہیں تھا، لیکن اس کو غلط سزا دے دی۔ اس طرح کے واقعات بکثرت پیش آتے ہیں۔

اب سیدھی بات تو یہ ہے کہ جس کے ساتھ تم نے زیادتی کی ہے، اس سے معافی مانگ لو کہ مجھ سے غلطی ہوگئی ہے، مجھے معاف کر دو۔ لیکن بعض اوقات یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر میں اس طرح صریح الفاظ میں اس سے معافی مانگوں گا تو اس کے اندر اور زیادہ نافرمانی کا جذبہ پیدا ہو جائے گا، یہ اور گستاخ ہو جائے گا اور غلط راستے پر چل پڑے گا۔

دیکھئے! آدمی آدمی میں فرق ہوتا ہے، کوئی آدمی تو ایسا ہوتا ہے کہ اگر اس سے کوئی بڑا آدمی جھک کر بات کر لے اور دب کر بات کر لے تو پانی پانی ہو جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں ہمیشہ کے لیے اس کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ لیکن بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان کے ساتھ کسی بڑے نے جھک کر بات کر لی یا دب کر بات کر لی تو وہ اور شیر ہو جاتے ہیں، اور اس کے نتیجے میں وہ اور زیادہ سرکشی پر اتر آتے ہیں۔ ''متنبیؔ'' شاعر بعض اوقات بڑی حکیمانہ باتیں کہتا ہے، چنانچہ وہ کہتا ہے

اِذَا اَنْتَ اَکْرَمْتَ الْکَرِیْمَ مَلَکْتَهٗ

وَاِنْ اَنْتَ اَکْرَمْتَ اللَّئِیْمَ تَمَرَّدَا

یعنی اگر تم کسی شریف آدمی کی عزت کرو گے اور اس کا اکرام کرو گے تو وہ تمہارا غلام بن جائے گا اور تم اس کے مالک بن جاؤ گے، اور اگر تم کسی کمینے کے ساتھ عزت کا معاملہ کرو گے تو وہ سرکش ہو جائے گا۔ آگے کہتا ہے:

وَضْعُ النَّدٰی فِی مَوْضِعِ السَّیْفِ بالعلی

مُضِرٌّ کَوَضْعِ السَّیْفِ فِی مَوْضِعِ النَّدٰی

یعنی جس جگہ تلوار استعمال کرنی چاہیے تھی، اگر تم نے وہاں سخاوت کا برتاؤ کیا تو یہ بھی اتنا ہی مضر ہے جتنا کہ سخاوت کے موقع پر تلوار کا استعمال مضر ہے۔ بہرحال، آدمی آدمی میں فرق ہوتا ہے، کسی آدمی کے ساتھ اگر آپ تواضع سے پیش آئیں تو وہ بچھ جائے گا اور پھر کبھی بھی سرکشی پر آمادہ نہیں ہوگا، اور بعض وہ ہوتے ہیں کہ اگر ان کے ساتھ تواضع کے ساتھ پیش آؤ تو وہ الٹا سرکش بن جاتے ہیں۔

اس لیے بعض اوقات دل میں خیال آتا ہے کہ اگر میں اپنے سے چھوٹے سے معافی مانگوں گا تو وہ سرکش ہو جائے گا اور زیادہ نافرمانی پر اتر آئے گا، اس کے دماغ میں اور زیادہ خناس پیدا ہو جائے گا۔

دو میں سے ایک بات کا فیصلہ کرلیں

ایسی صورت کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ پہلے دو باتوں میں سے ایک بات کا فیصلہ کرلو، وہ یہ کہ جس چھوٹے کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا ہے، آئندہ اس سے تعلق باری رکھنا ہے یا نہیں؟ مثلاً اپنے کسی نوکر کے ساتھ ایسا معاملہ پیش آ گیا، تو پہلے یہ فیصلہ کرو کہ ائندہ اس کو اپنے پاس بطور ملازم کے رکھنا ہے یا اس کو ملازمت سے علیحدہ کرنا ہے۔

ملازم کے ساتھ اچھا برتاؤ کیجیے

اگر اس کو ملازمت پہ برقرار رکھنا ہے تو اس صورت میں نوکر سے صریح الفاظ میں معافی مانگنے کے بجائے کسی اور عنوان سے اس کی دلداری کر دی جائے، مثلاً اس کو کوئی ہدیہ یا تحفہ دے دیا، یا اس سے ہنسی مذاق کی میٹھی بات کر لی، یا اس کی دعوت کر دی، تاکہ اس کے نتیجے میں وہ یہ سمجھے کہ میرے ساتھ حسن سلوک کیا گیا ہے، ایسا حسن سلوک کر کے سابقہ زیادتی کی تلافی کر لی جائے۔

اور اگر یہ ارادہ ہے کہ اب اس کو ملازمت پر نہیں رکھنا، بلکہ اس کی ملازمت سے چھٹی کرنی ہے اور اب اس کے ساتھ تعلق برقرار نہیں رکھنا، تو اس صورت میں چونکہ گستاخ یا سرکش ہو جانے کا اندیشہ فضول اور بے کار ہے، اس لیے اس صورت میں صراحۃً اس نوکر سے معافی مانگنی چاہیے۔ چنانچہ جب اس ملازم کو رخصت کرو تو اس سے صاف صاف کہہ دو کہ جو ہم سے زیادتی ہوئی ہو وہ ہمیں معاف کر دو، اور خاص طور پر اس زیادتی کا بھی ذکر کر دو کہ فلاں وقت میں مجھ سے زیادتی ہوئی تھی اور مجھ سے غلطی ہوئی تھی، مجھے معاف کر دو۔

یہ تکبر کی بیماری کا علاج ہے

جب تم اپنے ملازم سے یہ کہو گے کہ فلاں وقت مجھ سے جو زیادتی ہوئی تھی، مجھے معاف کر دو۔ ان الفاظ کو زبان سے نکالتے وقت متکبر کے دل پر آرے چل جاتے ہیں، لیکن تکبر کا علاج ہی یہ ہے کہ ملازم کو رخصت کرتے وقت صریح الفاظ میں اس سے یہ الفاظ کہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ جب صریح لفظوں میں معافی ہو جائے گی تو پھر ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ کے یہاں مواخذہ نہیں ہوگا کہ تم نے اپنے ماتحت کو ناحق سزا دی تھی یا ناحق ڈانٹا تھا۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ تکبر کی بیماری کا علاج ہو جائے گا۔

حضور ﷺ کا معافی مانگنا

اس کائنات میں کوئی شخص حضور اقدس ﷺ کی عزت اور منصب کے برابر ہوسکتا ہے؟ بلکہ دنیا و آخرت میں کوئی منصب، کوئی عہدہ، کوئی رتبہ، کوئی حیثیت سرکار دو عالم ﷺ کے منصب اور عہدے سے زیادہ نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس کے باوجود حضور اقدس ﷺ مجمع عام میں کھڑے ہوکر اعلان فرما رہے ہیں کہ اگر کسی سے معاملہ کرتے وقت مجھ سے کوئی زیادتی ہوگئی ہو یا میں نے کسی کی جان، کسی کا مال، کسی کی عزت وآبرو پر کوئی زیادتی کی ہو تو آج میں یہاں سب کے سامنے موجود ہوں، اگر وہ چاہے تو مجھ سے بدلہ لے لے یا مجھے معاف کر دے۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا بدلہ لینا

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوگئے اور کہا کہ یا رسول اللہ! مجھے آپ ﷺ سے بدلہ لینا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ کس چیز کا بدلہ لینا ہے؟ ان صحابی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ ایک دن آپ ﷺ نے میری کمر پر مارا تھا، اس کا بدلہ لینا ہے۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ مجھے تو یاد نہیں ہے کہ میں نے کسی کو مارا ہو، لیکن اگر تمہیں مارنا یاد ہو تو بدلہ لے لو، ان صحابی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! جس وقت آپ ﷺ نے میری کمر پر مارا تھا، اس وقت میری کمر ننگی تھی، میری کمر پر کوئی کپڑا نہیں تھا، برابر بدلہ تو اس وقت ہوگا جب آپ کی کمر پر بھی کپڑا نہ ہو، اس وقت تو آپ ﷺ کی کمر پر چادر ہے۔ سرکار دو عالم ﷺ نے اپنی کمر سے چادر ہٹالی اور فرمایا کہ اب بدلہ لے لو چنانچہ جب آپ ﷺ نے کمر مبارک سے چادر ہٹائی تو مہر نبوت نظر آنے لگی۔ وہ صحابی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی پشت کی طرف گئے اور مہر نبوت کو جا کر بوسہ دیا اور کہا کہ میرا مقصد تو مہر نبوت کو بوسہ لینا تھا، بدلہ لینا میرا مقصود نہیں تھا۔

جب سرکار دو عالم ﷺ کھڑے ہوکر یہ اعلان فرما رہے ہیں کہ اگر کسی کے ساتھ میں نے زیادتی کی ہے تو وہ بدلہ لے لے یا مجھے معاف کر دے تو ہما شما کس شمار و قطار میں ہیں۔

بہرحال! انسان یہ کہتے ہوئے کیوں شرمائے کہ میری غلطی پر مجھے معاف کر دو۔ اس لیے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب اس ملازم اور نوکر سے تعلق نہیں رکھنا تو صاف صاف الفاظ میں اس سے معافی مانگ لو اور معافی مانگنے میں کبھی شرم کو آڑے نہ آنے دو۔

معافی کا دروازہ بند ہونے سے پہلے معافی مانگ لیں

ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کے ذمے دوسرے کا کوئی جانی یا مالی حق ہو، وہ آج اس شخص سے معاف کرالے جس کا حق ہے، قبل اس کے کہ وہ وقت آجائے کہ معافی کا دروازہ بند ہوجائے۔

آج تو تم اس کی خوشامد کر کے معاف کرالو گے یا کوئی معاوضہ دے کر معاف کرالو گے، لیکن ایک وقت ایسا آنے والا ہے جب تمہارے پاس اس کو پیش کرنے کے لیے نہ دینار ہوگا اور نہ درہم ہوگا، آخرت میں تو وہاں کی کرنسی استعمال ہوگی اور وہاں کی کرنسی نیکیاں ہیں، وہاں پر تو حق کی معافی کے لیے یا تو اپنی نیکیاں اس کو دینی پڑیں گی یا اس کے گناہ اپنے اوپر لینے پڑیں گے، اس کے حق کو ادا کرنے کا اور اس کے وبال سے بچنے کا اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہوگا۔ لہٰذا وہ وقت آنے سے پہلے پہلے معاف کرالو۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا معافی مانگنا

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضور اقدس ﷺ کی معافی مانگنے کی سنت پر عمل کرتے ہوئے وفات سے چند سال پہلے ایک رسالہ لکھا تھا، اس رسالے کا نام تھا "العذر والنذر" اس رسالے میں لکھا تھا کہ ساری عمر میرا جن لوگوں سے تعلق رہا، نہ جانے مجھ سے کس کی کیا کیا حق تلفی ہوئی ہو، میں آج ان حقوق کی ادائیگی کے لیے تیار ہوں، اگر کسی کا مالی حق میرے ذمے ہے اور مجھے ادا کرنا یاد نہیں رہا تو مجھے یاد دلا کر وہ حق وصول کرلے، اور اگر کسی کا جانی حق ہے تو اگر وہ مجھ سے بدلہ لینا چاہتا ہے تو بدلہ لے لے، معاف کرنا چاہتا ہے تو معاف کردے، میں آپ سب سے معافی کا طالب گار ہوں۔ پھر یہ رسالہ خط کی شکل میں اپنے سارے متعلقین کو بھیجا جو ہزاروں کی تعداد میں تھے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا معافی مانگنا

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی وفات سے تقریباً دو سال پہلے معافی کا ایک مضمون مجھ سے لکھوایا اور پھر اس کو "کچھ تلافی مافات" کے نام سے "البلاغ" میں بھی شائع کیا اور فرداً فرداً بھی اپنے متعلقین کے پاس بھیجا اور اس کے ذریعہ اپنے تمام متعلقین سے معافی مانگی۔

لہٰذا یہ معافی مانگ لینا کمی کی بات نہیں، اس سے انسان کی عزت میں کمی نہیں آتی، اس کے

ذریعہ انسان آخرت کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتا ہے، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کے ذریعہ تکبر کا خاتمہ ہوتا ہے۔

ہدیہ دے کر نوکر کو خوش کر دیجیے

اور اگر اس ملازم اور نوکر سے آئندہ تعلق باقی رکھنا ہے تو اس صورت میں صراحتاً اس سے معافی مانگنے کی صورت میں اگر اس کے سرکش ہونے کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں اس کے ساتھ کسی عنوان سے اس کی دلداری کر لو، مثلاً اس کو کوئی ہدیہ دے دو یا کوئی تحفہ دے دو اور اس کا دل خوش کر دو۔

نوکر اور ماتحت کے بارے میں اتنی تاکید کیوں؟

''نوکر'' اور ''ماتحت'' ایسے لوگ ہیں کہ ان کے ساتھ انصاف اللہ تعالیٰ کی خاص توفیق ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے، ورنہ اکثر و بیشتر انسان اپنے ماتحتوں کے معاملے میں انصاف سے تجاوز کر جاتا ہے، اس لیے کہ وہ ماتحت اپنی گرفت اور اپنے پنجے میں ہوتا ہے، ہم جب چاہیں اس کو ڈانٹ سکتے ہیں، جب چاہیں اس کی خبر لے سکتے ہیں، تو چونکہ ماتحت پر انسان کو قدرت حاصل ہوتی ہے، اس کے نتیجے میں وہ اس قدرت کو حدود کے اندر رہ کر استعمال کرنے سے قاصر رہتا ہے اور اس قدرت کو غلط استعمال کر جاتا ہے۔ اسی لیے حضور اقدس ﷺ نے خاص طور پر اس کی طرف توجہ دلائی۔

غلاموں کے ساتھ بھی انصاف کیجئے

ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنے غلام کو مار رہے تھے، اب ظاہر ہے کہ کسی واقعی غلطی پر سزا دے رہے ہوں گے، بلاوجہ تو سزا نہیں دے رہے تھے، حضور اقدس ﷺ نے آپ کو مارتے ہوئے دیکھا تو ارشاد فرمایا:

((اَللّٰهُ اَقْدَرُ عَلَيْكَ مِنْكَ عَلَيْهِ))(۱)

(۱) صحيح مسلم، كتاب الأيمان، باب صحبة المماليك وكفارة من لطم عبده، رقم: ۳۱۳۵، سنن الترمذي، كتاب البر والصلة عن رسول الله، باب النهي عن ضرب الخدم وشتمهم، رقم: ۱۸۷۱، سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في حق المملوك، رقم: ٤٤٩٢، مسند أحمد، رقم: ١٦٤٦٧۔ واضح رہے کہ ہمارے ذکر کردہ مراجع کے مطابق یہ واقعہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بجائے حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کا ہے، جن کا اصل نام ''عقبة بن عمرو بن ثعلبة'' تھا۔ تتبع کے باوجود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے ان الفاظ کے ساتھ ایسا واقعہ نہیں مل سکا۔

یعنی جتنی قدرت تمہیں اس غلام پر حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کو اس سے زیادہ قدرت تم پر حاصل ہے۔ مطلب یہ تھا کہ ذرا اس بات کا دھیان کرو کہ اس قدرت کو صحیح اور برمحل اور مناسب حدود میں استعمال کر رہے ہو یا نہیں؟ اگر اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر قدرت کا مظاہرہ کرنے پر آ جائیں تو تمہارا ٹھکانہ کہاں ہوگا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا معمول

بہرحال! ان چھوٹوں اور ماتحتوں کے ساتھ معاملات کرنے میں تکبر کے بڑے امکانات ہیں، لہٰذا اس پر اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنی چاہیے۔ اس لیے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ایک ملفوظ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ جب میں کبھی اپنے کسی چھوٹے سے مواخذہ کرتا ہوں اور اس کو ڈانٹنے کی نوبت آ جاتی ہے تو الحمدللہ کبھی اس کی خلاف ورزی نہیں ہوتی کہ ایک طرف تو اس کو ڈانٹ رہا ہوتا ہوں اور دوسری طرف دل میں اللہ تعالیٰ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ یا اللہ! مجھ سے ایسا مواخذہ نہ فرمایئے گا۔ اب بتایئے جس شخص کے دل میں ہر وقت آخرت کی یہ فکر لگی ہوئی ہو، وہ کیسے حد سے تجاوز کرے گا۔

بھائی نیاز صاحب مرحوم کا واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ بابا نجم احسن رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ سنایا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خادم تھے، جن کا نام ''بھائی نیاز'' تھا، وہ حضرت کے بہت قریب رہتے تھے، اس وجہ سے ذرا منہ چڑھے خادم تھے، اور جو کسی بڑے کا منہ چڑھا ہوتا ہے وہ دوسروں پر ناز بھی کیا کرتا ہے، بقول کسی کے ؏

بنا ہے شاہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا

شاہ کا مصاحب دوسروں پر ناز کرتا ہے۔ اس لیے حضرت والا کے پاس جو آنے جانے والے مہمان ہوتے، بعض اوقات ان کے ساتھ نامناسب انداز میں پیش آتے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو اس کی اطلاع ہوئی کہ یہ بھائی نیاز آنے جانے والوں کے ساتھ درشتی کا معاملہ کرتے ہیں، حضرت نے ان کو بلایا اور سخت لفظوں میں ان سے کہا: میاں نیاز! تم آنے والوں کے ساتھ لڑتے جھگڑتے رہتے ہو اور ان کے ساتھ بدتہذیبی سے بات کرتے ہو۔ جواب میں انہوں نے کہا کہ حضرت! جھوٹ نہ بولو، اللہ سے ڈرو۔ دیکھئے کہ ایک نوکر اور خادم اپنے آقا سے کہہ رہا ہے کہ ''جھوٹ نہ بولو، اللہ سے ڈرو'' اب اس وقت تو اور زیادہ اس نوکر کو ڈانٹنا چاہیے تھا لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ''استغفر اللہ، استغفر اللہ'' کہتے ہوئے دوسری طرف چلے گئے۔

بعد میں لوگوں کے سوال کرنے پر حضرت والا نے بتایا کہ جب بھائی نیاز نے مجھ سے کہا کہ ''جھوٹ نہ بولو، اللہ سے ڈرو'' اس وقت مجھے تنبہ ہوا کہ میں نے یک طرفہ بیان سن کر ان کو ڈانٹنا شروع کر دیا تھا، ابھی میں نے صرف لوگوں کی بات سنی تھی کہ انہوں نے لوگوں کے ساتھ یہ زیادتی کی ہے، مجھے یہ چاہیے تھا کہ میں ان کا بیان بھی سنتا اور ان سے پوچھتا کہ لوگ تمہارے بارے میں یہ کہہ رہے ہیں، بتاؤ! یہ صحیح ہے یا غلط ہے؟ ان کے بیان کو سننے کے بعد ڈانٹنے کا فیصلہ کرتا، لیکن میں نے یک طرفہ بات پر ڈانٹنا شروع کر دیا، اس وجہ سے مجھ سے غلطی ہوئی، اس لیے میں استغفار کرتا ہوا چلا گیا۔

حضرت بابا نجم احسن رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ سنانے کے بعد فرمایا کہ میرا خیال یہ ہے کہ بھائی نیاز کا یہ مطلب نہیں تھا کہ حضرت جھوٹ نہ بولیں اور اللہ سے ڈریں، بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ جن لوگوں نے آپ سے شکایت لگائی ہے ان کو چاہیے کہ وہ جھوٹ نہ بولیں اور اللہ سے ڈریں۔ لیکن جلدی میں زبان سے براہ راست حضرت والا سے خطاب کرتے ہوئے کہہ دیا کہ جھوٹ نہ بولو، اللہ سے ڈرو۔

اللہ کی حدود پر رک جانے والے

لیکن اس واقعہ میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جب ایک خادم کو ڈانٹا تو فوراً اس وقت ذہن میں یہ خیال آیا کہ میں نے یک طرفہ بیان پر فیصلہ کر دیا، یہ مجھ سے غلطی ہوئی، لہٰذا اس پر استغفار کرتے ہوئے چلے گئے، اس کو کہا جاتا ہے:

''کان وقّافاً عند حدود اللّٰہ''

''یعنی اللہ تعالیٰ کی حدود کے آگے ٹھہر جانے والے تھے۔''

یہ تھے ''حکیم الامت'' ویسے ہی ''حکیم الامت'' نہیں بن جاتے، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کا فیض چار دانگ عالم میں پھیلایا۔ آج ہم نے چند ظاہری رسوم کا نام ''دین'' رکھ لیا ہے، حالانکہ یہ بھی سب دین کا حصہ ہے کہ کس وقت سے کیا معاملہ کیا جائے اور کس حد میں کیا کیا جائے؟ یہ ترازو اپنے میں لگانی پڑتی ہے کہ کہیں ایک طرف پلہ جھکے نہیں، بلکہ توازن کے ساتھ سارے کام انجام پائیں۔

بدلہ میں برابری آسان نہیں

بہر حال! چھوٹوں کے ساتھ معاملات کرنے میں خون کے گھونٹ پینے پڑتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

دو گونہ رنج و عذاب جانِ مجنون را

ایک طرف اس کا خیال رکھنا ہے کہ ہماری طرف سے کوئی زیادتی نہ ہو جائے اور اگر کوئی زیادتی ہوتو اس کی معافی تلافی ہو جائے۔ اور دوسری طرف یہ ہے کہ وہ سرکش نہ بنے، انتظام خراب نہ ہو۔ ان دونوں کے درمیان توازن رکھنا بس یہی حدود اللہ کو قائم کرنا ہے۔ اور یہ کام عموماً کسی شیخ کی صحبت اور تربیت کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا، اس کے بغیر آدمی پھسل جاتا ہے۔ ہاں اگر کسی کی باقاعدہ تربیت ہوئی ہوتو وہ سمجھتا ہے کہ کس جگہ پر کیا طرز عمل اختیار کرنا ہے اور کتنا اختیار کرنا ہے، اگر کسی کو ڈانٹنا بھی ہے تو کتنا زور دینا ہے، اور اس سے زیادہ دینے میں کس طرح زیادتی ہو جائے گی۔ یہ ترازو ویسے ہی دل میں پیدا نہیں ہو جاتی، اگر میں اس کو دو اور دو چار کر کے لفظوں میں بیان کرنا چاہوں تو بیان نہیں کرسکتا، بلکہ یہ ایک ذوق اور ملکہ ہے، وہ ذوق اور ملکہ جب دل میں پیدا ہو جاتا ہے تو وہ بتاتا ہے کہ اس جگہ اتنے ڈوز کی ضرورت ہے، اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں، اس سے زیادہ کرو گے تو زیادت ہو جائے گی۔ قرآن کریم میں یہ جو فرمایا:

﴿فَاعۡتَدُوۡا عَلَيۡهِ بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ﴾(۱)

یعنی جتنی زیادتی کسی نے تم پر کی ہے، تم بھی اتنی ہی زیادتی اس پر کر سکتے ہو۔ اس آیت پر عمل کرنا بہت مشکل کام ہے، کیونکہ جانچ تول کر یہ کرنا کہ میں اتنا بدلہ لوں جتنا اس نے کیا ہے، یہ آسان کام نہیں۔

اولیاء کے مختلف رنگ ہوتے ہیں

''ارواح ثلاثہ'' میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے قصہ لکھا ہے کہ ایک شخص نے کسی بزرگ سے سوال کیا کہ حضرت میں نے سنا ہے کہ اولیاء اللہ کے مختلف الوان ہوتے ہیں اور ان کی مختلف شانیں ہوتی ہیں، لہٰذا میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیا مختلف الوان ہوتے ہیں اور کیا شانیں ہوتی ہیں؟ ان بزرگ نے فرمایا کہ تم اسی چکر میں مت پڑو، اپنے کرنے کا جو کام ہے وہ کیے جاؤ، ان صاحب نے اصرار کیا کہ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں۔

ان بزرگوں نے فرمایا کہ اچھا ایسا کرو کہ فلاں گاؤں میں ایک مسجد ہے، اس مسجد میں جاؤ، وہاں تمہیں تین بزرگ ذکر اللہ میں مشغول نظر آئیں گے، تم جا کر تینوں کو پیچھے سے ایک ایک مکّہ مار دینا، پھر دیکھنا کہ وہ کیا کرتے ہیں، جو وہ کریں مجھے آ کر بتانا۔ چنانچہ وہ صاحب گاؤں کی مسجد میں گئے، جا کر دیکھا تو واقعۃً تین بزرگ ذکر اللہ میں مشغول تھے، اس نے جا کر پہلے ایک کو پیچھے سے مکہ

(۱) البقرہ: ۱۹٤

مارا، ان صاحب نے پیچھے مڑ کر ان کو بھی ایک مکہ اتنی زور کا مارا اور پھر ذکر اللہ میں مشغول ہو گئے۔ دوسرے کو جا کر مکہ مارا تو انہوں نے پلٹ کر دیکھا ہی نہیں کہ کس نے مارا اور کیوں مارا، بلکہ اپنے ذکر میں مشغول رہے۔ جب تیسرے شخص کو مارا تو انہوں نے پلٹ کر ان کا ہاتھ دبانا شروع کر دیا کہ تمہارے ہاتھ میں چوٹ تو نہیں لگی۔

جب یہ صاحب واپس ہوئے تو ان بزرگ نے پوچھا کہ کیا ہوا؟ انہوں نے ساری تفصیل بتا دی کہ تینوں نے علیحدہ علیحدہ معاملہ کیا، ان بزرگ نے فرمایا کہ تم بزرگوں کے الوان جاننا چاہ رہے تھے، یہ مختلف الوان تھے، پہلے بزرگ جنہوں نے تم سے بدلہ لیا، یہ بتاؤ کہ انہوں نے اتنی ہی زور کا مکہ مارا جتنی زور کا تم نے مارا تھا، یا زیادہ زور کا مارا؟ ان صاحب نے کہا کہ نہیں، اتنی ہی زور کا مارا تھا، فرمایا کہ انہوں نے یہ سوچا کہ جتنی زیادتی اس نے میرے ساتھ کی، میں نے بھی اتنا ہی بدلہ لے لیا۔

لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ بعض اللہ کے ولی لوگوں سے بدلہ اس لیے لیتے ہیں تاکہ یہ شخص آخرت کے مواخذہ سے بری ہو جائے، اس لیے بدلہ نہیں لیتے کہ اس نے مجھے تکلیف پہنچائی، بلکہ اس لیے بدلہ لیتے ہیں کہ اگر میں اس سے یہاں بدلہ لے لوں گا تو یہ آخرت کے مواخذہ سے بری ہو جائے گا، اسی لیے ان بزرگ نے بدلہ لیا، لیکن اتنا ہی لیا جاتنا لینا چاہتے تھے، اس سے زیادہ نہیں لیا۔

دوسرے بزرگ جو تھے انہوں نے سوچا کہ بدلہ لینے کے چکر میں کون پڑے، کیونکہ اگر ایک انچ بھی زیادہ بدلہ لے لیا تو الٹی اپنی گردن پکڑی جائے گی، کیوں خواہ مخواہ چکر میں پڑوں اور جس کام میں لگا ہوا ہوں، اس سے اپنا وقت ضائع کروں، اللہ کے ذکر میں لگا ہوا ہوں، اسی میں لگا رہوں، کوئی اگر مارتا ہے تو مارتا رہے۔

تیسرے بزرگ نے اپنے آپ کو اتنا مٹایا ہوا تھا کہ نہ صرف یہ کہ ان کو اپنی چوٹ کی پروانہ ہوئی، بلکہ الٹا مارنے والے کا ہاتھ دبانے لگے کہ آپ کو چوٹ تو نہیں لگی۔ بہرحال! بزرگوں کے یہ مختلف رنگ اور مختلف طریقے تھے، اور تینوں طریقے جائز تھے، پہلا طریقہ بھی جائز تھا، اس لیے کہ برابر کا بدلہ لینا جائز ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ (۱)

اور دوسرا طریقہ یعنی معاف کرنا بھی جائز ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

---

(۱) الشوریٰ: ۴۰، آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''اور کسی برائی کا بدلہ اسی جیسی برائی ہے۔''

﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ (۱)

اور حضور اقدس ﷺ کی سنت بھی یہی تھی کہ معاف فرما دیا کرتے تھے، اپنی ذات کے لیے کبھی بدلہ نہیں لیا۔ اور تیسرا طریقہ اس سے زیادہ افضل اور اعلیٰ تھا کہ اپنی فکر کے بجائے مارنے والے کی فکر کر رہے تھے۔

بہرحال! بندوں کے حقوق کا معاملہ بڑا نازک ہے، اس میں ہر وقت انسان کو ڈرتے رہنا چاہیے کہ کہیں مجھ سے زیادتی نہ ہو جائے۔ آج لوگ کس بے دردی سے اور بلا خوف انسانوں کے حقوق پر، ان کی جان پر، ان کے مال پر، ان کی آبرو پر ڈاکے ڈالتے ہیں، وہ جان مال اور آبرو جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان کی جان اور مال اور آبرو بیت اللہ سے زیادہ حرمت والا ہے، اگر کسی نے مسلمان کی جان مال پر حملہ کیا تو وہ ایسا ہے جیسے اس نے کعبہ کو ڈھا دیا۔ العیاذ باللہ۔

ایک صاحب کے لٹنے کا واقعہ

ایک صاحب اپنا قصہ بیان کر رہے تھے کہ وہ دفتر سے گھر جا رہے تھے، پیسوں کا تھیلہ ہاتھ میں تھا، دو صاحبان راستے میں آ گئے، پہلے پستول دکھایا اور ایک تھپڑ مارا، دو گالیاں دیں، اور پھر کہا کہ جو کچھ ہے وہ ہمارے حوالے کر دو۔ مطلب یہ ہے کہ صرف مال لینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جان، مال اور آبرو، تینوں پر حملہ کیا، اور یہ خیال ہی نہیں آتا ہے کہ ہم کیا کام کر رہے ہیں، یہ نہیں سوچتے کہ آخر ہمیں مرنا بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی جانا ہے، اور یہ زندگی جس میں ہم جی رہے ہیں، معلوم نہیں ہے کہ ایک دن کی ہے یا زیادہ کی ہے، جو آدمی دوسروں پر پستول لیے پھرتا ہے اس کی زندگی بھی موہوم ہے، پتہ نہیں صبح موت کو دیکھے یا شام کو دیکھے، اس دنیا سے جانا یقینی ہے، لیکن اس کے باوجود یہ کام کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان سب کو ہدایت عطا فرمائے اور فکر عطا فرمائے۔ اور ہمیں بھی حقوق العباد کی فکر کرنی چاہیے کہ اپنی ذات سے دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے، نہ جسمانی، نہ مالی اور نہ آبرو کی، اور اگر دوسروں کو ہم سے تکلیف پہنچی ہو تو فوراً اس کو معاف کرانے کی فکر کرنی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

☆☆☆

---

(۱) الشوریٰ: ۴۳

خاندانی نظام ☆

عائلی زندگی معاشرے کا وہ بنیادی پتھر ہے جس پر تہذیب وتمدن کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اگر معاشرے میں خاندانی نظام کا ڈھانچہ توڑ پھوڑ اور افراتفری کا شکار ہو، تو خواہ زمینیں سونا اگل رہی ہوں، یا مشینوں سے لعل و جواہر برآمد ہو رہے ہوں، زندگی سکون سے محروم ہو جاتی ہے۔ آج یورپ اور امریکہ کی وہ دنیا جو سیاسی اور معاشی اعتبار سے پسماندہ اور ترقی پذیر ملکوں کے لیے قابل رشک سمجھی جاتی ہے، خاندانی نظام کی توڑ پھوڑ کی وجہ سے اسی سنگین مسئلے سے دو چار ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دولت کی ریل پیل، اور تیز رفتار مادی ترقی کے باوجود لوگ ایک انجانے اضطراب کا شکار ہیں، اپنی اندرونی بے چینی سے گھبرا کر کوئی یوگا کے دامن میں پناہ لے رہا ہے، کوئی منشیات اور خواب آور دواؤں میں سکون ڈھونڈ رہا ہے، اور بالآخر جب ان میں سے کوئی چیز اس بے چینی کا علاج نہیں کر پاتی، تو آخری چارۂ کار کے طور پر لوگ خودکشی کر رہے ہیں، اور خودکشی کرنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

ابھی کچھ عرصہ پہلے میں سوئیٹزرلینڈ میں تھا، میرے میزبانوں نے آمدورفت کے لیے جس گاڑی کا انتظام کیا تھا، اس کا ڈرائیور ایک اطالوی نسل کا تعلیم یافتہ آدمی تھا، اور انگریزی روانی سے بول لیتا تھا، وہ چند روز میرے ساتھ رہا، اس کی عمر تقریباً چالیس سال کو پہنچ رہی تھی، لیکن ابھی تک اس نے شادی نہیں کی تھی، میرے وجہ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ہمارے معاشرے میں شادی اکثر اس لیے بے مقصد ہو جاتی ہے کہ شادی کے بعد شوہر اور بیوی کے درمیان زندگی کی پائیدار رفاقت کا تصور بہت کمیاب ہے، اس کے بجائے شادی ایک رسمی تعلق کا نام رہ گیا ہے، جس کا مقصد بڑی حد تک ایک دوسرے سے مالی فوائد حاصل کرنا ہوتا ہے، بہت سی خواتین شادی کے بعد جلد ہی طلاق حاصل کر لیتی ہیں، اور یہاں کے قوانین کے مطابق شوہر کی جائیداد کا بڑا حصہ ہتھیا کر اسے دیوالیہ کر جاتی ہیں، اور یہ پہچاننا مشکل ہوتا ہے کہ کون سی عورت صرف شوہر کی جائیداد پر قبضہ کرنے کے لیے شادی کر رہی ہے، اور کون وفاداری کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے، اس نے حسرت بھرے انداز میں یہ بات کہہ کر

☆ ذکر و فکر، ص: ۳۰۸

ساتھ ہی یہ تبصرہ بھی کیا کہ آپ کے ایشیائی ممالک میں شادی واقعی با مقصد ہوتی ہے، اس سے ایک جما ہوا خاندان وجود میں آتا ہے، جس کے افراد آپس میں دکھ سکھ کے ساتھی ہوتے ہیں، ہم ایسے خاندانی ڈھانچے سے محروم ہوتے جارہے ہیں، میں نے اس سے پوچھا کہ کیا تمہارے والدین یا بہن بھائی تمہیں اچھی بیوی کی تلاش میں مدد نہیں دیتے؟ اس نے یہ سوال بڑے تعجب کے ساتھ سنا، اور کہنے لگا کہ ”میرے والدین تو رخصت ہو چکے، بہن بھائی ہیں، لیکن ان کا میری شادی سے کیا تعلق؟ ہر شخص اپنے مسائل کو خود ہی حل کرتا ہے، میری تو ان سے ملاقات کو بھی کئی سال گزر جاتے ہیں۔“

یہ ایک ڈرائیور کے تاثرات تھے، (واضح رہے کہ یورپ کے سفید فام ڈرائیور بھی اکثر پڑھے لکھے اور بعض اوقات خاصے تعلیم یافتہ ہوتے ہیں، جس ڈرائیور کا میں نے ذکر کیا اس کا نام آرلینڈو تھا، گریجویٹ تھا، اور تاریخ، جغرافیہ اور بہت سے سماجی معاملات پر اس کا مطالعہ خاصا تھا) ہوسکتا ہے کہ اس نے اپنے ذاتی حالات کی وجہ سے کچھ مبالغے سے بھی کام لیا ہو، لیکن مغرب میں خاندانی ڈھانچے کی ٹوٹ پھوٹ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر زیادہ دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں، یہ بات پوری دنیا میں مشہور ومعروف ہے مغرب کے اہل فکر اس پر ماتم کر رہے ہیں، اور جوں جوں اس کا علاج کرنا چاہتے ہیں اتنی ہی تیز رفتاری سے خاندان کا ڈھانچہ مزید تباہی کی طرف جارہا ہے۔

سابق سوویت یونین کے آخری صدر میخائل گورباچوف اب دنیا کے سیاسی منظر سے تقریباً غائب ہو چکے، لیکن ان کی کتاب Perestroika جو انہوں نے اپنے اقتدار کے زمانے میں لکھی تھی، نہ صرف سوویت یونین، بلکہ پورے مغرب کے سماجی اور معاشی نظام پر ایک جرأت مندانہ تبصرے کی حیثیت رکھتی ہے، اور اس کے بعض حصوں میں آج بھی غور وفکر کا بڑا سامان ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے خواتین اور خاندان (Women and Family) کے عنوان سے خاندانی نظام کی شکست وریخت پر بھی بحث کی ہے، انہوں نے شروع میں لکھا ہے کہ تحریک آزادی نسواں کا یہ پہلو تو بے شک قابل تعریف ہے کہ اس کے ذریعے عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق ملے، عورتیں زندگی کے ہر شعبے میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے کے قابل ہوئیں، اور اس کے نتیجے میں ہماری معاشی پیداوار میں اضافہ ہوا، لیکن آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

"But over the years of our diffiult and heroic hsitory, we failed to pay attention to women`s specific rights and needs arising from their role as mother and home-maker, and their in dispensable

educational function as regards children. Engaged in scientific researsh, working on construction sites, in production and in the services, and involved in creative activities, women no longer have enough time to perform their everyday duties at home housework, the upbringing of children and the creation of a good family atmosphere. We have discovered that many of our problems in children`s and young peoples`s behavior, in our morals, culture and in production are partially caused by the weakening of family tyes and slack attitude to family responsibilites. Thsi is a paradoxicl results of our sincere and politically justified desire to make women equal with man in every thing. now` in the course of perestroika, we have begun to overcome this shortcoming. That is why we are now holding heated debates in the press, on public organizations at work and at home, about the question of what we shaould do to make it possoble for women to retrun to their purely womanly mission."

''لیکن اپنی مشکل اور جرأت مندانہ تاریخ کے پچھلے سالوں میں ہم خواتین کے ان حقوق اور ضروریات کی طرف توجہ دینے میں ناکام رہے جو ایک ماں اور گھرستین کی حیثیت میں، نیز بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں ان کے ناگزیر کردار سے پیدا ہوتے ہیں، خواتین چونکہ سائنسی تحقیق میں مشغول ہوگئیں، نیز زیر تعمیر عمارتوں کی دیکھ بھال میں، پیداواری کاموں اور خدمات میں اور دوسری تخلیقی سرگرمیوں میں

مصروف رہیں، اس لیے ان کو اتنا وقت نہیں مل سکا کہ وہ خانہ داری کے روزمرہ کے کام انجام دے سکیں، بچوں کی پرورش کرسکیں، اور ایک اچھی خاندانی فضا پیدا کر سکیں، اب ہمیں اس حقیقت کا انکشار ہوا ہے کہ ہمارے بہت سے مسائل جو بچوں اور نوجوانوں کے رویے، ہماری اخلاقیات، ثقافت اور پیداواری عمل سے تعلق رکھتے ہیں، اس وجہ سے بھی پیدا ہوئے ہیں کہ خاندانی رشتوں کی گرفت کمزور پڑ گئی ہے، اور خاندانی فرائض کے بارے میں ایک غیر ذمہ دارانہ رویہ پروان چڑھا ہے، ہم نے عورتوں کو ہر معاملے میں مردوں کے برابر قرار دینے کی جو مخلصانہ سیاسی اعتبار سے درست خواہش کی تھی، یہ صورت حال اس کا تضاد آفرین نتیجہ ہے، اب اپنی تعمیر نو کے دوران ہم نے اس خامی پر قابو پانے کا عمل شروع کردیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم پریس میں، عوامی تنظیمات میں، کام کر رہے ہیں جن میں اس سوال پر بحث کی جارہی ہے کہ عورت کو اس کے خالص نسوانی مشن کی طرف واپس لانے کے لیے ہمیں کیا اقدامات کرنے چاہئیں؟''(۱)

یہ ایک ایسے سیاسی لیڈر کا تبصرہ ہے جس کے معاشرے میں خاندان سے متعلق یا مرد وعورت کے حقوق وفرائض کے بارے میں کسی قسم کی مذہبی اقدار کا کوئی تصور یا تو موجود نہیں ہے، یا اگر ہے تو اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے، لہٰذا خاندانی نظام کی ٹوٹ پھوٹ پر اس کا اظہارِ افسوس کسی اعلیٰ آسمانی ہدایت کے زیر اثر نہیں، بلکہ اس کے صرف ان نقصانات کی بنا پر ہے جو ٹھیٹھ مادی زندگی میں اسے آنکھوں سے محسوس ہوئے، ایک مسلمان کی حیثیت سے ہم صرف ظاہری اور مادی یا دنیوی نفع و نقصان کے نہیں، بلکہ ان آسمانی ہدایات کے بھی پابند ہیں، جو قرآن وسنت کے واسطے سے ہمارے لیے واجب العمل ہیں، لہٰذا خاندانی نظام کی ابتری صرف ہمارا سماجی اور معاشرتی نقصان ہی نہیں ہے، بلکہ ہمارے عقیدے ہمارے نظریۂ حیات اور ہمارے دین کے لحاظ سے ایک بہت بڑا فساد ہے جو ایک مسلم معاشرے میں کسی بھی طرح قابل برداشت نہیں۔

جب سے ہمارے درمیان مغربی افکار کا ایک سیلاب اُمڈا ہے، اور بالخصوص جب سے ٹی وی، وڈیو اور انگریزی فلموں کی بہتات نے ہمارے معاشرے پر ثقافتی یلغار شروع کی ہے، اس وقت سے ہم شعوری یا غیر شعوری طور پر انہی معاشرتی تصورات کی طرف بڑھ رہے ہیں جن کی داغ بیل مغرب نے ڈالی تھی۔ الحمدللہ! ابھی ہمارا خاندانی نظام درہم برہم نہیں ہوا، لیکن جس رفتار سے مغربی ثقافت

(۱) Perestrocia, P.117 ed. 1987

ہمارے درمیان پھیل رہی ہے، انگریزی فلموں کے سیلاب نے مغربی طرز زندگی کو جس طرح گھر گھر اور گاؤں گاؤں پھیلا دیا ہے، جس طرح بے سوچے سمجھے خواتین کو گھروں سے نکالنے اور انہیں ایک عامل معیشت (Factor of Proudction) بنانے پر زور دیا جا رہا ہے، اور گھر اور خاندان کے بارے میں اسلامی تعلیمات سے جس تیزی کے ساتھ دوری اختیار کی جا رہی ہے، وہ مستقبل میں ہمارے خاندانی نظام کے لیے ایک زبردست خطرہ ہے جس کی روک تھام آج ہی سے ضروری ہے، اور اس روک تھام کا طریقہ اسلام کی ان معتدل تعلیمات کی ٹھیک ٹھیک پیروی کے سوا کچھ نہیں جو نہ مشرقی ہیں نہ مغربی، جن کا ماخذ ومنبع وحی الٰہی ہے، اور وہ ایک ایسی ذات کی وضع کردہ تعلیمات ہیں جو انسان کے حال ومستقبل کی تمام ضروریات سے بھی پوری طرح باخبر ہے، اور انسانی نفس کی ان چوریوں کو بھی خوب جانتی ہے جو زہر ہلاہل پر قند وشکر کی تہیں چڑھانے میں مہارت تامہ رکھتی ہے، لہٰذا ہمارا کام وقت کے ہر چلے ہوئے نعرے کے پیچھے چل پڑنا نہیں ہے، بلکہ اسے قرآن وسنت کی کسوٹی پر رکھ کر یہ فیصلہ کرنا ہے کہ یہ ہمارے مزاج ومذاق کے مطابق ہے یا نہیں؟ جب تک ہم میں یہ جرأت اور بصیرت پیدا نہ ہوگی، ہم باہر کی ثقافتی یلغار کے لیے ایک تر نوالہ بنے رہیں گے، اور ہمارے اجتماعی زندگی کی ایک ایک چول رفتہ رفتہ ہلتی چلی جائیں گی۔

۱۹ ذوالحجہ ۱۴۱۶ھ / ۸ مئی ۱۹۹۶ء

☆☆☆

رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کیجیے☆

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰه عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى خَلَقَ الْخَلْقَ، حَتّٰى إِذَا فَرَغَ مِنْهُمْ قَامَتِ الرَّحِمُ فَقَالَتْ: هٰذَا مَقَامُ الْعَائِذِ بِكَ مِنَ الْقَطِيْعَةِ قَالَ: نَعَمْ اَمَا تَرْضَيْنَ اَنْ اَصِلَ مَنْ وَصَلَكِ وَاَقْطَعَ مَنْ قَطَعَكِ؟ قَالَتْ: بَلٰى قَالَ: بِذٰلِكِ لَكِ)) ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِقْرَأُوْا اِنْ شِئْتُمْ:

﴿فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِن تَوَلَّيْتُمْ أَن تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ أُولَئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَى أَبْصَارَهُمْ﴾(۱)

صلہ رحمی کی تاکید

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا۔ تو اس سے فراغت کے بعد قرابت داری اور رشتہ داری کھڑی ہو گئی۔ دوسری روایت میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عرش کا پایہ پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ اب سوال یہ ہے کہ قرابت داری اور رشتہ داری کس طرح کھڑی ہو گئی؟ یہ وہ بات ہے جس کو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی جان سکتے ہیں۔ ہم اس کی کیفیت نہیں بتلا سکتے اس لیے کہ قرابت داری کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا جسم ہو۔ لیکن بعض اوقات اللہ تعالیٰ ایسی چیزوں کو جو جسم نہیں رکھتی ہیں۔ آخرت اور ملاء اعلیٰ میں جسم عطا فرما دیتے ہیں۔ بہر حال۔ وہ رشتہ داری کھڑی ہو گئی۔ اور عرض کیا کہ یا اللہ! یہ ایسی جگہ ہے

☆ اصلاحی خطبات (۸/۱۷۲ تا ۱۹۵) بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) صحيح البخاري، كتاب تفسير القرآن، باب وتقطعوا أرحامكم، رقم: ٤٤٥٥، صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والأداب، باب صفة الرحم وتحريم قطعيتها، رقم: ٤٦٣٤، مسند أحمد، رقم: ٨٠١٧، محمد: ٢٢-٢٣

جہاں پر میں اپنے حق کو پامال ہونے کی پناہ مانگتی ہوں۔ یعنی دنیا میں لوگ میرے حقوق کو پامال کریں گے۔ اس سے میں پناہ چاہتی ہوں کہ کوئی میرے حق کو پامال کرے۔ جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ میں یہ اعلان کر دوں کہ جو شخص تمہارے حقوق کو ضائع کرے گا، تو میں اس کو سزا دوں گا، اور اس کے حقوق کو ادا نہیں کروں گا۔ جواب میں رشتہ داری نے کہا: یا اللہ! میں اس پر راضی ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں تمہیں یہ مقام اور درجہ دیتا ہوں۔ اور یہ اعلان کرتا ہوں کہ جو شخص رشتہ داری کے حقوق کا خیال رکھے گا اور رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا تو میں بھی اس کے ساتھ اچھا سلوک کروں گا۔ اور جو شخص رشتہ داروں کے حقوق کو پامال کرے گا تو میں بھی اس کے حقوق کا خیال نہیں رکھوں گا۔

یہ واقعہ اور حدیث بیان کرنے کے بعد حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر چاہو تو قرآن کریم کی یہ آیت پڑھ لو، جس میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ أُولَئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَى أَبْصَارَهُمْ﴾(۱)

کیا ایسا ہے کہ تم زمین کے اندر فساد مچاؤ، اور رشتہ داریوں کے حقوق کو ضائع کرو۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے اوپر اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے۔ اور ان کو بہرا اور اندھا بنا دیا ہے۔

قطع رحمی کرنے والے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اتنی سخت وعید ارشاد فرمائی۔

قیامت کے دن صلہ رحمی کے بارے میں سوال ہوگا

یہ حدیث درحقیقت ان تمام آیات قرآنی کی تفسیر ہے جن میں بار بار اللہ تعالیٰ نے رشتہ داروں کے حقوق کا خیال رکھنے کا حکم دیا ہے کہ قرابت داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ چنانچہ خطبہ نکاح کے موقع پر حضور اقدس ﷺ قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کیا کرتے تھے:

﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ﴾(۲)

یعنی اس اللہ سے ڈرو جس کے نام کا واسطہ دے کر تم دوسروں سے اپنے حقوق مانگتے ہو اور شتہ داریوں کے حقوق پامال کرنے سے ڈرو۔ چنانچہ جب کوئی شخص دوسرے سے اپنا حق مانگتا ہے تو اللہ کا واسطہ دے کر مانگتا ہے کہ اللہ کے واسطے میرا یہ حق دے دو اور اس بات سے ڈرو کہ کہیں ایسا نہ ہو

(۱) محمد: ۲۲-۲۳

(۲) النساء: ۱

کہ تمہاری طرف سے کسی رشتہ دار کی حق تلفی ہو جائے۔ اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ آخرت میں تمہیں عذاب دے۔ قرآن کریم اور حضور اقدس ﷺ کی احادیث رشتہ داریوں کے حقوق صحیح طور پر ادا کرنے کے بیان سے اور اس کی تاکید سے بھری ہوئی ہیں۔

”شریعت“ حقوق کی ادائیگی کا نام ہے

بات دراصل یہ ہے کہ ”شریعت“ حقوق کی ادائیگی کا دوسرا نام ہے، شریعت میں اللہ کا حق ادا کرنا ہے۔ یا اللہ کے بندوں کا حق ادا کرنا۔ پھر اللہ کہ بندوں میں بھی مختلف لوگوں کے مختلف حقوق ہیں۔ مثلاً والدین کے حقوق ہیں۔ اولاد کے حقوق، بیوی کے حقوق، شوہر کے حقوق، رشتہ داروں کے حقوق ہیں۔ پڑوسیوں کے حقوق ہیں۔ ہم سفروں کے حقوق ہیں۔ اس طرح پوری شریعت حقوق سے عبارت ہے۔ ان حقوق میں سے کسی ایک کا بھی حق ادائیگی سے رہ جائے تو شریعت پر عمل ناقص ہے، اور اس کا دین ناقص ہے۔ اگر کسی نے اللہ تعالیٰ کا حق تو ادا کر دیا۔ لیکن اللہ کے بندوں کا حق ادا نہ کیا تو دین کامل نہ ہوا۔ اور دین پر عمل ادھورا رہ گیا۔ ان میں سے خاص طور پر اللہ تعالیٰ نے رشتہ داروں کے حقوق بھی رکھے ہیں۔

تمام انسان آپس میں رشتہ دار ہیں

یوں اگر دیکھا جائے تو سارے ابن آدم اور سارے انسان آپس میں رشتہ دار ہیں، جیسا کہ حضور اقدس ﷺ نے حدیث میں بھی اس کا ذکر فرمایا ہے، کیونکہ تمام انسانوں کے باپ ایک ہیں، یعنی حضرت آدم علیہ السلام، جن سے ہم سب پیدا ہوئے۔ بعد میں آگے چل کر شاخیں ہوتی چلی گئیں، خاندان اور قبیلے تقسیم ہوتے چلے گئے۔ کوئی کہیں جا کر آباد ہوا۔ اور کوئی کہیں۔ اور دور کی رشتہ داریاں ہوگئیں۔ جس کی وجہ سے آپس میں ایک دوسرے کو رشتہ دار نہیں سمجھتے۔ ورنہ حقیقت میں تو سارے انسان ایک دوسرے کے قرابت دار اور رشتہ دار ہیں۔ البتہ کسی کی رشتہ داری قریب کی ہے۔ کسی کی رشتہ داری دور کی ہے۔ لیکن رشتہ داری ضرور ہے۔

حقوق کی ادائیگی سکون کا ذریعہ ہے

جو قریب ترین رشتہ دار ہوتے ہیں۔ جن کو عرف عام میں رشتہ دار سمجھا جاتا ہے۔ جیسے بھائی، بہن، چچا، تایا، بیوی، شوہر، خالہ، ماموں، باپ اور ماں ان رشتہ داروں کے کچھ خاص حقوق اللہ تعالیٰ

نے مقرر فرمائے ہیں۔اور ان حقوق کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اگر ان رشتہ داروں کے حقوق صحیح طور پر ادا کیے جائیں تو اس کے نتیجے میں زندگی پر امن اور پرسکون ہو جاتی ہے۔ یہ لڑائی اور جھگڑے یہ نفرتیں اور عداوتیں، یہ مقدمہ بازیاں، یہ سب ان حقوق کو پامال کرنے کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اگر ہر شخص اپنے اپنے رشتہ داروں کے حقوق ادا کرے تو پھر کبھی کوئی جھگڑا اور کوئی لڑائی نہ ہو، کبھی مقدمہ بازی کی نوبت نہ آئے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر یہ حکم دیا کہ اگر تم ان حقوق کو ادا کرو گے تو تمہاری زندگی پرسکون ہوگی۔ ''خاندان'' کسی بھی معاشرے کی بنیاد ہوتی ہے، اگر ''خاندان'' متحد نہیں ہے اور خاندان والوں کے درمیان آپس میں محبتیں نہیں ہیں۔ آپس کے تعلقات درست نہیں ہیں۔ تو یہ چیز پورے معاشرے کو خراب کرتی ہے۔ اور پورے معاشرے کے اندر اس کا فساد پھیلتا ہے، اس کے نتیجے میں پوری قوم خراب ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا خاص طور پر حکم دیا۔

اللہ کے لیے اچھا سلوک کرو

ویسے تو ہر مذہب میں اور ہر اخلاقی نظام میں رشتہ داروں کے حقوق کی رعایت کا سبق دیا گیا ہے، اور ہر مذہب والے یہ کہتے ہیں کہ رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ لیکن حضور ﷺ نے ان حقوق کے بارے میں ایک ایسا اصول بیان فرمایا ہے جو تمام دوسرے مذاہب اور اخلاقی نظاموں سے بالکل ممتاز اور الگ ہے۔ اگر وہ اصول ہمارے دلوں میں بیٹھ جائے تو پھر کبھی بھی رشتہ داروں کے حقوق کی خلاف ورزی نہ ہو، اور ان کے ساتھ کبھی بھی بدسلوکی نہ کریں۔

وہ اصول یہ ہے کہ جب بھی ان کے ساتھ اچھا برتاؤ اچھا سلوک کرو تو یہ کام ان کو خوش کرنے سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے لیے کرو، یعنی رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے وقت یہ نیت ہونی چاہئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور اس عمل سے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا مقصود ہے، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر یہ سلوک کر رہا ہوں، جب انسان اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر اچھا سلوک کرے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا وہ اپنے رشتہ داروں سے کسی ''بدلے'' کی توقع نہیں رکھے گا۔ بلکہ اس کے ذہن میں یہ ہوگا کہ میں تو اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے ان کے ساتھ اچھا سلوک کر رہا ہوں، میرے اچھے سلوک کے نتیجے میں یہ رشتہ دار خوش ہو جائیں۔ اور میرا شکریہ ادا کریں، اور کوئی بدلہ دیں تو وہ ایک نعمت ہے، لیکن اگر وہ خوش نہ ہوں، اور بدلہ نہ دیں تو بھی مجھے ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ہے۔ مجھے اپنا وہ فریضہ انجام دینا ہے جو میرے اللہ نے میرے سپرد کیا ہے۔

شکریہ اور بدلے کا انتظار مت کرو

رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کے بارے میں ہر شخص یہ کہتا ہے کہ یہ حقوق ادا کرنا اچھی بات ہے، یہ حقوق ادا کرنے چاہئیں۔ لیکن سارے جھگڑے اور سارے فساد یہاں سے پیدا ہوتے ہیں کہ جب رشتہ دار کے ساتھ اچھا سلوک کر لیا تو اب آپ اس امید اور انتظار میں بیٹھے ہیں کہ اس کی طرف سے شکریہ ادا کیا جائے گا۔ اس کی طرف سے اس حسن سلوک کا بدلہ ملے گا، اور اس انتظار میں ہیں کہ وہ میرے حسن سلوک کے بارے میں خاندان والوں میں چرچا کرے گا، اور میرے گن گائے گا۔ لیکن آپ کی یہ امید پوری نہ ہوئی۔ اس نے نہ تو شکریہ ادا کیا۔ اور نہ ہی بدلہ دیا۔ تو اب آپ کے دل میں اس کی طرف سے برائی آ گئی کہ ہم نے اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا۔ لیکن اس نے پلٹ کر پوچھا تک نہیں۔ اس کی زبان پر کبھی ''شکریہ'' کا لفظ ہی نہیں آیا۔ اس نے تو کبھی بدلہ ہی نہیں دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ نے اس کے ساتھ جو حسن سلوک کیا تھا اس کے ثواب کو ملیا میٹ کر دیا۔ آپ اپنے دل میں اس کی طرف سے برائی لے کر بیٹھ گئے، اور آئندہ جب کبھی حسن سلوک کرنے کا موقع آئے گا تو آپ یہ سوچیں گے کہ اس کے ساتھ حسن سلوک کرنے سے کیا فائدہ اس کی زبان پر تو کبھی ''شکریہ'' کا لفظ بھی نہیں آتا۔ میں اس کے ساتھ کیا اچھائی کروں۔ چنانچہ آئندہ کے لیے اس کے ساتھ حسن سلوک کرنا چھوڑ دیا۔ اور اب تک جو اس کے ساتھ حسن سلوک کیا تھا۔ اس کا ثواب بھی اکارت گیا۔ اس لیے کہ اب تک بھی اس کے ساتھ جو حسن سلوک کیا تھا۔ وہ اللہ کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ وہ تو ''شکریہ'' اور ''بدلہ'' لینے کے لیے کیا تھا۔ اس لیے حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب کسی کے ساتھ حسن سلوک کرو تو صرف اللہ کو راضی کرنے کے لیے کرو، اس خیال سے مت کرو کہ یہ میرے ساتھ بھی بدلے میں حسن سلوک کرے گا۔ یا میرا شکریہ ادا کرے گا۔

صلہ رحمی کرنے والا کون ہے؟

ایک حدیث جو ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے۔ وہ یہ کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَيْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُكَافِئِ وَلٰكِنَّ الْوَاصِلَ مَنْ اِذَا قُطِعَتْ رَحِمُهٗ وَصَلَهَا))(۱)

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب لیس الواصل بالمکافی، رقم: ۵۵۳۲، سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ماجاء فی صلة الرحم، رقم: ۱۸۳۱، سنن أبی داؤد، کتاب الزکاة، باب فی صلة الرحم، رقم: ۱٤٤٦، مسند أحمد، رقم: ٦٢٣٨

یعنی وہ شخص صلہ رحمی کرنے والا نہیں ہے جو اپنے کسی رشتہ دار کی صلہ رحمی کا بدلہ دے کہ دوسرا رشتہ دار میرے ساتھ جتنی صلہ رحمی کرے گا میں بھی اتنی ہی صلہ رحمی کروں گا، اور اگر وہ صلہ رحمی کرے گا تو میں بھی کروں گا۔ اگر وہ نہیں کرے گا تو میں بھی نہیں کروں گا، ایسا شخص صلہ رحمی کرنے والا نہیں ہے۔ اس کو صلہ رحمی کا اجر و ثواب نہیں ملے گا۔ بلکہ صلہ رحمی کرنے والا حقیقت میں وہ شخص ہے کہ دوسرا تو اس کا حق ضائع کر رہا ہے، اور اس کے ساتھ قطع تعلق کر رہا ہے، لیکن یہ شخص پھر بھی اللہ کی رضا جوئی کی خاطر اس کے ساتھ اچھا معاملہ کر رہا ہے، یہ شخص حقیقت میں صلہ رحمی کرنے والا ہے اور صلہ رحمی کے اجر و ثواب کا مستحق ہے۔

ہمیں رسومات نے جکڑ لیا ہے

آج جب کسی شخص سے پوچھا جائے کہ رشتہ داروں کا بھی کچھ حق ہے؟ ہر ایک ہم سے یہی جواب دے گا کہ رشتہ داروں کے بہت حقوق ہیں۔ لیکن کون شخص ان حقوق کو کس درجے میں کس طرح ادا کر رہا ہے؟ اگر اس کا جائزہ لے کر دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ ہمارے سارے معاشرے کو رسموں نے جکڑ لیا ہے، اور رشتہ داروں سے جو تعلق ہے وہ صرف رسموں کی ادائیگی کی حد تک ہے اس سے آگے کوئی تعلق نہیں۔ مثلاً اگر کسی کے گھر شادی بیاہ ہے تو اس موقع پر اس کو کوئی تحفہ دینے کو دل نہیں چاہ رہا ہے، یا دینے کی طاقت نہیں ہے تو اب یہ سوچ رہے ہیں کہ اگر تقریب میں خالی ہاتھ چلے گئے تو برا معلوم ہوگا۔ چنانچہ اب بادل نخواستہ اس خیال سے تحفہ دیا جا رہا ہے کہ اگر نہ دیا تو ناک کٹ جائے گی۔ اور خاندان والے کیا کہیں گے اور جس کے یہاں شادی ہو رہی ہے وہ یہ کہے گا کہ ہم نے تو اس کی شادی میں یہ تحفہ دیا تھا۔ اور اس نے ہمیں کچھ نہ دیا۔ چنانچہ یہ تحفہ دل کی محبت سے نہیں دیا جا رہا ہے بلکہ رسم پوری کرنے کے لیے نام و نمود کے لیے دیا جا رہا ہے" جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس تحفہ دینے کا ثواب تو ملا نہیں، بلکہ نام و نمود کی نیت کی وجہ سے الٹا گناہ ہو گیا۔

تقریبات میں "نیوتہ" دینا حرام ہے

ایک رسم جو ہمارے معاشرے میں پھیلی ہوئی ہے، کسی علاقے میں کم اور کسی علاقے میں زیادہ ہے، وہ "نیوتہ" کی رسم ہے تقریبات میں لینے دینے کی رسم کو "نیوتہ" کہا جاتا ہے، ہر ایک کو یہ یاد ہوتا ہے کہ فلاں شخص نے ہماری تقریب کے موقع پر کتنے پیسے دیئے تھے، اور میں کتنے دے رہا ہوں۔ بعض علاقوں میں تو تقریبات کے موقع پر باقاعدہ فہرست تیار کی جاتی ہے کہ فلاں شخص نے اتنے پیسے دیئے، فلاں شخص نے اتنے پیسے دیئے۔ پھر اس فہرست کو محفوظ رکھا جاتا ہے، اور پھر جس

شخص نے پیسے دیئے ہیں۔ اس کے گھر جب کوئی شادی بیاہ کی تقریب ہوگی تو اب یہ ضروری ہے کہ جتنے پیسے اس نے دیئے تھے، اتنے پیسے اس کی تقریب میں دینا لازم اور ضروری ہے۔ چاہے قرض لے کر دے، یا اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر دے، یا چوری اور ڈاکہ ڈال کر دے، لیکن دینا ضرور ہے، اگر نہیں دے گا تو یہ اس معاشرے کا بدترین مجرم کہلائے گا۔ اسے ''نیوتہ'' کہا جاتا ہے۔ دیکھئے اس میں یہ پیسے صرف اس لیے دیئے جارہے ہیں کہ میرے گھر میں جب تقریب کا موقع آئے گا تو وہ بھی دے گا، لہٰذا ''بدلہ'' کے خیال سے جو پیسے دیئے جارہے ہیں یہ حرام قطعی ہیں، قرآن کریم نے اس کے لیے ''ربوا'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَکٰوةٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ﴾ (۱)

تم لوگوں کو نیوتہ کے طور پر جو کچھ ہدیہ یا تحفہ دیتے ہو (لیکن اس خیال سے دیا کہ وہ میری تقریب پر یا تو اتنا ہی دے گا، یا اس سے زیادہ دے گا) تاکہ اس سے مال کے اندر اضافہ ہو، تو یاد رکھو اللہ کے نزدیک اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ اور جو زکوٰۃ یا صدقہ تم اللہ کی رضا مندی کی نیت سے دیتے ہو تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے مال مین چند در چند اضافہ فرماتے ہیں۔

تحفہ کس مقصد کے تحت دیا جائے؟

لہٰذا اگر کسی شخص کے دل میں خیال آیا کہ میرے ایک عزیز کے یہاں خوشی کا موقع ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس کو کوئی ہدیہ پیش کروں۔ اور اس کی خوشی کے اندر میں بھی شریک ہو جاؤں، اور ہدیہ دینے سے ''بدلہ'' اور نام و نمود اور دکھاوا پیش نظر نہیں ہے۔ بلکہ اپنی رشتہ داری کا حق ادا کرنا ہے اور اللہ کو راضی کرنا ہے تو اس صورت میں تحفہ دینا اور پیسہ دینا اجر و ثواب کا باعث ہوگا۔ اور یہ تحفے اور پیسے صلہ رحمی میں لکھے جائیں گے۔ بشرطیکہ ہدیہ دینے سے اللہ کو راضی کرنا مقصد ہو۔

مقصد جانچنے کی کسوٹی

اس کی پہچان کیا ہے کہ ہدیہ دینے سے اللہ کو راضی کرنا مقصود ہے یا ''بدلہ'' لینا مقصود ہے؟

(۱) الروم: ۳۹، آیت کا ترجمہ یہ ہے: اور یہ جو تم سود دیتے ہوتا کہ وہ لوگوں کے مال میں شامل ہو کر بڑھ جائے تو وہ اللہ کے نزدیک بڑھتا نہیں ہے، اور جو زکوۃ تم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے ارادے سے دیتے ہو، تو جو لوگ بھی ایسا کرتے ہیں وہ ہیں جو (اپنے مال کو) کئی گنا بڑھا لیتے ہیں۔

اس کی پہچان یہ ہے کہ اگر ہدیہ دینے کے بعد اس بات کا انتظار لگا ہوا ہے کہ سامنے والا شخص اس کا شکریہ ادا کرے، اور کم از کم پلٹ کر اتنا تو کہہ دے آپ کا بہت بہت شکریہ۔ یا اس بات کا انتظار ہے کہ جب میرے گھر کوئی تقریب ہوگی تو یہ تقریب کے موقع کوئی ہدیہ تحفہ پیش کرے گا۔ یا اگر بالفرض تمہارے ہاں کوئی تقریب ہو تو وہ کوئی ہدیہ تحفہ نہ لائے تو اس وقت تمہارے دل پر میل آ جائے، اور اس کی طرف سے تمہیں شکایت ہو کہ ہم نے تو اتنا دیا تھا، اور اس نے تو کچھ بھی نہیں دیا۔ یا ہم نے زیادہ دیا تھا، اور اس نے ہمیں کم دیا۔ یہ سب اس بات کی علامات ہیں کہ اس دینے میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی مقصود نہیں تھی۔ لہٰذا دیا بھی، اور اس کو ضائع بھی کر دیا۔ لیکن اگر ہدیہ دینے کے بعد ذہن کو فارغ کر دیا کہ چاہے یہ میرا شکریہ ادا کرے یا نہ کرے۔ میرے یہاں تقریب کے موقع پر چاہے دے یا نہ دے، لیکن مجھے اللہ تعالیٰ نے دینے کی توفیق دی تو میں نے اللہ کو راضی کرنے کے لیے اپنے رشتہ داروں کی خوشی کے موقع پر اس کی خدمت میں ہدیہ پیش کر دیا۔ نہ تو مجھے شکریہ کا انتظار ہے، اور نہ بدلے کا انتظار ہے، اگر میرے گھر میں تقریب کے موقع پر یہ کچھ نہ دے تو بھی میرے دل پر میل نہیں آئے گا۔ میرے دل میں شکایت پیدا نہیں ہوگی تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ ہدیہ اللہ کی رضامندی کی خاطر دیا گیا ہے، یہ ہدیہ دینے والے اور لینے والے دونوں کے لیے مبارک ہے۔

''ہدیہ'' حلال طیب مال ہے

حتیٰ کہ حدیث شریف میں یہ تک بیان فرمایا گیا ہے کہ اگر آپ کا کسی شخص کی طرف دھیان لگا ہوا ہے کہ فلاں شخص میرے پاس ملاقات کے لیے آئے گا مجھے ہدیہ پیش کرے گا۔ اب آپ کو اس کے آنے کا اشتیاق اور انتظار ہو رہا ہے۔ تو اس صورت میں اس ہدیہ کے اندر برکت نہیں ہوگی۔ اور جو ہدیہ طلب کے بغیر اور انتظار کے بغیر اس طرح آپ کو ملا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بندہ کے دل میں یہ خیال ڈالا کہ وہ تمہیں ہدیہ پیش کرے۔ اس نے وہ ہدیہ لا کر پیش کر دیا۔ وہ ہدیہ بڑی برکت والا ہے۔ گویا کہ اشتیاق اور انتظار سے اس ہدیہ کی برکت میں کمی آ جاتی ہے۔ اس لیے کہ ہدیہ آنے سے پہلے ہی اس میں اپنی نفسانی غرض بھی شامل ہوگئی۔ اس لیے اس میں اتنی برکت نہیں ہوگی۔

ایک بزرگ کا واقعہ

ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے جو بڑے اللہ والے درویش بزرگ تھے، اور اللہ والوں پر بڑے بڑے کٹھن حالات پیش آتے ہیں۔ ایک مرتبہ ان پر فاقوں کی نوبت آ گئی۔ کئی دن سے فاقہ تھا، اور

مریدین اور معتقدین کی مجلس میں وعظ فرما رہے تھے، آواز میں بہت کمزوری تھی۔ آہستہ اور پست آواز سے بیان فرما رہے تھے۔ مجلس میں ایک مرید نے جب یہ حالت دیکھی تو سمجھ گئے کہ بھوک کی شدت کی وجہ سے یہ کمزوری ہے۔ شاید ان پر فاقے گزر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ اس خیال سے مجلس سے اٹھ کر چلے گئے کہ میں شیخ کے لیے کھانے کا انتظام کروں۔ تھوڑی دیر کے بعد کھانا لے کر اور ایک تھال میں لگا کر شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کھانا دیکھ کر شیخ نے تھوڑی دیر تامل کر کے فرمایا کہ نہیں۔ یہ کھانا لے جاؤ۔ میں اس کو قبول نہیں کرتا۔ چنانچہ وہ مرید کھانا لے کر واپس چلے گئے۔ آجکل کے مریدوں کی طرح کوئی ہوتا تو وہ اصرار کرتا کہ نہیں جی۔ آپ یہ کھانا ضرور کھائیں۔ مگر وہ مرید جانتا تھا کہ شیخ کامل ہیں۔ اور شیخ کامل کا حکم بے چوں و چرا ماننا چاہئے۔ اور وہ کھانے سے انکار تکلفاً نہیں کر رہے ہیں بلکہ کوئی وجہ ہی ہوگی جس کی وجہ سے کھانے سے انکار کر رہے ہیں۔ اس وجہ سے وہ کھانا لے کر واپس چلا گیا۔ پھر کچھ وقت گزرنے کے بعد مرید دوبارہ کھانا لے کر آیا۔ اور ان کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا کہ حضرت اب قبول فرما لیجیے۔ شیخ نے فرمایا کہ ہاں! اب میں قبول کرتا ہوں۔

بعد میں مرید نے بتایا کہ جب میں پہلی مرتبہ کھانا لے کر آیا، اور حضرت نے کھانے سے انکار کر دیا تو میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ حضرت والا کھانے سے جو انکار کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب میں کھانا لینے کے لیے مجلس سے اٹھ کر گیا تو حضرت والا کے دل میں یہ خیال آیا کہ شاید یہ میری کمزوری دیکھ کر سمجھ گیا اور شاید یہ میرے کھانے کا بندوبست کرنے گیا ہو، جس کی وجہ سے کھانے کا انتظار لگ گیا، لہٰذا جب میں کھانا لے کر آیا تو وہ کھانا انتظار اور اشتیاق کے عالم میں لایا، اور یہ حدیث سامنے تھی کہ جو ہدیہ انتظار اور اشتیاق کے عالم میں ملے اس ہدیہ میں برکت نہیں ہوتی، اس لیے انہوں نے وہ کھانا قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ وہ کھانا لے کر میں واپس چلا گیا۔ تاکہ ان کا انتظار اور اشتیاق ختم ہو جائے، پھر تھوڑی دیر کے بعد میں وہی کھانا لے کر دوبارہ حاضر ہو گیا تو اب ہدیہ قبول کرنے میں جو رکاوٹ تھی۔ وہ ختم ہو گئی تھی۔ اس لیے شیخ نے اس کو قبول فرما لیا۔ بہرحال اگر ہدیہ میں انتظار لگ جائے، یا اس کے دینے میں نام و نمود اور شہرت کی نیت کر لی جائے۔ یا اس کے بدلے میں طمع اور لالچ پیدا ہو جائے۔ تو یہ چیزیں ہدیہ کی برکت اور نور کو زائل کر دیتی ہیں۔

ہدیہ دو، محبت بڑھاؤ

حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((تَهَادُوْا تَحَابُّوْا)) (۱)

''ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو تو تمہارے درمیان آپس میں محبت پیدا ہوگی''

لیکن یہ محبت اس وقت پیدا ہوگی جب اللہ کو راضی کرنے کے لیے ہدیہ دیا جا رہا ہو۔ قرابت داری کا حق ادا کرنے کے لیے، اپنی آخرت سنوارنے کے لیے اور اللہ کے سامنے سرخرو ہونے کے لیے وہ ہدیہ دیا جا رہا ہو۔ لیکن آج ہم لوگ ان مقاصد کے لیے ہدیہ نہیں دیتے۔ چنانچہ شادیوں کے موقع پر دیکھ لیں کہ کس نیت سے تحفہ دیا جا رہا ہے۔ صرف رسم پوری کرنے کے لیے تحفہ دے دیں گے۔ لیکن رسم کے علاوہ کبھی کوئی تحفہ کسی رشتہ دار کو دینے کی توفیق نہیں ہوتی۔ چنانچہ بعض اوقات مردوں کے دل میں خیال بھی آتا ہے کہ فلاں عزیز کو فلاں تحفہ دے دیں تو اکثر خواتین اپنے شوہر کو یہ کہہ کر روک دیتی ہیں کہ اس وقت تحفہ پیش کریں گے تو ذرا نام بھی ہو جائے گا۔ اور اس وقت اپنا بوجھ بھی اترے گا۔ اس وقت دینے کا کیا فائدہ حالانکہ سارہ فائدہ تو اس وقت دینے میں ہے، اس لیے کہ جس وقت دل میں کسی تصنع اور تکلف اور بناوٹ کے بغیر محض اللہ کی خاطر اپنے کسی عزیز یا دوست کو خوش کرنے کے لیے تحفہ دینے کا داعیہ پیدا ہوا، بس تحفہ دینے کا وہی صحیح موقع ہے۔ اسی وقت تحفہ اور ہدیہ دے دو۔

نیکی کے تقاضے پر جلد عمل کر لیجئے

بزرگوں نے فرمایا کہ جب دل میں کسی نیک کام کرنے کا شوق اور جذبہ پیدا ہوا کہ فلاں نیک کام کر لوں تو اس نیک کام کو جتنا جلد ہو سکے کر ڈالو۔ اس کام کو ٹلاؤ نہیں، آئندہ کے لیے اس کو مؤخر اور ملتوی نہ کرو۔ اس لیے کہ نیک کام کرنے کا یہ شوق جس اخلاص اور جذبے کے ساتھ پیدا ہوا ہے، خدا جانے وہ شوق کل کو باقی رہے نہ رہے، کل کو حالات سازگار رہیں یا نہ رہیں، کل کو موقع ملے یا نہ ملے، اس لیے فوراً اس شوق پر عمل کر لو۔

نیکی کا تقاضا اللہ کا مہمان ہے

ہمارے حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ''نیکی کا داعیہ'' اللہ تعالیٰ کا مہمان ہے اور صوفیاء کرام اس کو ''وارد'' کہتے ہیں۔ یہ ''وارد'' اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والا مہمان ہے۔ اگر تم نے اس مہمان کی عزت اور اکرام کیا تو یہ مہمان دوبارہ آئے گا۔ اور بار بار آئے گا،

(۱) مؤطا مالك، كتاب الجامع، باب ماجاء في المهاجرة، رقم: ۱۴۱۳

اور اگر تم نے اس مہمان کو دھت کر دیا، اور اس کا اکرام نہ کیا، مثلاً دل میں نیک کام کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ لیکن اس خیال کو یہ سوچ کر جھٹک دیا کہ میاں چھوڑو، بعد میں دیکھا جائے گا۔ تو تم نے اللہ کے مہمان کی ناقدری کی۔ اور بے عزتی کی، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ مہمان ناراض ہو جائے گا۔ اور آنا چھوڑ دے گا۔ اور اگر تم نے اس خیال پر عمل کرتے ہوئے وہ نیک کام کر لیا تو اللہ تعالیٰ پھر دوبارہ اس مہمان کو تمہارے پاس بھیجیں گے۔ اور وہ داعیہ کسی اور موقع پر کوئی اور نیک کام تم سے کرا لے گا۔ اس لیے جس وقت کسی عزیز یا دوست کو تحفہ اور ہدیہ دینے کا داعیہ دل میں پیدا ہوا۔ بس اسی وقت اس داعیہ پر عمل کر ڈالو۔

ہدیہ کی قیمت مت دیکھیں، جذبہ دیکھیں

پھر حضور اقدس ﷺ نے ایک تعلیم یہ دی کہ یہ مت دیکھو کہ ہدیہ اور تحفے کے طور پر کیا چیز دی جا رہی ہے، بلکہ یہ دیکھو کہ کس جذبے کے ساتھ وہ تحفہ اور ہدیہ دیا جا رہا ہے، اگر چھوٹی سی چیز بھی محبت سے پیش کی جائے۔ یقیناً وہ اس بڑی چیز سے ہزار درجہ بہتر ہے جو صرف دکھاوے اور نام و نمود کے لیے دی جائے۔ اس لیے ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((لَاتَحْقِرَنَّ جَارَةٌ لِجَارَتِهَا وَلَوْ فِرْسِنَ شَاةٍ))(۱)

یعنی اگر کوئی پڑوسن کوئی ہدیہ بھیجے تو اس کو کبھی حقیر مت سمجھو، چاہے وہ ہدیہ ایک بکری کا پایہ ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے کہ اس چیز کو مت دیکھو جو پیش کی جا رہی ہے۔ بلکہ اس جذبے کو دیکھو جس جذبے کے ساتھ وہ پیش کی جا رہی ہے، اگر محبت کے جذبے سے پیش کی گئی ہے، اس کی قدر کرو۔ وہ ہدیہ تمہارے لیے مبارک ہے۔ لیکن اگر بہت قیمتی چیز تمہیں ہدیہ میں دی گئی۔ مگر دکھاوے کی خاطر دی گئی۔ تو اس میں برکت نہیں ہوگی۔ اس لیے اللہ کا کوئی بندہ تمہیں کوئی چھوٹی سی چیز ہدیے میں دے تو اس کو مبارک سمجھ کر قبول کر لو۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ عموماً چھوٹی چیز ہدیہ میں دینے میں دکھاوا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ وہ چیز ہی معمولی سی ہے، اس میں کیا دکھاوا کریں۔ اور قیمتی چیز ہدیہ میں دینے میں دکھاوا آ جاتا ہے۔ اس لیے ہدیہ میں اگر کوئی شخص چھوٹی چیز دے تو اس کی زیادہ قدر کرنی چاہئے۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب لاتحقرن جارة لجارتها، رقم: ۵۵۵۸، صحیح مسلم، کتاب الزکاة، باب الحث علی الصدقة ولوبالقلیل، رقم: ۱۷۱۱، سنن الترمذی،، کتاب الولاء والهبة عن رسول الله، باب فی حث النبی علی التهادی، رقم: ۲۰۵۶، مسند أحمد، رقم: ۷۲۷٤

حلال دعوت کی برکات

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ واقعہ سنایا کرتے تھے کہ دیو بند میں ایک بزرگ گھانس کاٹا کرتے تھے۔ اور گھانس بیچ کر اپنا گزارہ کرتے تھے، یومیہ ان کی آمدنی چھ پیسے ہوتی تھی، ان کی تقسیم اس طرح کر رکھی تھی کہ دو پیسے تو اپنے استعمال میں لاتے، اور دو پیسے صدقہ خیرات کرتے، اور دو پیسے جو بچتے، ان کو دارالعلوم دیو بند کے بڑے بڑے اکابر اور علماء کی دعوت کے لیے جمع کرتے۔ جب کچھ پیسے جمع ہو جاتے تو علماء اور اکابر دیو بند کی دعوت کرتے۔ جن میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ۔ یہ حضرات فرماتے تھے کہ ہمیں سارے مہینے ان بزرگ کی دعوت کا انتظار رہتا ہے۔ جبکہ بڑے بڑے دولت منداور روساء بھی دعوت کرتے تھے، ان کا انتظار نہیں رہتا تھا اس لیے یہ ایک اللہ کے بندے کی حلال طیب کمائی سے اور خالص محبت فی اللہ کی خاطر یہ دعوت کی جاتی تھی۔ اور اس میں جو نورانیت محسوس ہوتی وہ کسی اور دعوت میں نہیں محسوس ہوتی تھی۔ فرماتے تھے جب اس اللہ کے نیک بندے کی دعوت کھا لیتے ہیں تو کئی دن تک دل میں نور محسوس ہوتا ہے۔ اور عبادت کرنے اور ذکر واذکار میں مشغول رہنے کی خواہش رہتی ہے۔ بہر حال، چھوٹی اور معمولی چیز ہدیہ میں دینے میں اخلاص کی زیادہ توقع ہے بڑی چیز کے مقابلے میں، اس لیے معمولی ہدیہ کی زیادہ قدر کرنی چاہئے۔

ہدیہ میں رسمی چیز مت دو

پھر ہدیہ دینے میں اس بات کا خیال رہنا چاہئے کہ ہدیہ اور تحفہ کا مقصد راحت پہنچانا اور اس کو خوش کرنا ہے۔ لہٰذا جو ہدیہ رسم پوری کرنے کے لیے دیا جاتا ہے، اس میں راحت کا یا خوشی کا خیال نہیں رکھا جاتا، بلکہ اس میں رسم پوری کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس لیے ایسے ہدیہ میں صرف وہ رسمی چیز ہی دی جاتی ہے، مثلاً یا تو مٹھائی کا ڈبہ دے دیا، یا کپڑے کا جوڑا دے دیا وغیرہ، اگر اس مخصوص چیز کے علاوہ کوئی دوسری چیز لے جائیں گے تو یہ رسم کے خلاف ہوگی، اور اس کو بطور ہدیہ دیتے ہوئے شرم آئے گی کہ یہ بھی کوئی ہدیہ ہے۔ لیکن جو شخص اللہ کے لیے اخلاص کے ساتھ کوئی ہدیہ دے گا وہ تو یہ دیکھے گا کہ اس شخص کی ضرورت کی چیز کیا ہے؟ میں وہ چیز اس کو ہدیہ میں دوں، تا کہ اس کے ذریعہ اس کو فائدہ اور راحت پہنچے۔

ایک بزرگ کے عجیب ہدایا

ایک بزرگ گزرے ہیں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ، یہ تبلیغی جماعت کے معروف حضرات میں سے تھے۔ حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ سے بڑی محبت فرماتے، اور بکثرت ان کے پاس آیا کرتے تھے۔ ہمیں یاد ہے کہ جب یہ بزرگ حضرت والد صاحب سے ملنے کے لیے دارالعلوم تشریف لاتے تو وہ ایسے عجیب وغریب چیزیں ہدیہ میں لاتے کہ ہم نے ایسے ہدیے کہیں اور نہیں دیکھے، مثلاً کبھی کاغذ کا ایک دستہ لے آئے۔ اور حضرت والد صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اب دیکھئے کہ کاغذ کا دستہ آج تک کسی نے ہدیہ میں پیش نہیں کیا۔ مگر وہ اللہ کے بندے جانتے تھے کہ حضرت مفتی صاحب کا ہر وقت لکھنے کا کام ہوتا ہے۔ یہ کاغذ ان کے کام آئے گا۔ اور لکھنے کا جو نیک کام کریں گے۔ اس میں میرا بھی حصہ لگ جائے گا، اور مجھے بھی ثواب مل جائے گا۔ کبھی روشنائی کی دوات لاکر حضرت والد صاحب کی خدمت میں پیش کر دیتے۔ اب بتایئے جو شخص دکھاوا کرے گا، وہ کبھی روشنائی کی دوات پیش کرے گا؟ لیکن جس شخص کے پیش نظر ہدیہ کے ذریعہ اللہ کو راضی کرنا ہے۔ اور جس شخص کے پیش نظر سامنے والے کو راحت اور آرام پہنچانا ہے۔ اسی شخص کے دل میں یہ خیال آسکتا ہے کہ ایسا ہدیہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے، اب اگر مٹھائی کا ڈبہ ہدیہ میں پیش کر دیتے تو حضرت والد صاحب مٹھائی تو کھاتے نہیں تھے۔ وہ دوسروں کے کھانے میں آتی۔

ہدیہ دینے کے لیے عقل چاہئے

بہرحال ہدیہ اور تحفہ دینے کے لیے بھی عقل چاہئے، اور یہ عقل بھی اللہ کی توفیق سے اور اللہ کی رضا جوئی اور اخلاص سے ملتی ہے، لیکن جہاں ہدیہ دینے کا مقصد ریا اور نام ونمود ہو۔ وہاں یہ عقل کام نہیں آتی۔ وہاں تو انسان رسموں کے پیچھے پڑا رہتا ہے، وہ تو یہ سوچے گا اگر میں ہدیہ میں روشنائی کی دوات لے کر جاؤں گا تو بڑی شرم معلوم ہوگی، اگر مٹھائی کا ڈبہ لے جاتا تو ذرا دیکھنے میں بھی اچھا لگتا۔ آج ہمارے پورے معاشرے کو رسموں نے جکڑ لیا ہے۔ اور اس طرح جکڑ لیا ہے کہ عزیز اور رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کا جو معاملہ کرتے ہیں۔ اس کو بھی ان رسموں نے تباہ کر دیا ہے۔ چنانچہ ہدیہ اور تحفہ دینا بڑی اچھی چیز ہے، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے۔ لیکن ہم نے اس کو رسموں کی جکڑ بندی میں لاکر اس کا ثواب غارت کیا، اس کا نور بھی غارت کیا، اور اس کی برکت بھی غارت کی، اور الٹا اپنے ذمے گناہ لے لیا۔ خوب یاد رکھئے یہ ''نیوتہ'' وغیرہ حرام قطعی ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص خوش دلی

سے بدلے اور شکریے کی توقع کے بغیر اگر دے گا تو ان شاء اللہ اس پر اجر وثواب ملے گا۔

ہر کام اللہ کے لیے کریں

یہ تو ہدیہ اور تحفے کی بات تھی۔ اس کے علاوہ بھی عزیز و رشتہ داروں کے حقوق ہیں، مثلاً کسی کے دکھ درد میں شریک ہو گئے۔ کسی کی ضرورت کے موقع پر اس کے کام آ گئے وغیرہ، اس میں بھی حضور اقدس ﷺ نے ہمیں یہ تعلیم دی کہ جب کسی عزیز رشتہ دار کا کوئی کام کرو تو صرف اللہ کے لیے کرو۔ اور اس خیال سے مت کرو کہ یہ میرے گن گائے گا، یا میرا شکریہ ادا کرے گا۔ یا مجھے بدلہ دے گا اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا کام بھی کرو گے اور پھر بھی دنیا میں خوشی حاصل نہیں ہوگی۔

کیا رشتہ دار بچھو کے مانند ہیں؟

ہمارے معاشرے کی غلط فکر کی وجہ سے عربی زبان میں ایک مثل مشہور ہے:

"اَلْاَقَارِبُ کَالْعَقَارِبِ"

''اقارب'' کے معنی ہیں رشتہ دار، اور عقارب عقرب کی جمع ہے، اس کے معنی ہیں بچھو۔ معنی یہ ہوئے کہ رشتہ دار بچھو جیسے ہیں ہر وقت ڈنگ مارنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ کبھی راضی نہیں ہوتے، یہ مثل اس لیے مشہور ہوئی کہ رشتہ داروں کے ساتھ جب بھی حسن سلوک کیا تو اس امید کے ساتھ کیا کہ ان کی طرف سے جواب ملے گا۔ اگر یہ حسن سلوک اس نیت سے کیا جاتا کہ میرے اللہ نے حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔ اور یہ حضور اقدس ﷺ کی سنت ہے۔ اس وقت انسان یہ سوچتا ہے کہ یہ رشتہ دار جواب دے یا نہ دے، لیکن اللہ تو جواب دینے والا موجود ہے، اس لیے کہ میں نے یہ کام اللہ کے لیے کیا ہے۔ مزہ تو اسی وقت ہے کہ تم رشتہ داروں کے ساتھ احسان اور حسن سلوک کرتے رہو، اور ان کی طرف سے جواب نہ ملے، بلکہ الٹا جواب ملے، مگر پھر بھی ان کے ساتھ حسن سلوک اس نیت سے کیے جاؤ کہ جس کے لیے کر رہے ہیں۔ وہ جواب دینے والا موجود ہے، اس لیے حضور اقدس ﷺ نے فرما دیا کہ صلہ رحمی کرنے والا وہ شخص نہیں ہے جو بدلے کا انتظار کرے، بلکہ صلہ رحمی کرنے والا وہ شخص ہے کہ دوسرے تو قطع رحمی کریں، لیکن یہ اس کے باوجود صلہ رحمی کرے۔

حضور ﷺ کا رشتہ داروں سے سلوک

حضور اقدس نبی کریم ﷺ کو دیکھئے کہ آپ نے رشتہ داروں کے ساتھ کیسا سلوک کیا۔ چند

رشتہ داروں کے علاوہ باقی سب رشتہ دار آپ کی جان کے دشمن اور خون کے پیاسے تھے، اور آپ کو تکلیفیں پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، یہاں تک کہ آپ کے چچا اور چچا کے بیٹے جو قریب ترین عزیز تھے، مگر آپ کو تکلیف پہنچانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ لیکن حضور اقدس ﷺ نے اپنی طرف سے رشتہ داری کا حق ادا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر جب بدلہ لینے کا وقت آیا تو آپ نے سب کو معاف کر دیا، اور یہ اعلان فرما دیا کہ جو شخص حرم میں داخل ہو جائے گا وہ بھی مامون ہے جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا وہ بھی مامون ہے، اور کسی سے بدلہ نہیں لیا، اور نہ کسی سے یہ توقع رکھی کہ وہ میرے حسن سلوک کا بدلہ دے گا۔ لہٰذا رشتہ داروں کی بدسلوکی پر حسن سلوک کرنا بھی سنت ہے اور اچھائی کے ساتھ بدلہ دینا بھی سنت ہے۔

مخلوق سے توقعات ختم کر دیں

اسی لیے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مواعظ میں بڑے تجربے کی بات فرمائی ہے، فرمایا:

> ''دنیا میں راحت سے رہنے کا صرف ایک ہی نسخہ ہے۔ وہ یہ کہ مخلوق سے توقعات ختم کر دو''

مثلاً یہ توقع رکھنا کہ فلاں شخص میرے ساتھ اچھائی کرے گا۔ فلاں شخص میرے کام آئے گا۔ فلاں شخص میرے دکھ درد میں شریک ہوں گا، یہ تمام توقعات ختم کر کے صرف ایک ذات یعنی اللہ جل شانہٗ سے توقع رکھو، اس لیے کہ مخلوقات سے توقع ختم کرنے کے بعد اگر ان کی طرف سے کوئی اچھائی ملے گی تو وہ خلاف توقع ملے گی، اس کے نتیجے میں خوشی بہت ہو گی، کیونکہ خلاف توقع ملی ہے اور اگر مخلوق کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچے گی تو پھر رنج زیادہ نہیں ہو گا۔ اس لیے کہ اچھائی کی توقع تو تھی نہیں، تکلیف ہی کی توقع تھی، وہ تکلیف توقع کے مطابق ہی ملی، اس لیے صدمہ اور رنج زیادہ نہیں ہو گا۔ اس لیے کہ اچھائی کی توقع کے بعد تکلیف پہنچے تو صدمہ اور رنج بہت زیادہ ہوتا ہے کہ توقع تو یہ تھی اور یہ ملا، لہٰذا توقع کے بغیر جو اچھائی مل رہی ہے وہ سب بونس ہے۔

دنیا دکھ ہی پہنچاتی ہے

دنیا کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کو دکھ ہی پہنچاتی ہے، اگر کبھی خوشی اور منفعت حاصل ہو جائے تو سمجھ لو کہ یہ اللہ کا خاص انعام ہے، اور اگر دکھ آئے تو سمجھ لو کہ یہ تو آنا ہی تھا، اس لیے اس پر زیادہ

صدمہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بات بالکل سو فیصد درست ہے۔ اگر ہم اس بات کو پلے باندھ لیں اور اس پر عمل کرلیں تو پھر سارے شکوے اور شکایتیں ختم ہو جائیں۔ اس لیے کہ یہ شکوے اور شکایتیں توقعات کے بعد ہی پیدا ہوتے ہیں۔ جو توقع رکھنی ہے اللہ تعالیٰ سے رکھو، مخلوقات سے توقع رکھنا چھوڑ دو گے تو ان شاء اللہ راحت اور آرام میں آجاؤ گے۔

اللہ والوں کا حال

ہمارے بڑے یہ نسخہ بتا گئے، اور میں نے آپ کے سامنے یہ نسخہ بتا دیا۔ اور آپ نے سن لیا۔ لیکن محض کہنے اور سننے سے بات نہیں بنتی ہے، بلکہ اس بات کو دل میں بٹھائیں، اور اس کی مشق کریں، بار بار اپنا جائزہ لیں کہ ہم نے دوسروں سے کون کون سی توقعات باندھ رکھی ہیں؟ اور کیوں باندھ رکھی ہیں؟ اللہ سے توقعات کیوں نہیں باندھیں؟ آپ نے اللہ والوں کو دیکھا ہوگا کہ وہ ہمیشہ خوش رہتے ہیں۔ ان کے اوپر بڑے سے بڑا غم بھی آجائے گا تو تھوڑا بہت رنج ہوگا، لیکن وہ غم ان کے اوپر مسلط نہیں ہوگا، اور وہ غم ان کو بے چین اور بے تاب نہیں کرے گا، کیونکہ انہوں نے اپنے مالک سے اپنا تعلق جوڑا ہوا ہے، مخلوق کی طرف نگاہ نہیں ہے۔ مخلوق سے توقعات نہیں، مخلوق سے کچھ نہیں مانگتے، جو کچھ مانگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سکون اور اطمینان سے رہتے ہیں۔

ایک بزرگ کا واقعہ

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بزرگ کے بارے میں لکھا ہے کہ ان سے کسی نے پوچھا کہ حضرت کیا حال ہے؟ کیسے مزاج ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ الحمد للہ بہت اچھا حال ہے، پھر فرمایا کہ میاں اس شخص کا کیا حال پوچھتے ہو کہ اس کائنات میں کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف نہیں ہوتا۔ یعنی میں وہ شخص ہوں کہ کائنات میں کوئی کام میری مرضی کے خلاف نہیں ہوتا بلکہ ہر کام میری مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ اور اس کائنات کے سب کام جس کی مرضی کے مطابق ہو رہے ہوں اس سے زیادہ خوش اور اس سے زیادہ عیش میں کون ہو سکتا ہے؟ سوال کرنے والے کو بڑا تعجب ہوا، اس نے کہا کہ یہ بات تو انبیاء علیہم السلام کو بھی حاصل نہیں ہوئی تھی کہ اس کائنات کا ہر کام ان کی مرضی کے مطابق ہوتا ہو، بلکہ ان کی مرضی کے خلاف بھی کام ہوتے تھے، آپ کا ہر کام آپ کی مرضی کے مطابق کیسے ہو جاتا ہے؟

ان بزرگ نے جواب دیا کہ میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی کے تابع بنا دیا ہے، بس جو میرے اللہ کی مرضی وہ میری مرضی، جو میرے اللہ کی مشیت وہی میری مشیت، اور اس کائنات میں ہر کام اللہ کی مرضی اور اس کی مشیت کے مطابق ہو رہا ہے، اور میں نے اپنی انا کو مٹا دیا ہے اس لیے ہر کام میری مرضی کے مطابق ہو رہا ہے، کیونکہ وہ اللہ کی مرضی سے ہو رہا ہے۔ اس لیے میں بڑا خوش ہوں، اور عیش وعشرت میں ہوں۔

بزرگوں کا سکون اور اطمینان

بہر حال اللہ والوں کو جو سکون اور آرام اور راحت میسر ہے، جس کے بارے میں حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر دنیا کے بادشاہوں کو ہماری عافیت اور سکون اور راحت کا پتہ چل جائے تو وہ بادشاہ تلواریں لے کر ہمارا مقابلہ کرنے کے لیے آجائیں کہ یہ راحت اور سکون ہمیں دے دو۔ یہ سکون مخلوق سے نگاہیں ہٹانے سے اور مخلوق سے توقعات ختم کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ جب مخلوق سے توقعات ختم ہو جاتی ہیں تو پھر دیکھو کیسا سکون حاصل ہوتا ہے۔ لیکن یہ چیزیں صرف کہنے سننے سے حاصل نہیں ہوتیں، صحبت کے نتیجے میں یہ چیزیں رفتہ رفتہ منتقل ہو جاتی ہیں۔ اور انسان کی دنیا اور آخرت سنور جاتی ہیں۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ عزیز واقارب کے حقوق کی ادائیگی اور ان کے ساتھ حسن سلوک اللہ کو راضی کرنے کے لیے ہو اور محض دکھاوے کے لیے اور رسوم پوری کرنے کے لیے نہ ہو، اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے فضل وکرم سے مجھے اور آپ سب کو اس حقیقت کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور اس پر عمل کرنے کی بھی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

☆☆☆

تعلقات کو نبھانا سیکھیں ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: جَاءَ تْ عَجُوْزٌ اِلَى النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: ((کَیْفَ اَنْتُمْ کَیْفَ حَالُکُمْ، کَیْفَ کُنْتُمْ بَعْدَنَا؟)) قَالَتْ: بِخَیْرٍ بِاَبِیْ اَنْتَ وَاُمِّیْ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! فَلَمَّا خَرَجَتْ قُلْتُ: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! تُقْبِلُ هٰذِهِ الْعَجُوْزَ هٰذَا الْاِقْبَالَ؟ فَقَالَ: ((یَا عَائِشَةُ! اِنَّهَا کَانَتْ تَاْتِیْنَا زَمَانَ خَدِیْجَةَ وَاِنَّ حُسْنَ الْعَهْدِ مِنَ الْاِیْمَانِ)) (۱)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک عمر رسیدہ خاتون آئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا بڑا اکرام اور استقبال کیا، ان کو عزت کے ساتھ بٹھایا، ان کی بڑی خاطر تواضع کی اور ان کی خیریت دریافت کی۔ جب وہ خاتون چلی گئیں تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نے ان خاتون کے لیے بہت اکرام اور اہتمام فرمایا۔ یہ کون خاتون تھیں؟ جواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّهَا کَانَتْ تَاْتِیْنَا زَمَانَ خَدِیْجَةَ))

یہ خاتون اس وقت ہمارے گھر آیا کرتی تھیں جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا حیات تھیں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ان کا تعلق تھا، گویا کہ یہ ان کی سہیلی تھیں، اس لیے میں نے ان کا اکرام کیا۔ پھر فرمایا:

((وَاِنَّ حُسْنَ الْعَهْدِ مِنَ الْاِیْمَانِ))

یعنی کسی کے ساتھ اچھی طرح نباہ کرنا بھی ایمان کا ایک حصہ ہے۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۰/۹۸ تا ۱۰۶) بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرّم، کراچی

(۱) کنز العمال، رقم:۳۷۷۶۸ (۱۳/۶۶۷)، شعب الإیمان للبیهقی، رقم:۹۱۲۲ (۶/۵۱۷)

تعلقات نبھانے کی کوشش کرے

یعنی مومن کا کام یہ ہے کہ جب اس کا کسی کے ساتھ تعلق قائم ہو تو اب حتی الامکان اپنی طرف سے اس تعلق کو نہ توڑے، بلکہ اس کو نبھاتا رہے، چاہے طبیعت پر نبھانے کی وجہ سے گرانی بھی ہو، لیکن پھر بھی اس کو نبھاتا رہے، اور اس تعلق کو بدمزگی پر ختم نہ کرے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کرے کہ اگر کسی کے ساتھ تمہاری مناسبت نہیں ہے تو اس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا زیادہ نہ کرے، لیکن ایسا تعلق ختم کرنا کہ اب بول چال بھی بند، اور علیک سلیک بھی ختم، ملنا جلنا بھی ختم، ایک مومن کے لیے یہ بات مناسب نہیں۔

اپنے گزرے ہوئے عزیزوں کے متعلقین سے نباہ

اس حدیث میں ہمارے لیے دو سبق ہیں۔ پہلا سبق یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ اپنے تعلق والوں سے نباہ کرنا چاہئے بلکہ اپنے وہ عزیز جو پہلے گزر چکے ہیں، مثلاً ماں باپ ہیں یا بیوی ہے، تو ان کے اہل تعلق سے بھی نباہ کرنا چاہئے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صاحب حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آکر عرض کیا کہ حضور میرے والد صاحب کا انتقال ہو چکا ہے اور میری طبیعت پر اس بات کا اثر ہے کہ میں زندگی میں ان کی خدمت نہیں کر سکا اور ان کی قدر نہ کر سکا اور جیسے حقوق ادا کرنا چاہئے تھے اس طرح حقوق ادا نہ کر سکا۔ (جو لوگ زندگی میں والدین کی خدمت نہیں کرتے ان کے دلوں میں اس قسم کی حسرت پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح ان صاحب کے دل میں بھی اس کی حسرت تھی، اس لیے عرض کیا کہ میرے دل میں اس کی شدید حسرت ہے اور اثر ہے) اب میں کیا کروں۔ جواب میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اب تم یہ کرو کہ تمہارے والد کے جو دوست احباب ہیں اور جو ان کے تعلق والے اور ان کے قرابت دار ہیں، تم ان کے ساتھ حسن سلوک کرو۔(۱)

اس کے نتیجے میں تمہارے والد کی روح خوش ہوگی، اور تم نے اپنے والد کے اکرام اور حسن سلوک میں جو کوتاہی کی ہے، ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی درجے میں اس کی تلافی فرما دیں گے۔ لہٰذا والدین اور اہل تعلقات کے انتقال کے بعد ان کے اہل تعلقات سے نباہ کرنا اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا اور ان سے ملتے جلتے رہنا یہ بھی ایمان کا ایک حصہ ہے۔ یہ نہیں کہ جو آدمی مر گیا تو وہ

---

(۱) سنن أبي داؤد، باب في بر الوالدين، رقم:٥١٤٢

اپنے اہل تعلقات کو بھی ساتھ لے گیا بلکہ اس کے اہل تعلقات تو دنیا میں موجود ہیں، تم ان کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ دیکھئے! حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو انتقال ہوئے بہت عرصہ گزر چکا تھا لیکن اس کے باوجود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان خاتون کا اکرام فرمایا۔ اس کے علاوہ بعض احادیث میں آتا ہے کہ آپ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی سہیلیوں کے پاس ہدیے تحفے بھیجا کرتے تھے، صرف اس وجہ سے کہ ان کا تعلق حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے تھا اور یہ ان کی سہیلیاں تھیں۔ (۱)

تعلق کو نبھانا سنت ہے

اس حدیث میں دوسرا سبق وہ ہے جو حدیث کے الفاظ ''حسن العہد'' سے معلوم ہو رہا ہے۔ ''حسن العہد'' کے معنی ہیں، اچھی طرح نباہ کرنا، یعنی جب ایک مرتبہ کسی سے تعلق قائم ہو گیا تو حتیٰ الامکان اس تعلق کو نبھاؤ اور جب تک ہو سکے اپنی طرف سے اس کو توڑنے سے پرہیز کرو۔ بالفرض اگر اس کی طرف سے تمہیں تکلیفیں بھی پہنچ رہی ہیں تو یہ سمجھو کہ دوسرے کے ساتھ تعلق کو نبھانا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، پھر سنت اور عبادت سمجھ کر اس تعلق کو نبھاؤ۔

حسن تعلق کا انوکھا واقعہ

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اہل تعلقات میں ایک صاحب تھے، ویسے تو بڑے نیک آدمی تھے۔ لیکن بعض لوگوں کی اعتراض کرنے کی طبیعت ہوتی ہے، وہ جب بھی کسی سے ملیں گے تو اس پر کوئی نہ کوئی اعتراض کر دیں گے اور کوئی طعنہ مار دیں گے، کوئی شکایت کر دیں گے۔ بعض لوگوں کا ایسا مزاج ہوتا ہے۔ ان صاحب کا بھی ایسا ہی مزاج تھا، چنانچہ لوگ اس معاملے میں ان سے پریشان رہتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنی اس عادت کے مطابق خود میرے ساتھ ایسی بات کی کہ وہ میری برداشت سے باہر ہو گئی، وہ بات میرے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اس وقت تو میں اس بات کو پی گیا۔ میرے دماغ میں اس وقت یہ بات آئی کہ یہ صاحب کچھ اپنے مرتبے اور کچھ اپنے مال و دولت کے گھمنڈ میں دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں، اور اسی وجہ سے انہوں نے مجھ سے ایسی بات کی ہے۔ چنانچہ گھر واپس آ کر میں نے ایک تیز خط لکھا اور اس خط میں یہ بات بھی لکھ دی کہ آپ کے مزاج میں یہ بات ہے، جس کے نتیجے میں لوگوں کو آپ سے شکایتیں رہتی ہیں۔ اور اب

(۱) صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فضائل خديجة أم المؤمنين رضي الله عنها، رقم: ٦٤٣١، كنز العمال رقم: ١٨٣٣٩ (١٣٠/٧)

آج آپ نے میرے ساتھ جو رویہ اختیار کیا، یہ میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔ اس لیے اب آئندہ میں آپ سے تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔ یہ خط لکھا۔

اپنی طرف سے تعلق مت توڑیں

لیکن چونکہ الحمدللہ میری عادت یہ تھی کہ جب کبھی کوئی ایسی بات سامنے آتی تو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ضرور پیش کر دیتا تھا۔ چنانچہ وہ خط لکھ کر حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ کی خدمت میں پیش کیا اور ان کو سارا قصہ بھی سنایا کہ یہ بات ہوئی اور انہوں نے یہ رویہ اختیار کیا، اور اب یہ بات میری برداشت سے باہر ہو گئی ہے۔ چونکہ اس وقت میری طبیعت میں ہیجان اور اشتعال تھا، اس لیے والد صاحب نے اس وقت تو وہ خط لے کر رکھ لیا اور فرمایا کہ اچھا پھر کسی وقت بات کریں گے۔ یہ کہہ کر ٹال دیا۔ جب پورا ایک دن گزر گیا تو حضرت والد صاحب نے مجھے بلایا اور فرمایا کہ تمہارا خط رکھا ہوا ہے اور میں نے پڑھ لیا ہے، اس خط سے تمہارا کیا مقصد ہے؟ میں نے کہا کہ میرا مقصد یہ ہے کہ اب یہ خط ان کو بھیج کر تعلقات ختم کر دیں۔ اس وقت حضرت والد صاحب نے ایک جملہ ارشاد فرمایا کہ دیکھو کسی سے تعلق توڑنا ایسا کام ہے کہ جب چاہو کر لو، اس میں کسی انتظار کی یا وقت کی ضرورت نہیں، اس میں کوئی لمبا چوڑا کام نہیں کرنا پڑتا۔ لیکن تعلق جوڑنا ایسا کام ہے جو ہر وقت نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا تمہیں اس کی جلدی کیا ہے کہ یہ خط ابھی بھیجنا ہے، ابھی کچھ دن اور انتظار کر لو اور دیکھ لو، البتہ اگر ان سے ملنے کا دل نہیں چاہتا تو ان کے پاس مت جاؤ، لیکن اس طرح خط لکھ کر باقاعدہ قطع تعلق کر لینا تو یہ اپنی طرف سے تعلق ختم کرنے کی بات ہوئی۔

تعلق توڑنا آسان ہے جوڑنا مشکل ہے

پھر فرمایا کہ تعلق ایسی چیز ہے کہ جب ایک مرتبہ قائم ہو جائے تو حتیٰ الامکان اس تعلق کو نبھاؤ۔ تعلق کو توڑنا آسان ہے جوڑنا مشکل ہے۔ اگر تمہاری طبیعت ان کے ساتھ نہیں ملتی تو یہ ضروری نہیں ہے کہ تم صبح و شام ان کے پاس جایا کرو بلکہ طبیعت نہیں ملتی تو مت جاؤ، لیکن جب تعلق قائم ہے تو اپنی طرف سے قطع کرنے کی کوشش نہ کرو۔ پھر ایک دوسرا خط نکال کر دکھایا جو خود لکھا تھا اور فرمایا کہ اب میں نے یہ دوسرا خط لکھا ہے، اس خط کو پڑھو اور اپنے خط کو پڑھو، تمہارا خط تعلقات کو ختم کرنے والا ہے، اور میرا خط پڑھو، میرے خط کے اندر بھی شکایت کا اظہار ہو گیا اور یہ بات بھی اس میں آ گئی کہ ان کا یہ طریقہ اور رویہ تمہیں ناگوار ہوا، معاملے کی بات پوری آ گئی لیکن اس خط نے تعلقات کو ختم نہیں

کیا۔ چنانچہ وہ خط لے کر میں نے پڑھا تو میرے خط میں اور حضرت کے خط میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ہم نے اپنے جذبات اور اشتعال میں آ کر وہ خط لکھ دیا تھا اور انہوں نے نبی کریم ﷺ کی سنت کے مطابق بات نبھانے کے لیے اس طرح خط لکھا کہ شکایت اپنی جگہ ہوگئی اور ان کے جس طرز عمل سے ناگواری ہوئی تھی، اس کا بھی اظہار ہوگیا کہ آپ کی یہ بات ہمیں پسند نہیں آئی۔ لیکن آئندہ کے لیے قطع تعلق کی جو بات تھی وہ اس میں سے کاٹ دی۔

پھر فرمایا کہ دیکھو یہ پرانے تعلقات ہیں اور ان صاحب سے تعلق میرا اپنا ذاتی تعلق نہیں ہے بلکہ ہمارے والد صاحب کے وقت سے یہ تعلق چلا آ رہا ہے۔ ان کے والد صاحب سے ہمارے والد صاحب کا تعلق تھا۔ اب اتنے پرانے تعلق کو ایک لمحے میں کاٹ کر ختم کر دینا یہ کوئی اچھی بات نہیں۔

عمارت ڈھانا آسان ہے، بنانا مشکل!

بہر حال، حضرت والد صاحب نے یہ جملہ جو ارشاد فرمایا تھا کہ تعلقات کو توڑنا آسان ہے جوڑنا مشکل ہے۔ یہ ایسا جملہ فرما دیا کہ آج یہ جملہ دل پر نقش ہے۔ ایک عمارت کھڑی ہوئی ہے، اس عمارت کو ڈھا دو، وہ عمارت دو دن کے اندر ختم ہو جائے گی۔ لیکن جب تعمیر کرنے لگو گے تو اس میں کئی سال خرچ ہو جائیں گے۔ لہٰذا کوئی بھی تعلق ہو اس کو توڑنا آسان ہے جوڑنا مشکل ہے۔ اس لیے تعلق توڑنے کے لیے پہلے ہزار مرتبہ سوچو۔ اس لیے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((وَاِنَّ حُسْنَ الْعَهْدِ مِنَ الْاِيْمَانِ))

”اچھی طرح نبھاؤ کرنا یہ ایمان کا تقاضہ ہے“

اگر تعلقات سے تکلیف پہنچے تو؟

فرض کریں کہ اگر آپ کو تعلق کی وجہ سے دوسرے سے تکلیف بھی پہنچ رہی ہے تو یہ سوچو کہ تمہیں جتنی تکلیفیں پہنچیں گی، تمہارے درجات میں اتنا ہی اضافہ ہوگا، تمہارے ثواب میں اضافہ ہو گا۔ اس لیے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر کسی مؤمن کو ایک کانٹا بھی چبھتا ہے تو وہ کانٹا اس کے ثواب اور اس کے درجات میں اضافہ کرتا ہے۔(۱)

---

(۱) صحيح البخارى، كتاب المرضى، باب ما جاء فى كفارة المرضى، رقم: ٥٢٠٩، صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب ثواب المؤمن فيما يصيبه من مرض أو حزن أو نحو ذلك، رقم: ٤٦٦٤

لہٰذا اگر کسی سے تمہیں تکلیف پہنچ رہی ہے اور تم اس پر صبر کر رہے ہو تو اس صبر کا ثواب تمہیں مل رہا ہے، اور اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد ((وَاِنَّ حُسْنَ الْعَهْدِ مِنَ الْاِيْمَانِ)) پر عمل کرنے کی نیت ہے تو اس صورت میں اتباع سنت کا اور زیادہ ثواب تمہیں مل رہا ہے۔

تکالیف پر صبر کرنے کا بدلہ

لہٰذا یہاں جو تکلیفیں تمہیں پہنچ رہی ہیں وہ اس دنیا میں رہ جائیں گی، یہ تو تھوڑی دیر اور تھوڑے وقت کی ہیں لیکن اس کا جو اجر و ثواب تم اپنی قبر میں سمیٹ کر لے جاؤ گے اور جو اجر و ثواب اللہ تعالیٰ تمہیں آخرت میں عطا فرمائیں گے، وہ اجر و ثواب ان شاء اللہ ان تکلیفوں کے مقابلے میں اتنا زیادہ ہوگا کہ اس کے سامنے ان تکلیفوں کی کوئی حقیقت نہیں ہوگی۔ ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ قیامت کے روز صبر کرنے والوں کو اپنی رحمتوں سے نوازیں گے اور ان کو صبر کا صلہ عطا فرمائیں گے تو جو لوگ دنیا میں آرام اور راحت سے رہے ہیں وہ تمنا کریں گے کہ کاش دنیا میں ہماری کھالوں کو قینچیوں سے کاٹا گیا ہوتا اور اس پر ہم صبر کرتے اور ہمیں بھی اتنا ہی ثواب ملتا جتنا ان لوگوں کو مل رہا ہے۔ (۱)

اس طرح لوگ حسرت کریں گے، اس لیے جو یہ تکلیفیں تھوڑی بہت پہنچ رہی ہیں ان کو برداشت کرلو۔

تعلق کو نباہنے کا مطلب

لیکن نباہ کرنے کے معنی سمجھ لینا چاہئے۔ نباہ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے حقوق ادا کرتے رہو اور اس سے تعلق ختم نہ کرو۔ لیکن نباہ کرنے کے لیے دل میں مناسبت کا پیدا ہونا اور اس کے ساتھ دل کا لگنا اور طبیعت میں کسی قسم کی الجھن کا باقی نہ رہنا ضروری نہیں۔ اور نہ یہ ضروری ہے کہ دن رات ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا باقی رہے اور ان کے ساتھ ہنسنا بولنا اور ملنا جلنا باقی رہے۔ نباہ کے لیے ان چیزوں کا باقی رکھنا ضروری نہیں بلکہ تعلقات کو باقی رکھنے کے لیے حقوق شرعیہ کی ادائیگی کافی ہے۔ لہٰذا آپ کو اس بات پر کوئی مجبور نہیں کرتا کہ آپ کا دل تو فلاں کے ساتھ نہیں لگتا لیکن آپ زبردستی اس کے ساتھ جا کر ملاقات کریں۔ یا آپ کی ان کے ساتھ محبت نہیں ہے تو اب کوئی اس پر مجبور نہیں کرتا

(۱) المعجم الکبیر، رقم: ۸۶۸۹ (۸/۶۶)، الترغیب والترهیب، رقم: ۵۱۵۹ (۴/۱۴۲)، کنز العمال، رقم: ۶۶۶۰ (۳/۳۰۳)

کہ آپ طبیعت کے خلاف ان کے پاس جا کر بیٹھیں۔ بس صرف ان کے حقوق ادا کرتے رہیں اور قطع تعلق نہ کریں۔ بس ((وَاِنَّ حُسْنَ الْعَهْدِ مِنَ الْاِیْمَانِ)) کے یہی معنی ہیں۔

یہ سنت چھوڑنے کا نتیجہ ہے

بہرحال، ہمارے آپس کے تعلقات میں دن رات لڑائیاں اور جھگڑے اٹھتے رہتے ہیں، وہ درحقیقت حضور اقدس ﷺ کی اس سنت کو چھوڑنے اور آپ کی ہدایات اور تعلیمات کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہے۔ اگر ایک وہ حدیث جو پچھلے بیان میں پڑھی تھی اور ایک یہ حدیث جو آج پڑھی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم ان دونوں حدیثوں کو پلے باندھ لیں اور ان کی حقیقت سمجھ لیں اور ان پر عمل کر لیں تو ہمارے معاشرے کے بے شمار جھگڑے ختم ہو جائیں۔ وہ یہ کہ محبت کرو تو اعتدال سے کرو اور بغض کرو تو اعتدال سے کرو۔ شریعت کی ساری تعلیم یہ ہے کہ اعتدال سے کام لو اور کہیں بھی حد سے متجاوز نہ ہو جاؤ۔ اور یہ کہ جب کسی سے تعلق قائم ہو جائے تو اس تعلق کو نباہنے کی کوشش کرو۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور اپنے فضل و کرم سے مجھے اور آپ سب کو ان ارشادات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

☆☆☆

خاندانی اختلافات کا پہلا حل
باہمی الفت ومحبت ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَفْضَلَ مِنْ دَرَجَةِ الصِّيَامِ وَالصَّلٰوةِ وَالصَّدَقَةِ)) قَالُوْا : بَلٰى قَالَ: ((إِصْلَاحُ ذَاتِ الْبَيْنِ، وَفَسَادُ ذَاتِ الْبَيْنِ الْحَالِقَةُ))(۱)

یہ حدیث حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بڑے اونچے درجے کے اولیاء اللہ میں سے ہیں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ''حکیم ہذہ الامۃ'' کا لقب عطا فرمایا تھا یعنی یہ امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکیم ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو ''حکمت'' عطا فرمائی تھی۔(۲)

سوال کے ذریعہ طلب پیدا کرنا

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا ''کیا میں تمہیں ایسا درجہ نہ بتاؤں جو نماز، روزے اور صدقے سے بھی افضل ہے؟''

یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا انداز گفتگو تھا کہ جب کسی چیز کی اہمیت بیان کرنی منظور ہوتی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے خود ہی سوال فرمایا کرتے تھے، تاکہ ان کے دل میں طلب پیدا ہو جائے۔ اگر دل میں

☆ اصلاحی خطبات (۱۱/۱۷۰ تا ۲۰۴)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد دار العلوم، کراچی

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في إصلاح ذات البين، رقم: ۴۲۷۳، مسند أحمد، رقم: ۲۶۲۳۶، مؤطا مالك، كتاب الجامع، باب عن عائشة زوج النبي......، رقم: ۱۴۰۵

(۲) الإبانة الكبرى لابن بطة، رقم: ۹۸ (۱/۱۰۳)

طلب ہو تو اس وقت جو بات کہی جائے اس کا اثر بھی ہوتا ہے، اور اگر دل میں طلب نہ ہو تو کیسی بھی اچھی سے اچھی بات کہہ دی جائے، کیسا ہی اچھے سے اچھا نسخہ بتا دیا جائے، بہتر سے بہتر تعلیم دے دی جائے، ان چیزوں سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ یہ طلب بڑی چیز ہے۔

دین کی طلب پیدا کریں

اس لیے بزرگان دین نے فرمایا کہ انسان کی کامیابی کا راز اس میں ہے کہ انسان اپنے اندر دین کی طلب اور دین کی باتوں پر عمل کرنے کی طلب پیدا کر لے۔ جب یہ طلب پیدا ہو جاتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ خود نواز دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے۔ اسی کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

آب کم جو تشنگی آور بدست
تا بجوشد آب از بالا وپست

یعنی پانی کم تلاش کرو، پیاس زیادہ پیدا کرو، جب پیاس پیدا ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ پھر اوپر اور نیچے ہر طرف سے پانی جوش مارتا ہے۔ یہ طلب بڑی چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم سب کے دلوں میں پیدا فرما دے۔ آمین

''طلب'' بے چینی پیدا کرتی ہے

یہ ''طلب'' ہی وہ چیز ہے کہ جب ایک مرتبہ انسان کے اندر پیدا ہو جائے تو پھر انسان کو چین لینے نہیں دیتی، بلکہ اس کو بیتاب رکھتی ہے، جب تک انسان کو مقصود حاصل نہ ہو جائے انسان کو چین نہیں آتا۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ جب انسان کو بھوک لگ جائے اور ''بھوک'' کے معنی ہیں ''کھانے کی طلب'' تو جب انسان کو بھوک لگی ہوئی ہوگی تو کیا انسان کو چین آئے گا؟ کسی دوسرے کام کو کرنے کا دل چاہے گا؟ جب کھانے کی طلب لگی ہوئی ہے تو آدمی کو اس وقت تک چین نہیں آئے گا جب تک کہ اس کو کھانا نہ مل جائے۔ اگر انسان کو پیاس لگی ہوئی ہے تو ''پیاس'' کے معنی ہیں ''پانی کی طلب'' جب تک پانی نہیں مل جائے گا اس وقت تک چین نہیں آئے گا۔

اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں ''دین'' کی بھی ایسی ہی طلب پیدا فرما دے، جب یہ طلب پیدا ہو جاتی ہے تو انسان کو اس وقت تک چین نہیں آتا جب تک دین حاصل نہ ہو جائے بلکہ بے چینی لگی رہتی ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم اور دین کی طلب

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہی حال تھا کہ ان میں سے ہر شخص کو یہ بے چینی لگی ہوئی تھی کہ مرنے کے بعد میرا کیا انجام ہونا ہے؟ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے، اس کے بعد یا جہنم ہے یا جنت ہے، لیکن مجھے نہیں معلوم کہ میرا انجام کیا ہونے والا ہے، اس بے چینی کا نتیجہ یہ تھا کہ صبح سے لے کر شام تک معمولی معمولی کاموں میں بھی فکر لگی ہوئی ہے کہ معلوم نہیں کہ یہ کام اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے مطابق ہے یا نہیں؟ کہیں اس کی وجہ سے میں جہنم کا مستحق تو نہیں ہو گیا۔

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کو فکر آخرت

یہاں تک کہ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور آکر عرض کیا:

"یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! نَافَقَ حَنْظَلَۃُ"

"اے اللہ کے رسول! حنظلہ منافق ہو گیا"

اپنے بارے میں کہہ رہے ہیں کہ میں تو منافق ہو گیا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ کیسے منافق ہو گئے؟ انہوں نے فرمایا کہ جب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھتا ہوں تو اس وقت تو آخرت کی فکر لگی ہوتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنت اور جہنم کو اپنی آنکھوں سے اپنے سامنے دیکھ رہے ہیں، اور اس کی وجہ سے دل میں رقت اور نرمی پیدا ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، لیکن جب آپ کی مجلس سے اٹھ کر بیوی بچوں کے پاس گھر جاتے ہیں تو اس وقت دل کی یہ کیفیت باقی نہیں رہتی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں تو منافق ہو گیا، اس لیے کہ آپ کے پاس ایک حالت ہوتی ہے اور گھر جا کر دوسری حالت ہو جاتی ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اطمینان دلایا اور فرمایا کہ اے حنظلہ! یہ وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔(۱)

کسی وقت انسان پر ایک حال کا غلبہ ہو جاتا ہے اور دوسرے وقت دوسری حالت کا غلبہ ہو جاتا ہے، اس لیے پریشان نہ ہوں، بلکہ جو کام اللہ تعالیٰ نے بتائے ہیں ان میں لگے رہو، ان شاء اللہ بیڑا پار ہو جائے گا۔ لہٰذا یہ فکر کہ میں کہیں منافق تو نہیں ہو گیا، یہ آخرت کی طلب ہے جو بے چین کر رہی ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب التوبة، باب فضل دوام الذکر والفکر......، رقم: ٤٩٣٧، سنن الترمذی، کتاب صفة القیامة والرقائق والورع عن رسول الله، باب منه، رقم: ٢٤٣٨، مسند أحمد، رقم: ١٨٢٦٨

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور فکر آخرت

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اتنے بڑے جلیل القدر صحابی، خلیفہ ثانی، جن کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمادیا کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتے۔(۱)

جن کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس راستے سے عمر گزر جاتے ہیں، اس راستے سے شیطان نہیں گزرتا، شیطان راستہ بدل دیتا ہے۔(۲)

وہ عمر جن کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے جنت کے اندر تمہارا محل دیکھا ہے۔(۳)

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ تمام باتیں سننے کے باوجود آپ رضی اللہ عنہ کا یہ حال تھا کہ آپ رضی اللہ عنہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو قسم دے کر پوچھتے ہیں کہ اے حذیفہ! خدا کے لیے یہ بتاؤ کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کی جو فہرست تمہیں بتائی ہے، ان میں کہیں میرا نام تو نہیں ہے؟ یہ فکر اور طلب لگی ہوئی ہے۔

طلب کے بعد مدد آتی ہے

اور جب طلب لگ جاتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے عطا فرما ہی دیتے ہیں۔ اس لیے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

آب کم جو تشنگی آور بدست
تا بجوشد آب از بالا و پست

پانی تلاش کرنے سے زیادہ پیاس پیدا کرو، دل میں ہر وقت کھٹک اور بے چینی اور بیتابی لگی ہوئی ہو کہ مجھے صحیح بات کا علم ہو جائے، اور جب یہ طلب پیدا ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے عطا فرما ہی دیتے ہیں، ان کی سنت یہ ہے کہ کسی سچے طالب کو جس کے دل میں طلب صادق ہو آج تک اللہ تعالیٰ نے رد نہیں فرمایا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کا یہ انداز تھا کہ آپ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم

(۱) سنن الترمذی، کتاب المناقب عن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم، باب فی مناقب عمر بن الخطاب، رقم: ۳٦۱۹، مسند أحمد، رقم: ۱٦۷٦٤

(۲) صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب مناقب عمر بن الخطاب أبی حفص القرشی العدوی، رقم: ۳٤۰۳، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل عمر، رقم: ٤٤۱۰

(۳) صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب مناقب عمر بن الخطاب أبی حفس القرشی العدوی، رقم: ۳٤۰۳، مسند أحمد، رقم: ۱۳۳٦۹

میں پہلے طلب پیدا فرماتے تھے۔ اس لیے پہلے آپ نے ان سے سوال کیا کہ کیا میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کا اور اجر و ثواب کا ایسا درجہ نہ بتاؤں جو نماز سے بھی افضل، روزوں سے بھی افضل اور صدقہ سے بھی افضل ہو؟ یہ سوال کر کے ان کے اندر شوق اور طلب پیدا فرما رہے ہیں۔

نماز، قربِ خداوندی کا ذریعہ

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور بتایئے۔ اس لیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تو ہر وقت یہ دھن لگی ہوئی تھی کہ کون سی چیز ایسی ہے جو اللہ تعالیٰ کا قرب عطا کرنے والی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رضا عطا کرنے والی ہے۔ اور اب تک روزے کی نماز کی اور صدقے کی فضیلت سن چکے تھے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز دین کا ستون ہے۔ (۱)

ایک اور حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ بندہ نوافل کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے اور جتنے نوافل زیادہ پڑھتا ہے وہ اتنا ہی میرے قریب ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ ایک درجہ ایسا آ جاتا ہے کہ میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔ (۲)

گویا کہ نوافل کی کثرت کے نتیجے میں وہ انسان اللہ تعالیٰ کے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ اس انسان کا سراپا اللہ تعالیٰ کی رضا کا مظہر بن جاتا ہے۔ صحابہ کرام نماز کی یہ فضیلت سن چکے تھے، اس لیے ان کے ذہنوں میں یہ تھا کہ نماز سے زیادہ افضل کیا چیز ہوگی۔

روزے کی فضیلت

روزے کی یہ فضیلت بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سن چکے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دوسری عبادتوں کا اجر تو میں نے مقرر کر دیا ہے کہ فلاں عبادت کا ثواب دس گنا، فلاں عبادت کا ثواب سو گنا اور فلاں عبادت کا ثواب سات سو گنا، لیکن روزے کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

((اَلصَّوْمُ لِیْ وَأَنَا أُجْزِیْ بِه)) (۳)

(۱) کنز العمال، رقم: ۱۸۸۸۹ (۲۸۴/۷)، شعب الإیمان للبیهقی، رقم: ۲۸۰۷ (۹۳/۳)

(۲) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع، رقم: ۶۰۲۱

(۳) صحیح البخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ یریدون أن یبدلوا کلام اللہ، رقم: ۶۹۳۸، صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب فضل الصیام، رقم: ۱۹۴۶، سنن الترمذی، کتاب الصوم، باب ماجاء فی فضل الصوم، رقم: ۶۹۵، سنن النسائی، کتاب الصیام، باب فضل الصیام، رقم: ۲۱۸۱، مسند أحمد، رقم: ۴۰۳۶

''یہ روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا''

یعنی روزے کا جو اجر وثواب میں عطا کرنے والا ہوں وہ تمہاری گنتی میں اور تمہارے پیمانوں میں اس اجر وثواب کا تصور آ ہی نہیں سکتا، یہ روزہ چونکہ میرے لیے ہے، اس لیے اس کا اجر وثواب بھی میں اپنی شان کے مطابق دوں گا، اپنی عظمت کے مطابق دوں گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم روزے کی یہ فضیلت سن چکے تھے۔ اس لیے ان کے ذہنوں میں یہ تھا کہ روزہ بہت زیادہ افضل عبادت ہے۔

صدقہ کی فضیلت

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم صدقہ کی یہ فضیلت سن چکے تھے کہ اللہ کے راستے میں صدقہ کرنے سے سات سو گنا اجر وثواب ملنا تو یقینی ہے اور یہ سات سو گنا ثواب بھی ہمارے حساب سے نہیں بلکہ جنت کے حساب سے ملنا ہے۔ اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ سمجھتے تھے کہ صدقہ کرنا بہت افضل عبادت ہے۔

سب سے افضل عمل جھگڑے ختم کرانا

اس لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ کیا میں ایسی چیز نہ بتاؤں جو اس نماز سے بھی افضل ہے، اس روزے سے بھی افضل ہے، اس صدقہ کرنے سے بھی افضل ہے جن کی فضیلتیں تم نے سن رکھی ہیں؟ چنانچہ یہ سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دل میں شوق پیدا ہوا اور انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! وہ چیز ضرور بتائیں تاکہ ہم وہ چیز حاصل کریں اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ ہمیں ان عبادات سے بھی زیادہ ثواب عطا فرمادیں۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((صَلَاحُ ذَاتِ الْبَيْنِ))

یعنی وہ چیز آپس میں صلح کرانا ہے، یعنی اگر دو مسلمانوں کے درمیان ناچاقی، اختلاف اور کٹاؤ ہو گیا ہے یا دو مسلمانوں کے درمیان جھگڑا کھڑا ہو گیا ہے اور دونوں ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کے روادار نہیں ہیں تو اب کوئی ایسا کام کرو جس کے نتیجے میں ان کے درمیان وہ جھگڑا ختم ہو جائے اور دونوں کے دل آپس میں مل جائیں اور دونوں ایک ہو جائیں۔ تمہارا یہ عمل نماز سے بھی افضل ہے، روزے سے بھی افضل ہے، صدقہ سے بھی افضل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ انداز بیان تھا۔

صلح کرانا نفل نماز روزے سے افضل ہے

لیکن ایک بات یاد رکھیں کہ اس حدیث میں نماز روزے سے نفلی نماز روزے مراد ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اگر ایک طرف تم ساری رات نفلی نمازیں پڑھتے رہو، سارا دن نفلی روزے رکھو اور بہت سا مال نفلی صدقہ کرو، تو ان میں سے ہر کام بڑی فضیلت اور ثواب کا ہے لیکن دوسری طرف دو مسلمان بھائیوں کے درمیان جھگڑا ہے، اور اس جھگڑے کی وجہ سے دونوں کے درمیان ناچاقی پیدا ہو گئی ہے، تو اس جھگڑے کو ختم کرنے کے لیے اگر تم تھوڑا سا وقت صرف کرو گے اور ان کے دل اور گلے ملوا دو گے اور ان کے درمیان محبت پیدا کروا دو گے تو اس صورت میں تم نے جو ساری رات نفل نمازیں پڑھی تھیں، نفل روزے رکھے تھے اور سینکڑوں روپے نفل صدقہ کے طور پر دیئے تھے، ان سب سے زیادہ اجر وثواب تمہیں اس عمل میں حاصل ہو جائے گا۔ آپ اندازہ کریں کہ کتنی بڑی بات حضور اقدس ﷺ نے بیان فرما دی۔

آپس کے اختلافات دین کو مونڈنے والے ہیں

ایک طرف تو یہ فرما دیا کہ مسلمانوں کے درمیان آپس میں محبتیں بھائی چارہ اور اخوت قائم کرنا تمام نفلی عبادتوں سے افضل ہے، اور دوسری طرف اگلا جملہ اس کے بالکل برعکس ارشاد فرما دیا:

((وَفَسَادُ ذَاتِ الْبَيْنِ هِيَ الْحَالِقَةُ))

یعنی آپس کے جھگڑے، آپس کی نفرتیں اور ناچاقیاں یہ مونڈنے والی چیزیں ہیں۔ ایک دوسری حدیث میں اس کی تشریح کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں یہ نہیں کہتا کہ آپس کے یہ جھگڑے تمہارے بالوں کو مونڈنے والے ہیں، بلکہ یہ جھگڑے تمہارے دین کو مونڈنے والے ہیں۔ کیونکہ جب آپس میں نفرتیں ہوتی ہیں اور جھگڑے ہوتے ہیں تو اس جھگڑے کی وجہ سے انسان نہ جانے کتنے بے شمار گناہوں کے اندر مبتلا ہو جاتا ہے، ان جھگڑوں کے نتیجے میں ایک دوسرے کی غیبت ہوتی ہے، ایک دوسرے پر بہتان لگایا جاتا ہے، ایک دوسرے کی ایذاء رسانی ہوتی ہے، ایک دوسرے پر تہمتیں لگائی جاتی ہیں۔ تو یہ جھگڑے بے شمار گناہوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔

جھگڑوں کی نحوست

ان جھگڑوں کی نحوست یہ ہوتی ہے کہ انسان دین سے بیگانہ ہو جاتا ہے اور دین کا نور جاتا رہتا ہے اور دل میں ظلمت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے حضور اقدس ﷺ نے جا بجا یہ تاکید فرمائی کہ آپس کے جھگڑوں سے بچو۔

مصالحت کے لیے آپ ﷺ کا جماعت چھوڑ دینا

دیکھئے! حضور اقدس ﷺ پوری حیات طیبہ میں مسجد نبوی میں امامت کے فرائض انجام دیتے رہے، ظاہر ہے کہ آپ کی موجودگی میں کون نماز پڑھائے گا، اور آپ ﷺ سے زیادہ کون نماز باجماعت کی پابندی کرے گا، لیکن پوری حیات طیبہ میں صرف ایک مرتبہ آپ ﷺ نماز کے وقت مسجد نبوی میں تشریف نہیں لا سکے، یہاں تک کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھائی۔ اور نماز کے وقت حاضر نہ ہونے کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ آپ ﷺ کو پتہ چلا کہ فلاں قبیلے میں مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا ہے، چنانچہ ان کے جھگڑے کو ختم کرانے کے لیے اور ان کے درمیان صلح کرانے کے لیے حضور اقدس ﷺ اس قبیلہ میں تشریف لے گئے، اس مصالحت کرانے میں دیر لگ گئی، یہاں تک کہ نماز کا وقت آ گیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب دیکھا کہ حضور اقدس ﷺ موجود نہیں ہیں، تو اس وقت حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے امامت فرمائی اور حضور اقدس ﷺ بعد میں تشریف لائے۔(۱)

پوری حیات طیبہ میں صرف یہ ایک واقعہ ہے کہ آپ ﷺ صحت کی حالت میں نماز کے وقت مسجد نبوی میں تشریف نہ لا سکے، اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ آپ لوگوں کے درمیان مصالحت کرانے اور جھگڑا ختم کرانے کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ اس لیے قرآن و حدیث ان ارشادات سے بھرے ہوئے ہیں کہ خدا کے لیے مسلمانوں کے درمیان جھگڑوں کو کسی قیمت پر برداشت نہ کروں، جہاں کہیں جھگڑے کا کوئی سبب پیدا ہو، فوراً اس کو ختم کرانے کی کوشش کرو، اور اس لیے کہ یہ جھگڑے دین کو مونڈ دینے والے ہیں۔

جنت کے بیچ میں مکان دلانے کی ضمانت

ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((أَنَا زَعِيمٌ بِبَيْتٍ فِي رَبَضِ الْجَنَّةِ لِمَنْ تَرَكَ الْمِرَاءَ وَهُوَ مُحِقٌّ))(۲)

''میں اس شخص کے لیے جنت کے کنارے میں گھر دلوانے کی ضمانت لیتا ہوں جو

(۱) صحيح مسلم، كتاب الطهارة، باب رقم: ٤١٠، سنن النسائي، كتاب الطهارة، رقم: ٨١، سنن أبي داؤد، كتاب الطهارة، باب رقم: ١٢٨، مسند أحمد، رقم: ١٧٤٣٢، سنن الدارمي، كتاب الصلاة، باب السنة فيمن سبق ببعض الصلاة، رقم: ١٣٠١،

(۲) سنن أبي داؤد كتاب الأدب، باب في حسن الخلق، رقم: ٤١٦٧

شخص حق پر ہونے کے باوجود جھگڑا چھوڑ دے"

یعنی وہ شخص حق پر تھا اور حق پر ہونے کی وجہ سے اگر وہ چاہتا تو اپنے اس حق کو وصول کرنے کے لیے مقدمہ دائر کر دیتا، یا کوئی اور ایسا طریقہ اختیار کر لیتا جس کے نتیجے میں اس کو اس کا حق مل جاتا، لیکن اس نے یہ سوچ کر کہ جھگڑا بڑھے گا اور جھگڑا بڑھانے سے کیا فائدہ، لہٰذا اپنا حق ہی چھوڑ دیا۔ ایسے شخص کے لیے آپ نے فرمایا کہ میں اس کو جنت کے بیچوں بیچ گھر دلوانے کا ذمہ دار ہوں۔ اتنی بڑی بات سرکار دو عالم ﷺ نے فرمادی، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

یہ ضمانت دوسرے اعمال پر نہیں

یہ ذمہ داری حضور اقدس ﷺ نے کسی دوسرے عمل پر نہیں لی لیکن حق پر ہونے کے باوجود جھگڑا چھوڑنے والے کے لیے یہ ذمہ داری لے رہے ہیں۔ اس کے ذریعہ حضور اقدس ﷺ یہ تعلیم دے رہے ہیں کہ آپس کے اختلافات ختم کر دو، اللہ کے بندے بن جاؤ اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ، اور جھگڑے کے جو جو اسباب ہو سکتے ہیں، ان کو بھی ختم کرو، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے وحدت میں اخوت میں اور محبت میں ایک نور رکھا ہے، اس نور کے ذریعے انسان کی دنیا بھی روشن ہوتی ہے اور آخرت بھی روشن ہوتی ہے، اور اگر آپس میں جھگڑے ہوں، فساد ہوں تو یہ ظلمت ہے، دنیا میں بھی ظلمت اور آخرت میں بھی ظلمت، جو انسان کے دین کو مونڈ کر رکھ دیتی ہے۔

قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں

ایک حدیث میں جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِذَا الْتَقَى الْمُسْلِمَانِ بِسَيْفَيْهِمَا فَالْقَاتِلُ وَ الْمَقْتُولُ كِلَاهُمَا فِي النَّارِ))

اگر دو مسلمان تلوار کے ذریعہ ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے کھڑے ہو جائیں اور آپس میں لڑائی کرنا شروع کر دیں تو اگر ان میں سے ایک دوسرے کو قتل کر دے گا تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں جائیں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال کیا یا رسول اللہ ﷺ! قاتل تو جہنم میں جائے گا کیونکہ اس نے ایک مسلمان کو ناحق قتل کیا، لیکن مقتول جہنم میں کیوں جائے گا؟ حضور اقدس ﷺ نے جواب میں فرمایا:

((إِنَّهُ كَانَ حَرِيصاً عَلَى قَتْلِ صَاحِبِهِ))(۱)

(۱) صحيح البخاری، كتاب الايمان، باب وإن طائفتان من المؤمنين اقتتلوا، رقم: ۳۰، سنن النسائی، كتاب تحريم الدم، باب تحريم القتل، رقم: ٤٠٥١

کیونکہ یہ مقول بھی اپنے مدمقابل کو مارنے کے ارادے سے چلا تھا، اسی لیے تلوار اٹھائی تھی کہ اگر میرا داؤ چل گیا تو میں ماردوں گا، لیکن اتفاق سے داؤ اس کا نہیں چلا بلکہ دوسرے کا داؤ چل گیا، اس لیے یہ مقتول بن گیا اور وہ قاتل بن گیا، اس وجہ سے یہ بھی جہنم میں وہ بھی جہنم میں۔ اس لیے فرمایا کہ کسی مسلمان کے ساتھ لڑائی کا معاملہ ہرگز نہ کرو۔

حبشی غلام حاکم کی اتباع کیجیے

ایک اور حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی حبشی غلام بھی تم پر حاکم بن کر آجائے تو اس کے خلاف بھی تلوار مت اٹھاؤ، جب تک وہ کفر کا ارتکاب نہ کرے، کیونکہ اگر تم اس کے خلاف تلوار اٹھاؤ گے تو کوئی تمہارا ساتھ دے گا اور کوئی دوسرے کا ساتھ دے گا، اس کے نتیجے میں مسلمان دو گروہ میں تقسیم ہو جائیں گے اور ان کے درمیان منافرت پیدا ہو جائے گی، اور مسلمانوں کے درمیان افتراق، انتشار اور ناچاقی کو حضور اقدس ﷺ نے کسی قیمت پر بھی برداشت نہیں فرمایا۔ آپ نے فرمادیا:

((کُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰہِ اِخْوَانًا))

''اے اللہ کے بندو! آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ''(۱)

آج زندگی جہنم بنی ہوئی ہے

جب ہمارے ذہنوں میں عبادت کا خیال آتا ہے تو نماز روزے کا تو خیال آتا ہے، صدقہ کا خیال آتا ہے، ذکر اور تسبیح کا خیال آتا ہے، تلاوتِ قرآن کریم کا خیال آتا ہے، اور الحمدللہ یہ سب بھی اونچے درجے کی عبادتیں ہیں، لیکن سرکار دو عالم ﷺ فرما رہے ہیں کہ ان سے بھی اونچے درجے کی چیز مسلمانوں کے درمیان آپس میں صلح کرانا ہے۔ اور آج ہمارا معاشرہ حضور اقدس ﷺ کے اس ارشاد سے اتنا دور چلا گیا ہے کہ قدم قدم پر منافرت ہے، جھگڑے اور لڑائیاں ہیں، نااتفاقیاں ہیں، اور اس کی وجہ سے زندگی جہنم بنی ہوئی ہے، حالانکہ آپ نے یہ فرما دیا کہ یہ چیز دین کو مونڈنے والی

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب ما ینهی عن التی سدو التدابر، رقم: ٥٦٠٤، صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب تحریم التحاسد والقباغض والتدابر، رقم: ٤٦٤١، سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ماجاء فی الحسد، رقم: ١٨٥٨، سنن أبی داود، کتاب الأدب، باب فی من یهجر اخاه المسلم، رقم: ٤٢٦٤، سنن ابن ماجه، کتاب الدعاء باب الدعاء بالعفور العانیة، رقم: ٣٨٣٩، مسند أحمد: ١٧

ہے، اس نے آج ہمارے دین کو مونڈ ڈالا ہے، جس کی وجہ سے اس کی شناعت، قباحت اور اس کی برائی ہمارے دلوں میں بیٹھی ہوئی نہیں ہے۔

لوگوں کے درمیان اختلاف ڈالنے والے کام

اگر ہمارے معاشرے میں کوئی بے نمازی ہے یا کوئی شراب پیتا ہے یا کسی اور گناہ میں مبتلا ہے، تو اس کو تو ہمارے معاشرے میں الحمدللہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ شخص برا کام کر رہا ہے، لیکن اگر کوئی شخص ایسا کام کر رہا ہے جس کی وجہ سے لوگوں کے درمیان لڑائیاں ہو رہی ہیں، جس کی وجہ سے مسلمانوں کے درمیان جھگڑے ہو رہے ہیں، تو اس کی طرف سے کسی کے دل میں یہ خیال نہیں آتا کہ یہ اتنا بڑا مجرم ہے جتنا سرکار دو عالم ﷺ اس کو مجرم قرار دے رہے ہیں، اور اس بات کی فکر بھی کسی کے دل میں نہیں ہے کہ ان جھگڑوں کو کیسے ختم کیا جائے؟ لہٰذا یہ بہت بڑا باب ہے جو حضور اقدس ﷺ نے کھولا اور آپس میں صلح کرانے کو نماز روزے اور صدقے سے بھی افضل قرار دیا۔

ایسا شخص جھوٹا نہیں

یہاں تک کہ ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے یہ فرمادیا:

((لَيْسَ الْكَذَّابُ الَّذِيْ يُصْلِحُ بَيْنَ النَّاسِ وَيَقُوْلُ خَيْرًا وَيَنْمِيْ خَيْرًا))(۱)

یعنی جو شخص ایک مسلمان بھائی کے دل میں دوسرے کی محبت پیدا کرنے کے لیے اور نفرت دور کرنے کے لیے کوئی ایسی بات کہہ دے جو بظاہر خلافِ واقعہ ہو، تو وہ جھوٹ بولنے والوں میں شمار نہیں ہوگا۔ مثلاً ایک شخص کو معلوم ہوا کہ فلاں دو مسلمان بھائیوں کے درمیان جھگڑا ہے اور دونوں ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں، یہ شخص چاہتا ہے کہ دونوں کے درمیان محبت ہو جائے، اب اگر یہ شخص جاکر ان میں سے کسی سے ایسی بات کہہ دے جو بظاہر خلافِ واقعہ ہے، مثلاً یہ کہہ دے کہ آپ تو فلاں سے اتنی نفرت کرتے ہیں لیکن وہ تو آپ سے محبت کرتا ہے، وہ تو آپ کے حق مین دعا کرتا ہے، میں نے اس کو آپ کے حق میں دعا کرتے دیکھا ہے۔

اب اگرچہ اس کا نام لے کر دعا کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، لیکن دل میں یہ نیت کر لی کہ وہ یہ دعا تو کرتا ہی ہوگا:

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والأدب، باب تحريم الكذب وبيان المباح منه، رقم: ٤٧١٧، مسند أحمد، رقم: ٢٦٠١١

﴿رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾(۱)

جس کے معنی یہ ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم کو دنیا میں بھی اچھائی عطا فرما اور آخرت میں بھی اچھائی عطا فرما۔ لفظ ''ہم'' میں سارے مسلمان داخل ہو گئے۔

ہر مسلمان کے لیے دعا

اسی طرح کہنے والے نے یہ نیت کر لی کہ یہ نماز میں ''التحیات'' تو پڑھتا ہے اور ''التحیات'' میں یہ الفاظ ہیں ''السلام علینا وعلی عباداللہ الصالحین'' ان الفاظ میں وہ تمام مسلمانوں کے لیے سلامتی کی دعا کرتا ہے، اسی طرح نماز کے آخر میں سلام پھیرتے وقت کہتا ہے: ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ''، ''السلام علیکم'' کے معنی یہ ہیں کہ اے اللہ! ان پر سلامتی نازل فرما۔ اور فقہاء کرام نے فرمایا ہے کہ جب آدمی نماز کے آخر میں دائیں طرف سلام پھیرے تو سلام پھیرتے وقت یہ نیت کر لے کہ دائیں طرف جتنے ملائکہ، جنات اور مسلمان ہیں ان سب کے لیے سلامتی کی دعا کرتا ہوں، اور جب بائیں طرف سلام پھیرے تو یہ نیت کر لے کہ بائیں طرف جتنے ملائکہ، جنات اور مسلمان ہیں، ان سب کے لیے سلامتی کی دعا کرتا ہوں۔

لہٰذا اس نیت کے ساتھ اگر دوسرے مسلمان سے یہ کہہ دے کہ فلاں تو تمہارے حق میں دعا کرتا ہے، تو سامنے والے کے دل میں اس کی قدر پیدا ہو گی کہ میں تو اس کو برا سمجھتا تھا لیکن وہ تو میرے حق میں دعا کرتا ہے، لہٰذا مجھے اس سے دشمنی نہیں رکھنی چاہیے۔

بلکہ بعض فقہاء نے اس حدیث کی شرح میں فرمایا کہ مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے کے لیے صریح جھوٹ بھی بولنا پڑے تو صریح جھوٹ بولنا بھی جائز ہے، اگر اس کے نتیجے میں دو دل مل رہے ہوں۔ بہر حال، آپس کے اختلافات کی خرابی اتنی زیادہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے یہاں تک فرما دیا کہ ایسے حالات میں خلافِ واقعہ بات کہہ دینا بھی جائز ہے جس سے دوسرے کے دل میں قدر و محبت اور منزلت پیدا ہو جائے۔ لہٰذا جہاں کہیں موقع ملے تو آپس میں صلح کرانے کے عظیم درجے اور عظیم ثواب کو حاصل کر لو۔ کہاں تم ساری رات تہجد پڑھو گے، کہاں تم ساری عمر روزے رکھو گے، کہاں تم سارا مال صدقہ کرو گے، لیکن اگر تم نے مسلمانوں کے درمیان اتفاق اور اتحاد اور محبت پیدا کرانے کی کوشش کر لی تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس سے بھی آگے کا درجہ عطاء فرما دیں گے۔

بعض لوگ بالکل اس کے الٹ ہوتے ہیں، ان کو دو ملے ہوئے دل کبھی اچھے نہیں لگتے،

---

(۱) البقرۃ: ۲۰۱

جہاں کہیں دیکھا کہ فلاں دو شخصوں میں محبت ہے تو وہ ان کے درمیان ایسا شوشہ چھوڑ دیتے ہیں جس سے دونوں کے دلوں میں نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ یاد رکھیے! اس سے زیادہ بدترین گناہ کوئی اور نہیں ہے۔

ابلیس کا صحیح جانشین کون؟

ابلیس نے اپنے چھوٹے شیاطین کی ایک فوج بنا رکھی ہے جو پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور وہ لوگوں کو صحیح راستے سے بہکانے کا کام کرتی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ یہ ابلیس بعض اوقات سمندر پر اپنا دربار منعقد کرتا ہے اور ان سے رپورٹ طلب کرتا ہے اور اس کی تمام فوج اس کو اپنی اپنی کارگزاری سناتی ہے۔ چنانچہ ایک شیطان آ کر کہتا ہے کہ ایک شخص نماز پڑھنے جارہا تھا، میں نے اس کے دل میں ایسی بات ڈالی کہ وہ نماز کے لیے نہ جاسکا اور اس کی نماز قضا ہوگئی، میں نے اس کو نماز سے محروم کر دیا، ابلیس اس کو شاباش دیتا ہے کہ تم نے اچھا کام کیا۔ دوسرا شیطان آتا ہے اور کہتا ہے کہ ایک شخص روزہ رکھنے کا ارادہ کر رہا تھا، میں نے اس کے دل کو ایسا پلٹا کہ وہ روزے سے باز آ گیا، ابلیس اس کو شاباش دیتا ہے کہ تم نے اچھا کام کیا۔ اس کے بعد تیسرا شیطان آتا ہے اور کہتا ہے کہ فلاں شخص صدقہ خیرات کرنا چاہتا تھا، میں نے اس کے حالات ایسے پیدا کر دیئے کہ وہ صدقہ کرنے سے رک گیا، ابلیس اس کو بھی شاباش دیتا ہے کہ تم نے اچھا کام کیا۔ آخر میں ایک شیطان آ کر کہتا ہے کہ دو میاں بیوی بڑی محبت سے زندگی گزار رہے تھے، میں نے جا کر ان کے درمیان ایسا مسئلہ کھڑا کر دیا کہ دونوں کے درمیان ناچاقی ہوگئی اور دونوں ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کے روادار نہ رہے، یہاں تک کہ دونوں کے درمیان جدائی ہوگئی، ابلیس یہ سن کر اپنے تخت سے کھڑا ہو جاتا ہے اور اس کو گلے سے لگا لیتا ہے اور کہتا ہے کہ تو میرا صحیح جانشین ہے، تو نے صحیح کام کیا اور میرے مطلب کے مطابق کام کیا۔(۱)

نفرتیں ڈالنے والا بڑا مجرم ہے

بہرحال، شیطان کا سب سے بڑا حربہ اور سب سے کامیاب ترین منصوبہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں نفرتیں پیدا کرے۔ لہٰذا جن لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ اچھے خاصے رہتے بستے لوگوں کے درمیان اور محبت کرنے والے دوستوں کے درمیان منافرت پیدا کر دیتے ہیں، اور ادھر کی

(۱) صحيح مسلم، كتاب صفة القيامة والجنة والنار، باب تحريش الشيطان وبعثه سراياه لفتنة الناس، رقم: ۵۰۳۲، مسند أحمد، رقم: ۱۳۸۵۸

بات ادھر لگا دیتے ہیں، لگاوا جوئی شروع کر دیتے ہیں، اس حدیث کی رو سے وہ بہت خطرناک جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں، نماز روزے سے روک دینا بھی شیطانی عمل ہے۔ لیکن یہ ایسا شیطانی عمل ہے کہ ابلیس اس سے بہت خوش ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین۔ لہٰذا اس سے بچنے کی فکر کرنی چاہئے۔

جھگڑوں سے کیسے بچیں؟

اب سوال یہ ہے کہ ان جھگڑوں سے کیسے بچیں اور آپس میں محبتیں کیسے پیدا ہوں، اور یہ آپس کے اختلافات کیسے ختم ہوں؟ اس کے لیے حضور اقدس ﷺ نے امت کو بڑی باریک بینی سے ہدایات عطا فرمائی ہیں۔ ان ہدایات میں سے ایک ایک ہدایت آپس میں محبت کو پیدا کرنے والی ہے اور آپس کے جھگڑوں کو ختم کرنے والی ہے۔ لیکن ان ہدایات کے بیان سے پہلے ایک اصولی بات سمجھ لیں:

جھگڑے ختم کرنے کی ایک شرط

اصولی بات یہ ہے کہ آپس کے جھگڑے ختم کرنے اور آپس میں محبت پیدا کرنے اور آپس میں اتفاق اور اتحاد پیدا کرنے کی ایک خاص شرط ہے، جب تک وہ شرط نہیں پائی جائے گی، اس وقت تک جھگڑے دور نہیں ہوں گے۔ آج ہر طرف سے یہ آواز بلند ہو رہی ہے کہ مسلمانوں میں اتحاد ہونا چاہئے، جھگڑے ختم ہونے چاہئیں، اور حتیٰ کہ جو لوگ جھگڑوں کا بیج بونے والے ہیں وہ بھی اتفاق اور اتحاد کا نعرہ لگاتے ہیں، لیکن پھر بھی اتحاد اور اتفاق قائم نہیں ہوتا، کیوں اتحاد قائم نہیں ہوتا؟ اس کے بارے میں ایک مرد درویش کی بات سن لیجیے، جس نے اس بیماری کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ کر اس بیماری کی تشخیص کی ہے۔ اور مرض کی صحیح تشخیص ہمیشہ اللہ والے ہی کرتے ہیں، کیونکہ ہر بیماری کی صحیح تشخیص اور اس کا صحیح علاج اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کے قلوب پر ہی وارد فرماتے ہیں۔

حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر

ہمارے سید الطائفہ شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس اللہ سرہ، جو ہمارے شیخ کے شیخ کے شیخ ہیں۔ اگر ان کے کوائف پوچھو تو وہ کسی مدرسے کے فارغ التحصیل بھی نہیں، باقاعدہ ضابطہ سند یافتہ عالم بھی نہیں، صرف کافیہ اور قدوری تک کتابیں پڑھے ہوئے تھے، لیکن جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے پر معرفت کے دروازے کھولتے ہیں تو ہزار علم و تحقیق کے شناور اس کے

آگے قربان ہو جاتے ہیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے علم کے پہاڑ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ علم کے پہاڑ بھی اپنی تربیت کے لیے، اپنے تزکیے کے لیے اور اپنے اخلاق کو درست کرانے کے لیے ان کے پاس جا کر زانوئے تلمذ طے کر رہے ہیں۔

اتحاد کے لیے دو شرطیں، تواضع اور ایثار

انہوں نے یہ عقدہ کھولا کہ جب سب لوگ اتحاد اور اتفاق کی کوشش کر رہے ہیں، اس کے باوجود اتحاد کیوں قائم نہیں ہو رہا ہے؟ اس کے جواب میں جو حکیمانہ بات حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمائی ہے، میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ اگر اس بات کو ہم لوگ پلے باندھ لیں ہمارے معاشرے کے سارے جھگڑے ختم ہو جائیں۔ فرمایا کہ

''اتحاد و اتفاق کا بنیادی راستہ یہ ہے کہ اپنے اندر دو چیزیں پیدا کرو، اگر یہ دو چیزیں پیدا ہو گئیں تو اتحاد قائم ہو جائے گا اور اگر ان میں سے ایک چیز بھی مفقود ہوئی تو کبھی اتحاد قائم نہیں ہوگا، وہ دو چیزیں یہ ہیں ایک تواضع، دوسرا ایثار''

''تواضع'' کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو یوں سمجھے کہ میری کوئی حقیقت نہیں، میں تو اللہ کا بندہ ہوں اور بندہ ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند ہوں، اور اپنی ذات میں میرے اندر کوئی فضیلت نہیں، میرا کوئی حق نہیں، لہٰذا اگر کوئی شخص میری حق تلفی کرتا ہے تو وہ کون سا برا کام کرتا ہے، میں تو حق تلفی کا ہی مستحق ہوں۔

اتحاد میں رکاوٹ ''تکبر''

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اتحاد اس لیے قائم نہیں ہوتا کہ ہر آدمی کے دل میں تکبر ہے، وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں بڑا ہوں، میرے فلاں حقوق ہیں، فلاں نے میری شان کے خلاف یہ بات کی ہے، فلاں نے میرے درجے کے خلاف کام کیا ہے، میری حق تلفی کی ہے، میرا حق یہ تھا کہ وہ میری تعظیم کرتا، لیکن اس نے میری تعظیم نہیں کی، میں اس کے گھر گیا، اس نے میری خاطر تواضع نہیں کی، اس تکبر کا نتیجہ یہ ہوا کہ جھگڑا کھڑا ہو گیا۔

تکبر کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑا سمجھا اور بڑا سمجھنے کے نتیجے میں اپنے لیے کچھ حقوق گھڑ لیے اور یہ سوچا کہ میرے درجے کا تقاضہ تو یہ تھا کہ فلاں شخص میرے ساتھ ایسا سلوک کرتا، جب دوسرے نے ایسا سلوک نہیں کیا تو اب دل میں شکایت ہو گئی، اور اس کے نتیجے میں گرہ بیٹھ گئی اور اس کے بعد

نفرت پیدا ہوگئی اور اس کے بعد اس کے ساتھ معاملات خراب کرنا شروع کر دیئے۔ لہٰذا جھگڑے کی بنیاد ''تکبر'' ہے۔

راحت والی زندگی کے لیے بہترین نسخہ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں تمہیں لذیذ اور راحت والی زندگی کا ایک نسخہ بتاتا ہوں، اگر تم اس نسخہ پر عمل کرلو گے تو پھر ان شاء اللہ کسی کی طرف سے دل میں کوئی شکوہ شکایت اور گلہ پیدا نہیں ہوگا۔ وہ یہ کہ دل میں یہ سوچ لو کہ یہ دنیا خراب چیز ہے اور اس کی اصل وضع ہی تکلیف پہنچانے کے لیے ہے، لہٰذا اگر مجھے کسی انسان یا جانور سے تکلیف پہنچتی ہے تو یہ تکلیف پہنچنا دنیا کی تخلیق فطرت کے عین مطابق ہے، اور اگر دنیا میں کسی کی طرف سے تمہیں اچھائی پہنچے تو اس پر تمہیں تعجب کرنا چاہئے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔

اچھی توقعات وابستہ نہ کریں

لہٰذا دنیا میں کسی بھی اپنے ملنے جلنے والے سے، چاہے وہ دوست ہو، یا رشتہ دار ہو، یا قریبی عزیز ہو، کسی سے اچھائی کی توقع قائم نہ کرو کہ یہ مجھے کچھ دے گا، یا یہ مجھے کچھ نفع پہنچائے گا، یا یہ میری عزت کرے گا، یہ میری مدد کرے گا، کسی بھی مخلوق سے کسی بھی قسم کی توقع قائم نہ کرو، اور جب کسی مخلوق سے نفع کی کوئی توقع نہیں ہوگی، پھر اگر کسی مخلوق نے کوئی فائدہ پہنچا دیا اور تمہارے ساتھ اچھا سلوک کرلیا تو اس سے تمہیں خوشی ہوگی، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ یا اللہ! آپ نے اپنے فضل سے اس کے دل میں بات ڈال دی جس کے نتیجے میں اس نے میرے ساتھ اچھا سلوک کیا۔

دشمن سے شکایت نہیں ہوتی

اور اگر کسی مخلوق نے تمہارے ساتھ بدسلوکی کی، تو اس سے تکلیف نہیں ہوگی، کیونکہ پہلے ہی سے اس سے کوئی اچھی توقع نہیں تھی۔ دیکھئے! اگر کوئی دشمن تمہیں کوئی تکلیف پہنچائے تو اس سے تمہیں کوئی شکایت ہوتی ہے؟ نہیں ہوتی، کیونکہ وہ تو دشمن ہی ہے، اس کا کام ہی تکلیف پہنچانا ہے۔ اس لیے اس کے تکلیف پہنچانے سے زیادہ صدمہ اور رنجش نہیں ہوتی، شکوہ اور گلہ نہیں ہوتا، شکوہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب کسی سے اچھائی کی توقع تھی، لیکن اس نے برائی کر لی۔ اس لیے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ساری مخلوق سے توقع مٹا دو۔

صرف ایک ذات سے توقع رکھیں

توقع تو صرف ایک ذات سے قائم کرنی چاہئے، اسی سے مانگو، اسی سے توقع رکھو، اسی سے امید رکھو، باقی ساری دنیا سے امیدیں قطع کر دو، صرف اللہ جل جلالہ سے امیدیں وابستہ کر لو۔ چنانچہ حضور اقدس ﷺ یہ دعا مانگا کرتے تھے:

((اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِيْ قَلْبِيْ رَجَاءَ كَ، وَاقْطَعْ رَجَائِيْ عَنْ مَّنْ سِوَاكَ)) (۱)

''اے اللہ! میرے دل میں اپنی امید ڈال دیجیے اور میری امیدیں اپنے سوا ہر ایک مخلوق سے ختم کر دیجیے''

اتحاد کی پہلی بنیاد ''تواضع''

اور جب انسان کے اندر تواضع ہوگی تو وہ اپنا حق دوسروں پر نہیں سمجھے گا کہ میرا کوئی حق دوسرے کے ذمے ہے، بلکہ وہ تو یہ سمجھے گا کہ میں تو اللہ کا بندہ ہوں، کوئی مقام اور کوئی درجہ نہیں، اللہ تعالیٰ جو معاملہ میرے ساتھ فرمائیں گے میں اس پر راضی ہوں۔ جب دل میں یہ تواضع پیدا ہوگی تو دوسرے سے توقع بھی قائم نہیں ہوگی۔ جب توقع نہیں ہوگی تو پھر دوسرے سے شکوہ شکایت بھی نہیں ہو گی، اور جب شکوہ نہیں ہوگا تو جھگڑا بھی پیدا نہیں ہوگا۔ لہٰذا اتفاق اور اتحاد کی پہلی بنیاد ''تواضع'' ہے۔

اتحاد کی دوسری بنیاد ''ایثار''

اتفاق اور اتحاد کی دوسری بنیاد ''ایثار'' ہے۔ یعنی مخلوق خدا کے ساتھ ایثار کا رویہ اختیار کرو۔ ''ایثار'' کے معنی یہ ہیں کہ دل میں یہ جذبہ ہو کہ میں اپنی راحت کی قربانی دے دوں اور اپنے مسلمان بھائی کو راحت پہنچا دوں۔ میں خود تکلیف اٹھا لوں لیکن اپنے مسلمان بھائی کو تکلیف سے بچا لوں۔ خود نقصان اٹھا لوں لیکن اپنے مسلمان بھائی کو نفع پہنچا دوں۔ یہ ایثار کا جذبہ اپنے اندر پیدا کر لو۔

اس نفع و ضرر کی دنیا میں
یہ ہم نے لیا ہے درسِ جنوں
اپنا تو زیاں تسلیم مگر
اوروں کا زیاں منظور نہیں

(۱) مختصر تاریخ دمشق (۸۹۵/۱)

اپنا نقصان کر لینا منظور ہے، لیکن اوروں کا نقصان منظور نہیں۔ یہی وہ سبق ہے جو نبی کریم ﷺ نے عطا فرمایا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ایثار

اور قرآن کریم نے انصاری صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایثار کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾(۱)

یعنی یہ انصاری صحابہ رضی اللہ عنہم ایسے ہیں کہ چاہے سخت تنگدستی اور مفلسی کی حالت ہو، لیکن اس حالت میں بھی دوسروں کے لیے ایثار کرتے ہیں۔ کیسے کرتے ہیں؟ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں کچھ مسافر آ گئے جو تنگدست تھے۔ ایسے موقع پر حضور اقدس ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرماتے کہ کچھ مہمان باہر سے آ گئے ہیں جو تنگدست ہیں، لہٰذا جن کو استطاعت ہو وہ اپنے ساتھ مہمان کو لے جائیں اور ان کے کھانے کا بندوبست کر دیں۔

ایک صحابی کا ایثار

چنانچہ اس موقع پر یہ ارشاد سن کر ایک انصاری صحابی رضی اللہ عنہ ایک مہمان کو اپنے گھر لے گئے، گھر جا کر بیوی سے پوچھا کہ کھانا ہے؟ مہمان آئے ہیں۔ بیوی نے جواب دیا کہ اتنا کھانا نہیں ہے کہ مہمان کو بھی کھلا سکیں، یا تو مہمان کھائیں گے یا ہم کھائیں گے، سب نہیں کھا سکتے۔ ان صحابی نے فرمایا کہ کھانا مہمان کے سامنے رکھ دو اور چراغ بجھا دو، چنانچہ بیوی نے کھانا مہمان کے سامنے رکھ دیا اور چراغ بجھا دیا، ان صحابی نے مہمان سے کہا کہ کھانا کھایئے، مہمان نے کھانا شروع کیا اور یہ صحابی ان کے ساتھ بیٹھ گئے، لیکن کھانا نہیں کھایا بلکہ اپنا خالی ہاتھ کھانے تک لے جاتے اور منہ تک لاتے، تاکہ مہمان یہ سمجھے کہ کھانا کھا رہے ہیں، حقیقت میں وہ خالی ہاتھ چلا رہے تھے۔ چنانچہ میاں بیوی اور بچوں نے رات بھوک میں گزاری اور مہمان کو کھانا کھلا دیا۔ اللہ تعالیٰ کو ان کا یہ انداز اتنا پسند آیا کہ قرآن کریم میں اس کا بیان فرما دیا:

﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾(۲)

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، چاہے خود ان پر تنگدستی کی حالت

---

(۱) الحشر: ۹

(۲) الحشر: ۹

ہو۔ خود بھوکا رہنا گوارا کر لیا، لیکن دوسرے کو راحت پہنچا دی اور اس کو کھانا کھلا دیا۔

ایثار کا مطلب

لہٰذا ایثار یہ ہے کہ اپنے اوپر تھوڑی سی تکلیف برداشت کر لے، لیکن اپنے مسلمان بھائی کا دل خوش کر دے۔ یاد رکھیے! جس کو اللہ تعالیٰ یہ صفت عطا فرماتے ہیں، اس کو ایمان کی ایسی حلاوت عطا فرماتے ہیں کہ دنیا کی ساری حلاوتیں اس کے سامنے ہیچ ہیں۔ جب انسان اپنی ذات پر تنگی برداشت کر کے دوسرے مسلمان بھائی کو خوش کرتا ہے اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ لاتا ہے تو اس کو جو لذت ہے اس کے آگے دنیا کی ساری لذتیں ہیچ ہیں۔ یہ دنیا معلوم نہیں کتنے دن کی ہے، پتہ نہیں کب بلاوا آ جائے، بیٹھے بیٹھے آدمی رخصت ہو جاتا ہے، اس لیے ایثار پیدا کرو، جب ایثار پیدا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے دلوں میں محبتیں پیدا فرما دیتے ہیں، اور ایثار کرنے والے کو اپنی نعمتوں سے نوازتے ہیں۔

ایک شخص کی مغفرت کا واقعہ

حدیث شریف میں آتا ہے کہ پچھلی امتوں میں ایک شخص تھا، جب اس کا انتقال ہو گیا اور اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش ہوا تو اس کے نامہ اعمال میں کوئی بڑی عبادت نہیں تھی، اللہ تعالیٰ نے نامہ اعمال لکھنے والے فرشتوں سے پوچھا کہ اس کے اعمال نامے میں کوئی نیکی ہے یا نہیں؟ فرشتوں نے جواب دیا کہ اس کے اعمال نامے میں کوئی بڑی نیکی تو نہیں ہے، البتہ ایک نیکی اس کی یہ ہے کہ جب کسی سے کوئی مال خریدتا تو مال بیچنے والے سے جھگڑتا نہیں تھا، بس جو پیسے اس نے بتا دیئے، اس سے تھوڑا کم کرایا اور مال خرید لیا۔

((سَهْلًا اِذَا بَاعَ، سَهْلًا اِذَا اشْتَرٰی))(۱)

اور جب مال بیچنے جاتا تو اس میں بھی نرمی کرتا اس پر ضد نہیں کرتا تھا کہ بس میں اتنے پیسے لوں گا، بلکہ جب یہ دیکھا کہ خریدنے والا غریب ہے تو پیسے کم کر دیئے۔ اسی طرح اگر اس کا قرضہ دوسرے پر ہوتا اور وہ دیکھتا کہ یہ اپنا قرضہ ادا نہیں کر پا رہا ہے تو اس کو معاف کر دیتا تھا۔

بس اس کی صرف یہ نیکی نامہ اعمال میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب یہ میرے بندوں کو

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول اللہ، باب ماجاء فی استقراض البیر......، رقم: ۱۲٤۱، مسند أحمد، رقم: ۱٤۱۳۱

قرض معاف کر دیتا تھا تو میں اس بات کا زیادہ مستحق ہوں کہ اس کو معاف کر دوں، لہٰذا میں نے اس کو معاف کر دیا۔ اس بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرما دی۔ یہ کیا چیز تھی؟ یہ ''ایثار'' تھا۔

خودغرضی ختم کردو

بہرحال حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اپنے اندر سے تکبر کو نکالو اور ایثار پیدا کر لو، تمام جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔ اور ''خودغرضی'' یہ ایثار کی ضد ہے، خودغرضی کا مطلب یہ ہے کہ انسان ہر وقت اپنی کائنات میں الجھا ہوا ہے کہ کس طرح مجھے پیسے زیادہ مل جائیں، کس طرح مجھے عزت زیادہ مل جائے، کس طرح مجھے شہرت مل جائے، کس طرح لوگوں کی نگاہ میں میرا درجہ بلند ہو جائے، دن رات اسی فکر میں حیران و سرگرداں ہے۔ یہ ہے ''خودغرضی'' ایثار اس کی ضد ہے۔

''تواضع'' کی ضد ہے ''تکبر'' لہٰذا اگر انسان تکبر اور خودغرضی چھوڑ دے اور تواضع اور ایثار اختیار کر لے تو پھر اتحاد اور محبت قائم ہو جائے گی، ان شاء اللہ، لہٰذا ہر مسلمان اس کو پلے باندھ لے۔ بہرحال ایک عمل تو یہ ہو گیا جو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا۔

پسندیدگی کا معیار ایک ہو

دوسری بات جو حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے بیان فرمائی جو درحقیقت تمام اخلاق فاضلہ کی بنیاد ہے، اگر یہ چیز ہمارے اندر پیدا ہو جائے تو سارے جھگڑے ہمارے اندر سے ختم ہو جائیں۔ وہ بات یہ ارشاد فرمائی:

((أَحِبَّ لِأَخِيكَ مَاتُحِبُّ لِنَفْسِكَ وَاكْرَهْ لِأَخِيكَ مَاتَكْرَهُ لِنَفْسِكَ))(۱)

یعنی اپنے بھائی کے لیے وہی پسند کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو، اور اپنے بھائی کے لیے وہی بات ناپسند کرو جو اپنے لیے ناپسند کرتے ہو۔ لہٰذا جب بھی کسی کے ساتھ کوئی معاملہ پیش آئے تو خود کو اس کی جگہ پر رکھ کر سوچ لو کہ اگر میں اس کی جگہ پر ہوتا اور یہ میری جگہ پر ہوتا اور میرے ساتھ یہ معاملہ کرتا تو میں کس بات کو پسند کرتا اور کس بات کو ناپسند کرتا۔ لہٰذا جس بات کو میں پسند کرتا مجھے اس کے ساتھ بھی وہی معاملہ کرنا چاہئے، اور جو چیز میں ناپسند کرتا مجھے بھی اس کے ساتھ وہ چیز نہیں کرنی چاہئے۔ بہترین پیمانہ ہے کہ اس کے ذریعہ آپ دوسروں کے ساتھ کیے گئے ہر معاملے کو جانچ سکتے ہیں۔

---

(۱) مسند احمد اور کنز العمال میں اس حدیث کے یہ الفاظ منقول ھیں: "تحب للناس ما تحب لنفسك وتكره لهم ما تكره لنفسك" كنز العمال، رقم: ۱۳۷۵ (۱/۲۷۹)، مسند أحمد، رقم: ۲۲۷۸٤

دوہرے پیمانے ختم کردیں

ہمارے معاشرے کی بہت بڑی بیماری یہ ہے کہ ہم نے دوہرے پیمانے بنا رکھے ہیں، اپنے لیے معیار کچھ اور ہے اور دوسرے کے لیے معیار کچھ اور ہے اپنے لیے جو بات پسند کرتے ہیں وہ دوسروں کے لیے پسند نہیں کرتے۔ آپ ذرا غور کر کے دیکھیں کہ اگر ہر شخص حضور اقدس ﷺ کی اس نصیحت پر عمل کرنا شروع کر دے کہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے تو پھر کوئی جھگڑا باقی نہیں رہے گا۔ اس لیے کہ اس صورت میں ہر شخص ایسے عمل سے پرہیز کرے گا جو دوسروں کو تکلیف دینے والا ہوگا۔

بہرحال، اپنے درمیان اتفاق اور اتحاد پیدا کرنے کی یہ چند اصولی باتیں ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ان کی سمجھ بھی عطا فرمائے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

☆☆☆

خاندانی اختلافات کا دوسرا حل

صبر و برداشت ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

گزشتہ اتوار کو خاندانی اختلافات اور ان کو ختم کرنے کے بارے میں کچھ عرض کیا تھا۔ ایک اور حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ان اختلافات اور جھگڑوں کو ختم کرنے کا ایک اور طریقہ بیان فرمایا ہے۔ وہ حدیث یہ ہے:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((اَلْمُسْلِمُ اِذَا كَانَ مُخَالِطًا النَّاسَ وَ يَصْبِرُ عَلٰى أَذَاهُمْ خَيْرٌ مِنَ الْمُسْلِمِ الَّذِيْ لَا يُخَالِطُ النَّاسَ وَلَا يَصْبِرُ عَلٰى أَذَاهُمْ))(۱)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ ایک مسلمان وہ ہے جو لوگوں سے الگ تھلگ ہو کر بیٹھ گیا، لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی، مثلاً وہ کسی مسجد میں یا مدرسہ میں یا عبادت گاہ میں بیٹھ گیا تاکہ لوگوں سے سابقہ پیش نہ آئے، اور یہ سوچا کہ میں تنہائی میں عبادت کرتا رہوں گا۔ دوسرا مسلمان وہ ہے جس نے تنہائی اختیار نہیں کی، بلکہ لوگوں سے ملا جلا رہا، لوگوں سے تعلقات بھی ہیں، رشتہ داریاں اور دوستیاں بھی ہیں، اور ان کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا بھی ہے، اور ان کے ساتھ ہر قسم کے معاملات بھی کرتا ہے، اور پھر ساتھ رہنے اور ان کے ساتھ اپنے معاملات کرنے کے نتیجے میں لوگوں سے تکلیفیں بھی پہنچتی ہیں، اور وہ ان تکلیفوں پر صبر کرتا ہے۔ فرمایا کہ یہ

☆ اصلاحی خطبات (۱۱/۲۰۶ تا ۲۳۸) بعد از نمازِ عصر، جامع دار العلوم، کراچی

(۱) سنن الترمذی، کتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله، باب منه، رقم: ۲۴۳۱، سنن ابن ماجه، کتاب الفتن، باب الصبر علی البلاء، رقم: ۴۰۲۲، مسند أحمد، رقم: ۴۷۸۵

دوسرا مسلمان جو لوگوں کے ساتھ مل کر رہتا ہے اور ان کی تکالیف پر صبر کرتا ہے، یہ مسلمان بدر جہا بہتر ہے اس مسلمان سے جو لوگوں سے الگ تھلگ رہتا ہے اور اس کے نتیجے میں اس کو تکالیف پر صبر کرنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی۔

اسلام میں رہبانیت نہیں

یہ آپ حضرات کو معلوم ہی ہے کہ ہمارے دین نے عیسائی مذہب کی طرح رہبانیت کی تعلیم نہیں دی، عیسائیوں کے یہاں اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک انسان اپنے سارے دنیاوی کاروبار کو نہ چھوڑے، اور اپنے تمام تعلقات کو خیر آباد نہ کہے اور رہبانیت کی زندگی نہ گزارے، لیکن حضور اقدس ﷺ نے ہمیں یہ تعلیم دی کہ لوگوں کے ساتھ ملے جلے رہو اور پھر لوگوں سے پہنچنے والی تکلیفوں پر صبر کریں۔

ساتھ رہنے سے تکلیف پہنچے گی

اگر آپ غور کریں تو یہ عجیب و غریب تعلیم ہے، کیونکہ اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے لوگوں کے ساتھ ملے جلے رہنے کو اور ان سے پہنچنے والی تکلیف کو ایک ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ جس سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ یہ دونوں کام ایک دوسرے کے لیے لازم اور ملزوم ہیں، یعنی جب تم لوگوں کے ساتھ ملو جلو گے اور ان کے ساتھ رہو گے تو ان سے تمہیں ضرور تکلیف پہنچے گی، اور جب تمہارا کسی بھی دوسرے انسان سے واسطہ پیش آئے گا تو یہ ممکن نہیں ہے کہ اس سے تمہیں کبھی بھی کوئی تکلیف نہ پہنچے، لازماً تکلیف پہنچے گی، چاہے وہ تمہارا کتنا ہی قریبی عزیز ہو، اور چاہے وہ کتنا ہی قریبی دوست ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ تکلیف کیوں پہنچے گی؟ اس کو بھی سمجھ لینا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ انسان کے چہرے میں

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب سے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا، اس وقت سے لے کر آج تک اربوں کھربوں انسانوں کو پیدا فرمایا، آگے قیامت تک پیدا ہوتے رہیں گے، اور ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایک چہرہ عطا فرمایا ہے جو بالشت بھر کا ہے، اس میں آنکھ بھی ہے، ناک بھی ہے، منہ بھی ہے، دانت بھی ہیں، اور کان بھی ہیں، رخسار بھی ہیں، اور ٹھوڑی بھی ہے، ہر انسان کے چہرے میں یہ چیزیں موجود ہوتی ہیں۔ لیکن اتنے اربوں، کھربوں، پدموں انسانوں میں کسی دو

انسانوں کا چہرہ سو فیصد ایک جیسا نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ دیکھئے کہ ہر انسان کے چہرے کی لمبائی ایک بالشت ہے، اور یہ بھی نہیں ہے کہ کسی انسان کی ناک ہو کسی کی ناک نہ ہو، کسی کے کان ہوں کسی کے نہ ہوں، کسی کی آنکھیں ہوں کسی کی نہ ہوں، بلکہ تمام انسانوں کے چہرے میں یہ سب چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ لیکن کسی دو انسانوں کا چہرہ ایک جیسا نہیں ملے گا، بلکہ ہر انسان کا چہرہ دوسرے سے مختلف ہوگا۔ اور یہ اختلاف صرف ان انسانوں کے چہروں میں نہیں ہے جو اب تک پیدا ہو چکے ہیں، بلکہ جو نئے انسان پیدا ہو رہے ہیں، ان کے اندر بھی یہ اختلاف موجود ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اب جو نیا انسان پیدا ہوگا وہ کسی سابقہ انسان کی کاپی اور نقل ہوگا، ایسا نہیں ہے، بلکہ نیا پیدا ہونے والا انسان اپنا چہرہ خود لے کر آئے گا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ایک انسان کو دوسرے انسان سے ایسا ممتاز کر دیا کہ چہرے کے نقوش دیکھ کر پتہ چل جاتا ہے کہ یہ فلاں انسان ہے اور یہ فلاں انسان ہے۔

رنگوں کے اختلاف میں قدرت کا نظارہ

اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ ہے کہ مختلف نسلوں کے انسانوں کے نقوش میں ایک چیز ''مابہ الاشتراک'' ہے اور ایک ''مابہ الامتیاز'' ہے۔ یعنی ایک چیز ایسی ہے جو سب میں مشترک ہے، مثلاً افریقی نسل کے جو انسان ہوں گے، وہ دور سے دیکھ کر پہچان لیے جائیں گے کہ یہ افریقی نسل کا ہے۔ ''یورپ'' والا الگ پہچان لیا جائے گا کہ یہ یورپ کا ہے، باوجودیکہ ان کے درمیان بھی آپس میں فرق ہے، کوئی دو فرد ایک جیسے نہیں ہیں۔ لہٰذا ''مابہ الاشتراک'' بھی موجود اور ''مابہ الامتیاز'' بھی موجود۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت کا نظارہ ہے، انسان کہاں اس قدرت کا احاطہ کر سکتا ہے۔

انگلیوں کے پوروں میں اللہ کی قدرت

اور چیزوں کو چھوڑیئے! انگلیوں کے پوروں کو لے لیں، ہر انسان کے ہاتھ کی انگلیوں کے پورے دوسرے انسان کے پورے سے مختلف ہیں، چنانچہ کاغذات پر بے شمار ضروریات کے لیے دستخط لینے کے ساتھ ساتھ انگوٹھا بھی لگوایا جاتا ہے، اس لیے کہ انگوٹھے کے پورے میں جو چھوٹی چھوٹی لکیریں ہیں، وہ کسی ایک انسان کی لکیریں دوسرے انسان کی لکیروں سے نہیں ملتیں، ہر ایک کی لکیریں علیحدہ ہیں۔ اگر ویسے دو انسانوں کے انگوٹھے ملا کر دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ کوئی فرق نہیں ہے، لیکن یہ بات عالمی طور پر مُسلَّم اور طے شدہ ہے کہ دو انسانوں کے انگوٹھوں کی لکیریں ایک جیسی نہیں ہیں، لہٰذا جب کسی انسان نے کسی کاغذ پر انگوٹھا لگا دیا تو یہ متعین ہو گیا کہ یہ فلاں انسان کے

انگوٹھے کے نشان ہیں، کیونکہ دوسرے انسان کے انگوٹھے کے نشان اس سے مختلف ہوں گے۔

انگوٹھے کی لکیروں کے ماہرین کا دعویٰ

اب تو ایسے ماہرین بھی پیدا ہو گئے ہیں جن کا یہ دعویٰ ہے کہ ہمارے سامنے کسی انسان کے انگوٹھے کے نشان رکھ دیئے جائیں، ہم اس کے نشانات کو بڑا کر کے دیکھیں گے، اور اس کے ذریعے ہم اس انسان کے سر سے لے کر پاؤں تک سارے خدوخال کا نقشہ کھینچ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ لکیریں یہ بتا دیتی ہیں کہ اس انسان کی آنکھ کیسی ہوگی، اس کی ناک کیسی ہوگی، اس کے دانت کیسے ہوں گے، اور ہاتھ کیسے ہوں گے؟

اللہ تعالیٰ انگوٹھے کے پورے کو دوبارہ بنانے پر قادر ہیں

میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ قرآن کریم کی سورۃ ''قیامۃ'' میں ایک آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے کافروں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ بَلٰى قَادِرِيْنَ عَلٰى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ﴾(۱)

کیا یہ (کافر) انسان یہ سمجھتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں جمع نہیں کر سکیں گے۔ یہ کافر جو آخرت کے منکر ہیں، وہ یہ کہا کرتے تھے کہ جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے اور ہماری ہڈیاں تک گل جائیں گی، پھر کس طرح سے ہمیں دوبارہ زندہ کیا جا سکے گا؟ اور کون زندہ کرے گا؟

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں دوبارہ جمع نہیں کر سکیں گے؟ کیوں نہیں! ہم تو اس پر بھی قادر ہیں کہ اس کی انگلیوں کے پوروں کو بھی ویسا ہی دوبارہ بنا دیں، اس کائنات کا بڑے سے بڑا سائنٹسٹ بھی یہ نہیں کر سکتا کہ ویسا ہی انگوٹھا بنا دے، لیکن ہم اس پر قادر ہیں۔

آیت سن کر مسلمان ہونا

اللہ تعالیٰ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ ہم اس پر قادر ہیں کہ اس کا چہرہ دوبارہ بنا دیں، اس کے ہاتھ دوبارہ بنا دیں، اس کے پاؤں دوبارہ بنا دیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر پوروں کا ذکر فرمایا کہ

(۱) القیامۃ: ۳، ٤

پورے کو دوبارہ بنانے پر قادر ہیں۔

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک نومسلم سائنٹسٹ اس آیت کو پڑھ کر مسلمان ہو گیا، اور اس نے یہ کہا کہ یہ بات سوائے خالق کائنات کے دوسرا نہیں کہہ سکتا کہ ہم اس پورے کو دوبارہ بنا سکتے ہیں، یہ بات صرف وہی کہہ سکتا ہے جس نے اس کائنات کو بنایا ہو، جس نے انسان کو پیدا کیا ہو، جس نے انسان کے ایک ایک عضو کو بنایا ہو۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ

بہرحال! کوئی انسان اپنی ظاہری شکل وصورت میں دوسرے انسان جیسا نہیں ہے، بلکہ اگر دو انسان ایک جیسے ہو جائیں تو اس پر تعجب ہوتا ہے کہ دیکھیں یہ دو انسان ہم شکل ہیں، الگ الگ ہونے پر کوئی تعجب نہیں ہوتا، اس لیے کہ ہر انسان دوسرے سے الگ ہے۔ حالانکہ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ الگ الگ کیسے ہیں، اگر سارے انسان ایک دوسرے کے ہم شکل ہوتے تو تعجب ک بات نہ ہوتی، لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کو دیکھئے کہ اس نے اربوں کھربوں انسان پیدا فرما دیئے، مگر ہر ایک کی صورت دوسرے سے مختلف ہے، مرد کی صورت الگ ہے، عورت کی صورت الگ ہے، ہر ایک صنف میں ایک دوسرے سے امتیاز بھی موجود ہے، ایک دوسرے سے اشتراک بھی موجود ہے۔

دو انسانوں کے مزاج میں اختلاف

لہٰذا جب دو انسانوں کے چہرے ایک جیسے نہیں ہو سکتے، تو پھر دو انسانوں کی طبیعتیں کیسے ایک جیسی ہو سکتی ہیں، جب ظاہر ایک جیسا نہیں تو پھر ان کی طبیعتوں میں بھی فرق ہو گا، کسی کی طبیعت کیسی ہے، کسی کی کیسی ہے۔ کسی کا مزاج کیسا ہے، کسی کا مزاج کیسا ہے۔ کسی کی پسند کچھ ہے، کسی کی کچھ ہے۔ ہر انسان کی پسند مختلف، ہر انسان کا مزاج مختلف، ہر انسان کی طبیعت مختلف، لہٰذا طبیعتوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے کبھی یہ نہیں ہو سکتا کہ دو آدمی ایک ساتھ زندگی گزار رہے ہوں اور ایک ساتھ رہتے ہوں، اور کبھی بھی ان میں سے ایک کو دوسرے سے تکلیف نہ پہنچے، ایسا ہونا ممکن ہی نہیں، طبیعت مختلف ہونے کی وجہ سے ایک کو دوسرے سے ضرور تکلیف پہنچے گی، کبھی جسمانی تکلیف پہنچے گی، کبھی روحانی تکلیف پہنچے گی، کبھی نفسیاتی تکلیف پہنچے گی، کبھی دوسرے کی طرف سے خلاف طبع بات ہو گی جو دوسرے کو بری لگے گی۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مزاج مختلف تھے

دیکھئے! اس کائنات میں انبیاء علیہم السلام کے بعد حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے زیادہ افضل مخلوق اس زمین و آسمان کی نگاہوں نے نہیں دیکھی۔ انبیاء علیہم السلام کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے زیادہ افضل، ان سے زیادہ متقی، ان سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والے، ان سے زیادہ ایثار کرنے والے، ان سے زیادہ ایک دوسرے پر جان نثار کرنے والی کوئی مخلوق پیدا نہیں ہوئی اور نہ آئندہ پیدا ہوگی۔ لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طبیعتیں بھی مختلف تھیں، ان کے آپس کے مزاج میں بھی فرق تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ازواج مطہرات

روئے زمین پر کوئی بیوی اپنے شوہر کے لیے اتنی وفادار اور اتنا خیال رکھنے والی نہیں ہوسکتی جتنی کہ امہات المؤمنین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال رکھنے والی تھیں، لیکن ان کو بھی طبیعت کے خلاف باتیں پیش آجاتی تھیں، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بعض اوقات طبیعت کے خلاف ہونے کی وجہ سے ان سے کچھ گرانی اور ناراضگی ہو جاتی تھی، چنانچہ ایک مرتبہ اس گرانی کی وجہ سے ایک مہینہ ایسا گزرا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں قسم کھا لی تھی کہ میں ایک ماہ تک اپنی ازواج مطہرات کے پاس نہیں جاؤں گا۔(۱)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ناراضگی

اور پھر یہ نہیں کہ ازواج مطہرات کی طرف سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو گرانی ہوتی تھی بلکہ بعض اوقات ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے گرانی ہو جاتی تھی، چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ اے عائشہ! مجھے پتہ چل جاتا ہے جب تم مجھ سے راضی ہوتی ہے اور جب تم مجھ سے ناراض ہوتی ہو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ کیسے؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم مجھ سے خوش ہوتی ہو تو قسم کھاتے وقت یہ کہتی ہو "ورب محمد" یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پروردگار کی قسم" اور جب مجھ سے ناراض ہوتی ہو تو قسم کھاتے وقت یہ کہتی ہو "ورب ابراہیم" ابراہیم علیہ السلام کے پروردگار کی قسم۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا:

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب هجرة النبی نساءه فی غیر بیوتهن، رقم: ۴۸۰۳، صحیح مسلم، کتاب الطلاق، باب فی الإیلاء واعتزال النساء، رقم: ۲۷۰۸

"اِنِّیْ لَا اَھْجُرُ اِلَّا اسْمَكَ" (۱)

"یا رسول اللہ! ایسے موقع پر میں صرف آپ ﷺ کا نام ہی چھوڑتی ہوں، لیکن آپ ﷺ کی محبت دل سے جدا نہیں ہوتی"

اب دیکھئے! سرکار دو عالم ﷺ سے زیادہ شفیق و مہربان کوئی اور ہوسکتا ہے؟ خاص طور پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ آپ ﷺ کی محبت کا جو عالم تھا وہ کوئی مخفی چیز نہیں، لیکن اس کے باوجود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی بعض اوقات آپ ﷺ سے کچھ گرانی پیدا ہو جاتی تھی، اور اس گرانی اور ناراضگی کا احساس نبی کریم ﷺ کو بھی ہو جاتا تھا۔

میاں بیوی کے تعلق کی حیثیت سے ناراضگی

البتہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ حضور اقدس ﷺ کو تو تکلیف پہنچانا معاذ اللہ کفر ہے، تو اگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کو تکلیف پہنچی تو یہ کتنی بری بات ہوئی۔ بات دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حیثیتیں الگ الگ رکھی ہیں، لہٰذا حضور اقدس ﷺ کو جو گرانی ہوتی تھی وہ ایک شوہر ہونے کی حیثیت سے ہوتی تھی، جس طرح بیوی کو شوہر پر ناز ہوتا ہے، ایسے ہی شوہر کو بھی بیوی پر ناز ہوتا ہے، اس ناز کے عالم میں اس قسم کی ناراضگی بھی ہو جایا کرتی تھی۔ اس کا منصب رسالت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مزاجوں میں اختلاف

بہرحال! حضور اقدس ﷺ اور آپ کی ازواج مطہرات کے درمیان بھی خلاف طبع امور پیدا ہو جاتے تھے۔ اور آگے بڑھیے۔ حضرت صدیق اکبر اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہما جن کو "شیخین" کہا جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے بعد ان دونوں بزرگوں سے زیادہ افضل انسان اس روئے زمین پر پیدا نہیں ہوئے۔ اور حضور اقدس ﷺ کے ساتھ ان دونوں کے تعلق کا عالم یہ تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ ان دونوں کے نام ہمیشہ ایک ساتھ آیا کرتے تھے۔ چنانچہ ہم یوں کہا کرتے تھے:

"جَاءَ اَبُوْبَکْرٍ وَعُمَرُ ذَھَبَ اَبُوْبَکْرٍ وَعُمَرُ خَرَجَ اَبُوْبَکْرٍ وَعُمَرُ"

جہاں نام آ رہا ہے دونوں کا ایک ساتھ آ رہا ہے۔ اس طرح یک جان دو قالب تھے، ہر وقت

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب غیرة النساء ووجدھن، رقم: ٤٨٢٧، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فی فضائل عائشة، رقم: ٤٤٦٩، مسند أحمد، رقم: ٢٣١٨٢

ان دونوں کا نام سامنے ہوتا۔ جہاں حضور اقدس ﷺ کو مشورہ کرنے کی ضرورت پیش آتی، فرماتے ذرا ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کو بلاؤ، کبھی دونوں میں جدائی کا تصور نہیں ہوتا تھا۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی عزت کرنے کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ آپ میری زندگی کی ساری عبادتیں مجھ سے لے لیجیے اور سارے اعمال مجھ سے لے لیں اور وہ ایک رات جو آپ نے حضور اقدس ﷺ کے ساتھ غارِ ثور میں گزاری ہے وہ مجھے دے دیجیے۔ (۱)

دونوں کے درمیان عظمت اور محبت کا یہ عالم تھا، لیکن دونوں کی طبیعتوں میں اختلاف تھا جس کی وجہ سے بعض اوقات ان کے درمیان اختلاف بھی ہو جاتا تھا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان اختلاف کا ایک واقعہ

چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ ان دونوں کے درمیان بات چیت ہو رہی تھی، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کوئی بات کہہ دی جس کی وجہ سے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ناراض ہو کر چل دیئے، اب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ان کو منانے کے لیے اور سمجھانے کے لیے ان کے پیچھے پیچھے چل دیئے، چلتے چلتے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے گھر میں داخل ہو گئے اور دروازہ بند کر لیا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جب یہ دیکھا کہ یہ تو بہت زیادہ ناراض ہو گئے ہیں تو حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضور اقدس ﷺ ان کے چہرے کو دیکھ کر سمجھ گئے یا بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو خبر دے دی، چنانچہ ابھی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ حضور اقدس ﷺ کی مجلس کی طرف آ رہے تھے کہ حضور اقدس ﷺ نے ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جو مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ جو تمہارے دوست آ رہے ہیں، یہ آج کسی سے جھگڑا کر کے آ رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ مجلس میں آ کر بیٹھ گئے۔

دوسری طرف جب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جنہوں نے گھر میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا تھا، جب تنہائی میں پہنچے تو ان کو بڑی شرمندگی اور ندامت ہوئی کہ میں نے یہ بہت برا کیا کہ اول تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ناراضگی کا اظہار کیا، پھر جب وہ میرے پیچھے آئے تو میں نے گھر میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا، چنانچہ گھر سے باہر نکلے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پیچھے چل پڑے کہ جا کر ان کو مناؤں، جب حضور اقدس ﷺ کی مجلس میں پہنچے تو دیکھا کہ حضور ﷺ بھی تشریف فرما ہیں

(۱) البداية والنهاية (۳/ ۱۸۰)، حلية الأولياء (۱/ ۳۳)

اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بھی بیٹھے ہیں۔ مجلس میں آکر اپنی ندامت اور شرمندگی کا اظہار شروع کر دیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھ سے غلطی ہوگئی۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے غلطی ہوئی تھی، ان سے زیادہ غلطی نہیں ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو معاف کر دیجیے، اصل میں غلطی میری تھی۔ اس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے خطاب کرتے ہوئے عجیب وغریب جملہ ارشاد فرمایا، فرمایا:

> ''کیا میرے ساتھی کو میرے لیے چھوڑو گے یا نہیں؟ یہ وہ شخص ہے کہ جب میں نے یہ کہا تھا ''اے لوگو! میں تم سب کے لیے اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں۔ اس وقت تم سب نے کہا تھا کہ "کَذَبْتَ" صرف اس نے کہا تھا "صَدَقْتَ" یہ تنہا وہ شخص تھا جس نے کہا تھا کہ تم سچ کہتے ہو''(۱)

بہر حال! صدیق اکبر اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہما جیسے انسان جن کا ذکر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ایک ساتھ آتا تھا، ان کی طبیعتوں میں اور مزاجوں میں بھی اختلاف تھا جس کے نتیجے میں ان کے درمیان بھی اس قسم کے واقعات پیش آئے۔

مزاجوں کا اختلاف حق ہے

اس سے معلوم ہوا کہ کوئی دو انسان ایسے نہیں ہیں جن کی طبیعتیں ایک جیسی ہوں، جیسا تم چاہتے ہو دوسرا بھی ویسا ہی ہو، یہ نہیں ہوسکتا۔ کوئی باپ یہ چاہے کہ میرا بیٹا سو فیصد میری مرضی کے مطابق ہو جائے، نہیں ہوسکتا، کوئی بیٹا یہ چاہے کہ میرا باپ سو فیصد میری مرضی کے مطابق ہو جائے، نہیں ہوسکتا، کوئی شوہر یہ چاہے کہ میری بیوی سو فیصد میری مرضی کے مطابق ہو جائے، نہیں ہوسکتی، کوئی بیوی یہ چاہے کہ میرا شوہر سو فیصد میری مرضی کے مطابق ہو جائے، نہیں ہوسکتا۔

صبر نہیں کریں گے تو لڑائیاں ہوں گی

لہٰذا جب آدمیوں کے ساتھ رہنا ہوگا تو پھر تکلیفیں بھی پہنچیں گی، آدمیوں کے ساتھ رہنا اور ان سے تکلیفیں پہنچنا یہ دونوں لازم اور ملزوم ہیں، ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کیا ہی نہیں جاسکتا۔ لہٰذا جب آدمیوں کے ساتھ رہنا ہے تو یہ سوچ کر رہنا ہوگا کہ ان سے مجھے تکلیف بھی پہنچے گی اور اس تکلیف پر مجھے صبر بھی کرنا ہوگا، اگر صبر نہیں کریں گے تو لڑائیاں، جھگڑے، فتنے اور فساد ہوں

(۱) صحیح البخاری، کتاب تفسیر القرآن، باب قل یا أیها الناس إني رسول الله إلیکم جمیعا، رقم: ۴۲۷۴

گے، اور یہ چیزیں وہ ہیں جو دین کو مونڈ دینے والی ہیں۔

لہٰذا جس کسی سے کوئی تعلق ہو، چاہے وہ تعلق رشتہ داری کا ہو، چاہے وہ تعلق دوستی کا ہو، چاہے وہ زوجیت کا تعلق ہو، لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ان تعلقات میں تکلیفیں بھی پہنچیں گی، اور ان تکلیفوں پر مجھے صبر کرنا ہوگا، اور ان تکلیفوں کو مستقل ناچاقی کا ذریعہ نہیں بناؤں گا۔ ٹھیک ہے ساتھ رہنے کے نتیجے میں تلخی بھی تھوڑی بہت ہو جاتی ہے، لیکن اس تلخی کو مستقل ناچاقی اور منافرت کا ذریعہ بنانا ٹھیک نہیں۔

تکالیف سے بچنے کا طریقہ

اب سوال یہ ہے کہ جب دوسروں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے تکلیف پہنچ رہی ہے تو اس تکلیف پر اپنے آپ کو کیسے تسلی دیں؟ اس تکلیف سے اپنے آپ کو کیسے بچائیں؟ اور طبیعت کے خلاف ہونے کے باوجود آپس میں کیسے محبتیں پیدا کریں؟ اس کا نسخہ بھی جناب رسول اللہ ﷺ نے بتلا دیا، کوئی بات آپ تشنہ چھوڑ کر نہیں گئے۔ چنانچہ حضور اقدس ﷺ نے میاں بیوی کے تعلق کے بارے میں بیان فرمایا، کیونکہ سب سے زیادہ خلافِ طبع امور میاں بیوی کے تعلقات میں ہی پیش آتے ہیں، اس لیے کہ جتنا قرب زیادہ ہوگا، اتنا ہی طبیعت کے خلاف باتیں پیش آنے کا بھی امکان ہوگا، اور میاں بیوی کے درمیان جتنا قرب ہوتا ہے وہ کسی اور رشتے میں نہیں ہوتا۔ چونکہ اس تعلق میں دوسرے تعلق کے مقابلے میں تکلیف پہنچنے کے امکانات زیادہ ہیں، اس لیے اس کے بارے میں جناب رسول اللہ ﷺ نے ایک نسخہ کیمیا بیان فرمادیا:

((لَایَفْرَكْ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً اِنْ كَرِهَ مِنْهَا خُلُقًا رَضِيَ مِنْهَا آخَرَ))(۱)

یعنی کوئی مومن مرد کسی مومنہ عورت سے بغض نہ رکھے، مطلب یہ ہے کہ کوئی شوہر اپنی بیوی سے مستقل بغض نہ رکھے۔ کیونکہ اگر وہ اپنی بیوی کی کسی بات کو ناپسند کرے گا تو دوسری کسی بات کو پسند بھی کرے گا۔ یعنی جب بیوی سے طبیعت کے خلاف کوئی معاملہ پیش آتا ہے تو تم ناراض ہوتے ہو اور بُرا مناتے ہو، اور اسی بات کو لیے بیٹھے رہتے ہو کہ یہ ایسی ہے، یہ یوں کرتی ہے، یوں کرتی ہے، اس میں یہ خرابی ہے، یہ خرابی ہے۔ خدا کے لیے یہ دیکھیں کہ اس کے اندر کچھ اچھائیاں بھی تو ہوں گی، لہٰذا جب بیوی سے کوئی بات سامنے آئے جو تمہیں بری لگ رہی ہے تو اس وقت اس کی اس بات کا تصور کریں جو آپ کو پسند ہے۔ جب اچھائی کا تصور کریں گے تو اس برائی کے احساس میں کمی آئے گی۔

(۱) صحیح مسلم، کتاب الرضاع، باب الوصیة بالنساء، رقم: ۲۶۷۲، مسند أحمد، رقم: ۸۰۱۳

صرف اچھائیوں کی طرف دیکھیں

یاد رکھئے! دنیا میں کوئی انسان سراپا سیاہ یا سراپا سفید نہیں ہوتا، کوئی سراپا خیر یا سراپا شر نہیں ہوتا، اگر کوئی برا ہے تو اس میں کچھ نہ کچھ بھلائی بھی ضرور ہوگی، اگر بھلا ہے تو اس میں کچھ برائی بھی ضرور ہوگی۔ اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم اپنی بیوی کی اچھائی کی طرف دھیان کریں، اس کے نتیجے میں تمہیں نظر آئے گا کہ یہ بات اگرچہ اس کے اندر تکلیف دِہ ہے، لیکن دوسری باتیں میری بیوی کے اندر قابل قدر اور قابل تعریف ہیں۔ یہ سوچنے سے صبر آجائے گا۔

حضور اقدس ﷺ نے ایک صاحب کا بڑا اچھا علاج لیا۔ وہ اس طرح کہ ایک صاحب حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی بیوی کی شکایت کرنے لگے کہ اس میں فلاں عادت بڑی خراب ہے۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اگر اتنی خراب ہے کہ تمہارے لیے ناقابل برداشت ہے تو اس کو طلاق دے دو۔ اب اس کا دماغ ٹھیک ہوگیا اور اس نے سوچا کہ اگر میں نے اس کو طلاق دے دی اور وہ چلی گئی تو مجھ پر کیا گزرے گی۔ اس لیے اس نے حضور ﷺ سے کہا کہ یا رسول اللہ! اس کے بغیر صبر بھی نہیں آتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا پھر اس کو روکے رکھو۔(۱)

یعنی جب اس کے اندر خرابی ہے، لیکن اس کے بغیر صبر بھی نہیں آتا تو اس کا علاج اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ اس کو روکے رکھیں اور اس کی اس خرابی کو برداشت کریں، البتہ اپنی طرف سے اس کی اصلاح کی جتنی کوشش تم سے ہوسکتی ہے وہ کرلو۔

بیوی کی اچھائیوں کا تصور کیجئے

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اس نے حضور اقدس ﷺ کے سامنے اپنی بیوی کی خرابی بیان کی تو آپ نے فوراً اس سے یہ کہہ دیا کہ اس کو طلاق دے دو۔ آپ ﷺ نے اس کو ایک دم سے طلاق دینے کا مشورہ کیوں دے دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے طلاق دینے کا مشورہ اس لیے دیا کہ دراصل اس شخص کا سارا دھیان اپنی بیوی کی برائی کی طرف لگا ہوا تھا، اس کی وجہ سے اس کے دل میں اس کی برائی اس طرح بیٹھ گئی تھی کہ اس کا اپنی بیوی کی اچھائیوں کی طرف دھیان ہی نہیں جارہا تھا۔ اس لیے آپ ﷺ نے اس کو آخری بات کہہ دی کہ اگر یہ تمہاری بیوی اتنی بری ہے تو اس کو طلاق دے کر الگ کردو۔ اب طلاق کا سن کر اس کے دماغ میں یہ آیا کہ میری بیوی میرا یہ کام کرتی

(۱) سنن النسائی، کتاب الطلاق، باب ماجاء فی الخلع، رقم: ۳٤۱۱

ہے، یہ کام کرتی ہے، میرے لیے وہ اتنی فائدہ مند ہے، اگر میں نے طلاق دے دی تو یہ سارے فائدے جاتے رہیں گے، تو میں پھر کیا کروں گا اور کیسے زندگی گزاروں گا۔ اس لیے فوراً اس نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ! مجھے اس کے بغیر صبر بھی نہیں ہوتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اچھا تو پھر اس کو روکے رکھو۔

برائیوں کی طرف دھیان کرنے کا نتیجہ

بات دراصل یہ ہے کہ جب کسی کی برائیاں تمہارے دل میں بیٹھ جاتی ہیں اور اس کی برائی کی طرف دھیان لگ جاتا ہے تو پھر اس کی اچھائیوں سے آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ لہٰذا اس کی اچھائیوں کا تصور کریں، اور جب اچھائیوں کا تصور کریں گے تو اس کی قدر دل میں بیٹھے گی اور عافیت محسوس ہوگی۔ اس وقت پتہ چلے گا کہ تکلیف تو پہنچنی ہے، کوئی نہ کوئی بات طبیعت کے خلاف ہوگی، لیکن اس طبیعت کے خلاف بات کو برداشت کرنا پڑے گا۔

غلطی آپ کی بھی ہوسکتی ہے

یہ بات بھی سمجھ لیں کہ جب تم کسی دوسرے کی کسی بات کو اپنی طبیعت کے خلاف سمجھ رہے ہو تو یہ ضروری نہیں کہ وہ شخص غلطی پر ہو، بلکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ دوسرا شخص غلطی پر ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم غلطی پر ہو، کیونکہ طبیعتوں کا فرق ہے۔

مثلاً ایک آدمی کو ایک کھانا پسند ہے، دوسرے کو دوسرا کھانا پسند ہے، ایک آدمی کو کریلے پسند ہیں، اس کا سالن اس کو مزیدار معلوم ہوتا ہے، دوسرے آدمی کو کریلے ناپسند ہیں، وہ کہتا ہے کہ یہ کڑوے ہیں، مجھ سے نہیں کھائے جاتے۔ یہ طبیعت کا اختلاف ہے۔ اب یہ ضروری نہیں کہ جو شخص یہ کہہ رہا ہے کہ مجھے کریلے بہت اچھے لگتے ہیں، وہ غلطی پر ہے، یا جو شخص یہ کہہ رہا ہے کہ مجھے کریلے پسند نہیں، وہ غلطی پر ہے، بلکہ دونوں غلطی پر نہیں ہیں، البتہ دونوں کے مزاجوں کا فرق ہے، طبیعتوں کا فرق ہے وہ بھی اپنی جگہ صحیح ہے اور وہ بھی اپنی جگہ پر صحیح ہے۔

دونوں اپنی جگہ درست بھی ہوسکتے ہیں

لہٰذا جس جگہ مباحات کے اندر آپس میں اختلاف ہوتا ہے، وہاں کسی ایک فریق کو حق پر اور دوسرے کو باطل پر نہیں کہہ سکتے، بلکہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر درست ہوتے ہیں۔ چنانچہ اکثر میاں بیوی

کے درمیان طبیعتوں میں اختلاف ہوتا ہے، جب ہر دو انسانوں کی طبیعتوں میں اختلاف ہوتا ہے تو اگر صنف بھی بدل جائے کہ ایک مرد ہے اور ایک عورت ہے تو پھر طبیعتوں کا یہ اختلاف اور زیادہ ہو جاتا ہے۔ عورت کی ایک فطرت ہے اور اس کی ایک نفسیات ہے، مرد کی ایک فطرت ہے اور اس کی ایک نفسیات ہے۔ مرد اپنی فطرت کے مطابق سوچتا ہے، عورت اپنی فطرت کے مطابق سوچتی ہے۔ اس لیے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ تم اس کی صرف برائیوں کو مت دیکھیں بلکہ اچھائیوں کی طرف بھی دیکھیں۔

سیدھا کرنا چاہو گے تو توڑ دو گے

ایک اور بات یاد آ گئی، وہ یہ کہ حضور اقدس ﷺ نے عورت کو پسلی سے تشبیہ دی، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَلْمَرْأَةُ كَالضِّلَعِ إِنْ ذَهَبْتَ تُقِيمُهَا كَسَرْتَهَا وَإِنِ اسْتَمْتَعْتَ بِهَا اسْتَمْتَعْتَ وَفِيهَا عِوَجٌ))(۱)

''عورت پسلی کی طرح ہے، اگر تم اس کو سیدھا کرنا چاہو گے تو اس کو توڑ دو گے، اور اگر تم اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو گے تو باوجودیکہ وہ تم کو ٹیڑھی نظر آ رہی ہے پھر بھی تم اس سے فائدہ اٹھا سکو گے''

عورت کا حسن ٹیڑھے پن میں ہے

اب بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ جب حضور اقدس ﷺ نے اس کو ٹیڑھی پسلی کہہ دیا تو اس کی مذمت بیان فرما دی۔ چنانچہ بعض لوگ اس کو اس کی مذمت اور برائی کے معنی میں استعمال کرتے ہیں، اور جب ان کا بیوی سے جھگڑا ہوتا ہے تو وہ بیوی سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''اے ٹیڑھی پسلی میں تجھے سیدھا کر کے رہوں گا''

حالانکہ ان لوگوں نے یہ غور نہیں کیا کہ حضور اقدس ﷺ پسلی کو ٹیڑھی کہہ رہے ہیں، پسلی اگر ٹیڑھی نہ ہو بلکہ سیدھی ہو جائے تو وہ پسلی کہلانے کے لائق نہیں، پسلی کا حسن اور صحت یہ ہے کہ وہ ٹیڑھی ہو، اگر وہ پسلی سیدھی ہو جائے تو وہ بیمار ہے۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب المداراة مع النساء، رقم: ٤٧٨٦، صحیح مسلم، کتاب الرضاع، باب الوصیة بالنساء، رقم: ٢٦٦٩، سنن الترمذی، کتاب الطلاق واللعان عن رسول الله، باب ماجاء فی مداراة النساء، رقم: ١١٠٩، مسند أحمد، رقم: ٩٤١٩

ٹیڑھا ہونا ایک اضافی چیز ہے

درحقیقت اس حدیث کے ذریعے حضور اقدس ﷺ یہ بتلانا چاہ رہے ہیں کہ ٹیڑھا ہونا اور سیدھا ہونا ایک اضافی چیز ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک چیز کو ایک نگاہ سے دیکھیں تو وہ سیدھی ہے اور دوسری نگاہ سے دیکھیں تو وہ ٹیڑھی ہے۔

دیکھئے! سامنے مسجد کے باہر جو سڑک ہے، اگر مسجد کے اندر سے دیکھیں تو وہ یہ نظر آئے گا کہ یہ سڑک ٹیڑھی ہے، اس لیے کہ مسجد کی نسبت سے سڑک ٹیڑھی ہے۔ اور اگر سڑک پر کھڑے ہو کر دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ سڑک سیدھی ہے اور مسجد ٹیڑھی ہے، حالانکہ نہ سڑک ٹیڑھی ہے، نہ مسجد ٹیڑھی ہے، اس لیے کہ مسجد کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ قبلہ رخ ہو۔ لہٰذا کسی چیز کا سیدھا اور ٹیڑھا ہونا اضافی صفت ہے، ایک چیز ایک لحاظ سے ٹیڑھی ہے اور دوسرے لحاظ سے سیدھی ہے۔

عورت کا ٹیڑھا پن فطری ہے

بہرحال! اس حدیث کے ذریعہ یہ بتانا مقصود ہے کہ چونکہ تمہاری طبیعت عورت کی طبیعت سے مختلف ہے، لہٰذا تمہارے لحاظ سے وہ ٹیڑھی ہے، لیکن حقیقت میں وہ ٹیڑھا پن اس کی فطرت کا حصہ ہے۔ جس طرح پسلی کی فطرت کا حصہ یہ ہے کہ وہ ٹیڑھی ہو، اگر پسلی سیدھی ہو جائے تو اس کو ''عیب'' کہا جائے گا اور ڈاکٹر اس کو دوبارہ ٹیڑھی کرنے کی کوشش کرے گا، اس لیے کہ اس کی فطرت کے اندر ٹیڑھا پن موجود ہے۔ لہٰذا اس حدیث کے ذریعہ عورت کی برائی بیان نہیں کی جا رہی ہے، بلکہ یہ کہا جا رہا یہ کہ چونکہ عورت کی طبیعت تمہاری طبیعت کے لحاظ سے مختلف ہے، اس لیے تمہیں ٹیڑھی معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اس کو سیدھا کرنے کی فکر مت کرنا، کیونکہ اس کو سیدھا کرنا ایسا ہی ہوگا جیسے پسلی کو سیدھا کرنا، اور اگر تم اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو اس کو توڑ ڈالو گے، اور اگر تم اس کو اس کی حالت پر چھوڑ دو گے تو اس کے ٹیڑھا ہونے کے باوجود تم اس سے فائدہ اٹھاؤ گے۔

بڑھیا اور عقاب کا واقعہ

عربی سکھانے کی ایک کتاب ''مفید الطالبین'' میں ایک قصہ لکھا ہے کہ بادشاہ کا ایک عقاب اڑ کر ایک بڑھیا کے پاس پہنچ گیا، اس بڑھیا نے اس کو پکڑ کر اس کو پالنا شروع کیا۔ جب بڑھیا نے یہ

دیکھا کہ اس کی چونچ ٹیڑھی ہے اور اس کے پنجے ٹیڑھے ہیں۔ تو بڑھیا کو اس پر بڑا ترس آیا کہ یہ بیچارہ پرندہ ہے، اللہ کی مخلوق ہے، جب اس کو کھانے کی ضرورت ہوتی ہوگی تو یہ کیسے کھاتا ہوگا، کیونکہ اس کی چونچ ٹیڑھی ہے، اور جب اس کو چلنے کی ضرورت ہوگی تو یہ چلتا کیسے ہوگا، اس لیے کہ اس کے پنجے ٹیڑھے ہیں۔ اس بڑھیا نے سوچا کہ میں اس کی یہ مشکل آسان کروں، چنانچہ قینچی سے پہلے اس کی چونچ کاٹی، اور پھر اس کے پنجے کاٹے، جس کے نتیجے میں اس کا خون بہنے لگا اور وہ زخمی ہوگیا، جتنا پہلے چل سکتا تھا، اس سے بھی وہ معذور ہوگیا۔ یہ واقعہ نادان کی محبت کی مثال میں پیش کیا جاتا ہے، کیونکہ اس بڑھیا نے اس عقاب کے ساتھ محبت تو کی، لیکن نادانی اور بے عقلی کے ساتھ محبت کی، اور یہ نہ سوچا کہ اس کی چونچ اور اس کے پنجوں کا ٹیڑھا ہونا اس کی فطرت کا حصہ ہے اور اس کا حسن اس کے ٹیڑھے پن میں ہے، اگر اس کے یہ اعضاء ٹیڑھے نہ ہوں تو یہ ''عقاب'' کہلانے کا مستحق نہیں۔

بہر حال! جب بھی دو آدمیوں کے درمیان تعلقات ہوں گے، چاہے وہ مرد ہوں، یا عورتیں ہوں، اس تعلق کے نتیجے میں طبیعتوں کا اختلاف ضرور ظاہر ہوگا، اور اس اختلاف کے نتیجے میں ایک کو دوسرے سے تکلیف بھی پہنچے گی۔ اب دو ہی راستے ہیں: ایک راستہ تو یہ ہے کہ جب بھی دوسرے سے تمہیں کوئی تکلیف پہنچے تو اس پر اس سے لڑو، اور اس تکلیف کو آپس میں چپقلش اور ناچاقی کا سبب بناؤ، اگر تم یہ راستہ اختیار کروں گے تو تمہیں کبھی بھی چین اور سکون نصیب نہیں ہوگا۔

لوگوں کی تکالیف پر صبر کیجئے

دوسرا راستہ یہ ہے کہ جب دوسرے سے تکلیف پہنچے تو یہ سوچ لو کہ جب طبیعتیں مختلف ہیں تو تکلیف تو پہنچنی ہی ہے اور زندگی بھی ساتھ گزارنی ہے، اور یہ زندگی ہمیشہ کی زندگی تو ہے نہیں کہ ہمیشہ ہمیشہ یہیں رہنا ہو، بلکہ چند دنوں کے لیے اس دنیا میں آئے ہیں، نہ جانے کس وقت یہاں سے روانہ ہو جائیں۔ لہٰذا اس چند روزہ زندگی میں اگر دوسرے سے تمہیں کوئی تکلیف پہنچ رہی ہے تو اس پر اللہ کے لیے صبر کر لو۔ یہ ٹھیک ہے کہ جب تمہیں تکلیف پہنچے گی تو اس وقت تمہارے دل میں اشتعال پیدا ہوگا، غصہ آئے گا، اور دل یہ چاہے گا کہ میں اس کا منہ نوچ ڈالوں، اس کو برا بھلا کہوں، اس کی غیبت کروں، اس کی برائی بیان کروں، اس کو بدنام کروں، اس لیے کہ اس نے تمہیں تکلیف پہنچائی ہے۔

تمہیں کیا فائدہ حاصل ہوگا؟

لیکن یہ سوچو کہ اگر تم نے یہ کام کر لیے تو تمہیں کیا فائدہ حاصل ہوا؟ ہاں یہ ہوا کہ معاشرے

میں لڑائی جھگڑا پھیلا اور ذرا سا دل کا جذبہ ٹھنڈا ہو گیا۔ لیکن حقیقت میں دل کا جذبہ ٹھنڈا نہیں ہوتا، کیونکہ جب ایک مرتبہ دشمنی کی آگ بھڑک جاتی ہے تو پھر وہ ٹھنڈی نہیں ہوتی بلکہ اور بڑھتی رہتی ہے۔ چلئے مان لیجیے کہ یہ تھوڑا سا فائدہ حاصل ہو گیا، لیکن اس بدلہ لینے میں تم نے جو زیادتی کی ہو گی اس کا تمہیں قیامت کے دن جو حساب دینا ہو گا اور اس پر تمہیں جو عذاب جھیلنا ہو گا وہ عذاب اس سے کہیں زیادہ ہے کہ دنیا میں اس کی تکلیف پر صبر کر لیتے اور یہ سوچتے کہ چلو اس نے اگرچہ میرے ساتھ زیادتی کی ہے، لیکن میں اس پر صبر کرتا ہوں اور اپنے معاملہ اللہ کے حوالے کرتا ہوں۔

صبر کرنے کا اجر

اگر صبر کر لیا تو اس پر اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے:

﴿اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ﴾(۱)

''اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر عطا فرماتے ہیں''

کوئی گنتی ہی نہیں، اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو گنتی بیان کر دیتے، لیکن ہم لوگ گنتی سے عاجز ہیں، ہمارے پاس تو گنتی کے لیے چند عدد ہیں، مثلاً ہزار، لاکھ، کروڑ، ارب، کھرب، پدم، بس آگے کوئی اور لفظ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتے تو صبر کا اجر دینے کے لیے کوئی لفظ پیدا فرما دیتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ صبر کرنے والے کو اجر دینے کے لیے کوئی گنتی ہی نہیں۔

مثلاً اگر کسی نے تمہیں ایک مکا مار دیا، اب اگر بدلہ میں تم نے بھی اس کو ایک مکا مار دیا تو تمہارے لیے یہ بدلہ لینا جائز تھا، لیکن اس بدلہ لینے کے نتیجے میں تمہیں کیا ملا؟ کچھ نہیں۔ اور اگر تم نے صبر کر لیا اور بدلہ نہ لیا تو اس پر اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ تمہیں اتنا اجر دوں گا کہ تم شمار بھی نہیں کر سکو گے۔ لہٰذا صبر پر ملنے والے اس اجر و ثواب کو سوچ کر غصہ پی جاؤ اور بدلہ نہ لو۔

بدلہ لینے سے کیا فائدہ؟

اور اگر کوئی دوسرا شخص تمہیں تکلیف پہنچا رہا ہے تو شریعت نے تمہیں اس کی اجازت دی ہے کہ اس تکلیف کو جس حد تک روکنا تمہارے لیے ممکن ہے، اس حد تک اس کا راستہ بند کرنے کی کوشش کر لو، لیکن اپنے اوقات کو اس تکلیف دینے والے کے درپے آزاد ہونے میں صرف کرنا، اوقات کا اس سے بڑا ضیاع کوئی نہیں۔ مثلاً آپ نے کسی سے سنا کہ فلاں آدمی مجلس کے اندر آپ کی برائی

---

(۱) الزمر: ۱۰

کر رہا تھا، اب اگر تمہیں پتہ ہی نہ چلتا کہ فلاں آدمی برائی کر رہا تھا، پھر تو کچھ بھی نہ ہوتا، لیکن دوسرے شخص نے تمہیں بتادیا، اس کے نتیجے میں تمہارے دل پر چوٹ لگ گی، اب ایک راستہ یہ ہے کہ تم اس کی کھوج میں لگ جاؤ کہ اس مجلس میں کون کون موجود تھے اور پھر ان میں سے ہر ایک کے پاس جا کر تفتیش کریں کہ فلاں نے میری کیا برائی بیان کی؟ اور ہر ایک سے گواہی لیتے پھرو، اور اپنا سارا وقت اس کام میں خرچ کریں، تو اس کا حاصل کیا نکلا؟ کچھ بھی نہیں۔ اس کے برخلاف اگر تم نے یہ سوچا کہ اگر فلاں شخص نے میری برائی بیان کی تھی تو وہ جانے، اس کا اللہ جانے، اس کے اچھا کہنے سے نہ میں اچھا ہوسکتا ہوں، اور اس کے برا کہنے سے نہ میں برا ہوسکتا ہوں، میرا معاملہ تو میرے اللہ کے ساتھ ہے، اگر میرا معاملہ میرے اللہ کے ساتھ درست ہے تو پھر دنیا مجھے کچھ بھی کہتی رہے، مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ع

خلقے پس او دیوانہ و دیوانہ بکارے

ساری مخلوق اگر میری برائی کرتی ہے تو کرتی رہے۔ میرا معاملہ تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔

اگر یہ سوچ کر تم اپنے کام میں لگ جاؤ تو یہ "صبر علی الاذیٰ" ہے جس پر اللہ تعالیٰ بے حساب اجر عطا فرمائیں گے۔

بدلہ لینے میں انصاف کریں

اور اگر تم نے دل کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے بدلہ لینے کا ہی ارادہ کرلیا کہ میں تو بدلہ ضرور لوں گا، تو بدلہ لینے کے لیے وہ ترازو اور پیمانہ کہاں سے لاؤ گے جس سے یہ پتہ چلے کہ میں نے بھی اتنی ہی تکلیف پہنچائی ہے جتنی تکلیف اس نے پہنچائی تھی؟ اگر تم تکلیف پہنچانے میں ایک انچ اور ایک تولہ آگے بڑھ گئے تو اس پر آخرت میں جو پکڑ ہوگی اس کا حساب کون کرے گا؟ اس لیے بدلہ لینے کا آپ کو حق حاصل ہے، مگر یہ حق بڑا خطرناک ہے۔ لیکن اگر تم نے معاف کردیا تو اس پر بے حساب اجر و ثواب کے مستحق بن جاؤ گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ﴾ (۱)

"اگر صبر کرو تو صبر کرنا بدرجہا بہتر ہے صبر کرنے والوں کے لیے"

(۱) النحل: ۱۲۶

خلاصہ

بہرحال! جب لوگوں کے ساتھ رہو گے، ان کے ساتھ تعلقات رکھو گے، اور ان کے ساتھ معاملات ہوں گے تو پھر تکلیفیں بھی پہنچیں گی۔ لیکن اس کا نسخہ نبی کریم ﷺ نے یہ بتا دیا کہ ان تکلیفوں پر صبر کرے۔ اور ہر شخص اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچے کہ اگر ہر انسان اس نسخے پر عمل کر لے اور یہ سوچ لے کہ دوسرے کی طرف سے جو خلاف طبع امور پیش آئیں گے، اس پر حتیٰ الامکان صبر کروں گا، تو دنیا سے تمام جھگڑے اور فساد ختم ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ کو بھی اس عظیم نسخے پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

☆☆☆

خاندانی اختلافات کا تیسرا حل

عفو و درگزر ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ أَبِیْ مُوْسٰی رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((مَا أَحَدٌ اَصْبَرُ عَلٰی اَذًی سَمِعَهٗ مِنَ اللّٰهِ يَدْعُوْنَ لَهُ الْوَلَدَ ثُمَّ يُعَافِيْهِمْ وَ يَرْزُقُهُمْ))(۱)

دوسروں سے پہنچنے والی تکلیفوں پر صبر

پچھلے اتوار ایک حدیث پڑھی تھی، جس کی تشریح میں میں نے عرض کیا تھا کہ مسلمانوں کے درمیان آپس میں ناچاقیاں اور اختلافات اور بغض و عداوت یہ ایک بہت بڑی دینی اور معاشرتی بیماری ہے، اور حضور اقدس ﷺ نے اس بیماری سے بچانے کے لیے اور مسلمانوں کے درمیان محبت اور اخوت قائم کرنے کے لیے بہت سی ہدایات عطا فرمائیں ہیں، ان ہدایات میں سے ایک ہدایت پچھلے بیان میں عرض کی تھی کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص دوسروں کے ساتھ ملا جلا رہتا ہے اور پھر لوگوں سے پہنچنے والی تکلیفوں پر صبر کرتا ہے تو وہ اس شخص سے بدرجہا بہتر ہے جو لوگوں کے ساتھ میل جول نہیں رکھتا اور جس کے نتیجے میں لوگوں سے پہنچنے والی تکالیف پر صبر کرنے کی نوبت نہیں آتی۔(۲)

اس سے معلوم ہوا کہ آپس کے اختلاف اور ناچاقی کا بہت بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ دوسروں

☆ اصلاحی خطبات (۱۱/ ۲٤٠ تا ۲٦٣) بعد از نماز عصر، جامع مسجد دار العلوم، کراچی

(۱) صحيح البخاری، كتاب التوحيد، باب قول الله تعالى إن الله هوالرزاق ذو القوة المتين، رقم: ٦٨٣٠، صحيح مسلم، كتاب صفة القيامة والجنة والنار، باب لاأحد أصبر على أذى من الله، رقم: ٥٠١٦، مسند أحمد، رقم: ١٨٧٠٦

(۲) سنن الترمذی، كتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله، باب منه، رقم: ٢٤٣١، سنن ابن ماجه، كتاب الفتن، باب الصبر على البلاء، رقم: ٤٠٢٢، مسند أحمد، رقم: ٤٧٨٥

سے پہنچنے والی تکلیفوں پر صبر نہ کیا جائے، ساتھ رہنے کے نتیجے میں دوسرے سے کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی تکلیف ضرور پہنچے گی، لیکن اس تکلیف پر انسان کو صبر کرنا چاہیے۔

سب سے زیادہ صبر کرنے والی ذات

اسی ہدایت کی تاکید کے طور پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ حدیث ارشاد فرمائی جو ابھی میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس کائنات میں کوئی بھی ذات دوسرے سے پہنچنے والی تکلیف پر اتنا صبر کرنے والی نہیں جتنی اللہ جل شانہ کی ذات صبر کرنے والی ہے۔ لوگ اللہ جل جلالہ کو ایسی باتیں کہتے ہیں جو ایذاء اور تکلیف کا ذریعہ ہوتی ہیں، چنانچہ بعض لوگ اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹا مانتے ہیں جیسے عیسائی کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ معاذ اللہ۔ بعض یہودیوں نے حضرت عزیز علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بنا دیا، بعض مشرکین نے فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دے دیا، بہت سے لوگوں نے پتھروں کو، درختوں کو، یہاں تک کہ جانوروں کو، گائے بیل کو، سانپ بچھو کو خدا ماننا شروع کر دیا۔ جس ذات نے ان سب انسانوں کو پیدا کیا اور فرشتوں کو یہ بتا کر پیدا کیا کہ میں انسان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنا رہا ہوں، وہی انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرا رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی بردباری دیکھئے

یہ انسان اللہ تعالیٰ کو تکلیف پہنچانے والے کام کر رہے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی بردباری دیکھئے کہ یہ سب باتیں سنتے ہیں، اس کے باوجود ان انسانوں کو عافیت بھی دے رکھی ہے اور ان کو رزق بھی دے رکھا ہے۔ اس کائنات میں آپ دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ کافروں اور مشرکوں کی تعداد زیادہ ہے، اور ہمیشہ سے ان کی تعداد زیادہ رہی ہے، اور قرآن کریم نے بھی کہہ دیا کہ

﴿وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾(۱)

”یعنی اگر آپ زمین میں رہنے والوں کی اکثریت کے پیچھے چلیں گے تو وہ آپ کو اللہ تعالیٰ کے راستے سے بھٹکا دے گا“

اس لیے کہ انسانوں کی اکثریت تو کفر میں شرک میں اور فسق میں مبتلا ہے۔

---

(۱) الانعام: ۱۱۶

جمہوریت کا فلسفہ ماننے کا نتیجہ

آج کل دنیا میں ''جمہوریت'' کا شور مچایا جا رہا ہے، اور یہ کہا جا رہا ہے کہ اکثریت جو بات کہہ دے وہ حق ہے۔ اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ نکلے گا کہ ''کفر'' برحق ہے اور ''اسلام'' باطل ہے۔ العیاذ باللہ۔ اس لیے کہ روئے زمین پر بسنے والے انسانوں کی اکثریت یا تو کفر میں مبتلا ہے یا شرک میں مبتلا ہے، اور جو لوگ مسلمان کہلاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے قائل ہیں، حضور اقدس ﷺ کی رسالت پر ایمان رکھتے ہیں، آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، ان میں بھی آپ دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ ٹھیک ٹھیک شریعت کے دائرہ پر چلنے والوں کی تعداد بہت تھوڑی ہے اور بے فکر، بے پرواہ اور فسق و فجور کے اندر مبتلا اور معصیتوں میں گرفتار انسانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

کافروں کے ساتھ حسن سلوک

اس روئے زمین پر کفر بھی ہو رہا ہے، شرک بھی ہو رہا ہے، معصیت بھی ہو رہی ہے، فسق و فجور بھی ہو رہا ہے، لیکن ان سب چیزوں کو دیکھنے کے باوجود انہی لوگوں کو جو اللہ تعالیٰ کے وجود تک کا انکار کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو رزق عطا فرما رہے ہیں، ان کو عافیت دے رکھی ہے اور ان پر دنیا میں نعمتوں کی بارش ہو رہی ہے۔ یہ ہے اللہ تعالیٰ کا حلم اور بردباری، اللہ تعالیٰ سے زیادہ کون ان ایذاؤں پر صبر کرنے والا ہوگا۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ع

برخوان یغما چہ دشمن چہ دوست

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں رزق کا جو دستر خوان بچھایا ہوا ہے، اس میں دوست دشمن سب برابر ہیں، دوست کو بھی کھلا رہے ہیں، دشمن کو بھی کھلا رہے ہیں، بلکہ بعض اوقات دشمن کو زیادہ کھلا رہے ہیں۔ اس وقت آپ کافروں اور مشرکوں کو دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ ان کے پاس دولت کے انبار لگے ہوئے ہیں، جبکہ مسلمانوں پر بعض اوقات فقر و فاقہ بھی گزر جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کی باتوں کو سننے کے باوجود ان کے ساتھ حلم کا معاملہ فرما رہے ہیں، ان کو عافیت اور رزق عطا فرما رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے اخلاق اپنے اندر پیدا کریں

بہر حال! اللہ تعالیٰ کے اس حلم کو دیکھئے اور پھر حضور اقدس ﷺ کے اس ارشاد پر عمل کریں کہ آپ نے فرمایا:

((تَخَلَّقُوا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ))(۱)

اے انسانو! تم اللہ تعالیٰ کے اخلاق حاصل کرنے کی اوران کو اپنانے کی کوشش کرو، اگرچہ سو فیصد تو حاصل نہیں ہو سکتے، لیکن اس بات کی کوشش کریں کہ وہ اخلاق تمہارے اندر بھی آ جائیں۔ جب اللہ جل جلالہ لوگوں کی ایذاء رسانیوں پر اتنا صبر فرما رہے ہیں، تو اے اللہ کے بندو! تم بھی لوگوں کی ایذاء رسانیوں پر صبر کرو، اور دوسرے سے اگر تمہیں تکلیف پہنچ رہی ہے تو اس کو برداشت کرنے کی عادت ڈالو۔

دنیا میں بدلہ نہ لیں

اگر کوئی یہ سوال کرے کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں صبر فرما رہے ہیں اور کافروں اور مشرکوں کو عافیت اور رزق دے رکھا ہے، یہ دنیا میں ترقی کر رہے ہیں، لیکن جب آخرت میں اللہ تعالیٰ ان کو پکڑیں گے تو پھر چھوٹ نہیں پائیں گے، اور ان کو ایسا سخت عذاب دیں گے کہ یہ اس سے بچ نہیں سکیں گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ دنیا میں صبر کا معاملہ فرمایا ہے تو تم بھی یہ معاملہ کر لو کہ دنیا میں جس شخص سے تمہیں تکلیف پہنچ رہی ہے، اس سے کہہ دو کہ میں تم سے بدلہ نہیں لیتا اور میں نے تمہارا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیا، آخرت میں اللہ خود انصاف کرا دیں گے، لہٰذا تم اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کر دو۔ اس لیے کہ تم دنیا میں اس تکلیف پر جو بدلہ لو گے وہ بدلہ اس انتقام کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا جو آخرت میں اللہ تعالیٰ لیں گے۔ لہٰذا اگر تمہیں بدلہ لینے کا شوق ہے تو پھر یہاں پر بدلہ نہ لو بلکہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دو۔

معاف کرنا بہتر ہے

تمہارے لیے بہتر تو یہ ہے کہ معاف ہی کر دو، اس لیے کہ جب تم معاف کر دو گے تو اللہ تعالیٰ خود کفالت فرمائیں گے اور تمہاری حاجتیں پوری فرمائیں گے اور تمہیں جو تکلیفیں پہنچی ہیں وہ ختم فرمائیں گے، چنانچہ اللہ کے بندے معاف ہی فرما دیتے ہیں۔ ہم نے اپنے بزرگوں سے حضرت میاں جی نور محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ سنا جو ہمارے دادا پیر ہیں اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ تھے، ان کی عادت یہ تھی کہ جب کوئی شخص ان کو تکلیف پہنچاتا تو فرماتے کہ یا اللہ! میں

(۱) بریقة محمودية فی شرح طريقة محمدية وشريعة نبوية(۲/٤)، تفسير الرازی(٤٤٤/٤)، تفسير الآلوسی(۳۱/۲۳)

نے اس کو معاف کر دیا، حتیٰ کہ اگر کوئی چور مال چوری کر کے لے جاتا تو آپ فرماتے کہ یا اللہ! میں نے یہ مال اس کے لیے حلال کر دیا، میں اس سے بدلہ لے کر اور اس کو عذاب دلوا کر کیا کروں گا۔ ہر وقت اللہ کے ذکر میں مشغول رہتے، جب بازار کوئی چیز خریدنے جاتے تو پیسوں کی تھیلی ہاتھ میں ہوتی، سامان خریدنے کے بعد وہ تھیلی دوکاندار کو پکڑا دیتے کہ اس تھیلی میں سے اس کی قیمت لے لے، خود نہ گنتے، اس لیے کہ جتنا وقت نکال کر گننے میں لگے گا اتنا وقت میں ذکر میں مشغول رہوں گا۔

حضرت میاں جی نور محمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

ایک مرتبہ بازار سے گزر رہے تھے، ہاتھ میں پیسوں کی تھیلی تھی، ایک چور کو پتہ چل گیا کہ میاں صاحب کے پاس پیسوں کی تھیلی ہے، وہ چور پیچھے سے آیا اور تھیلی چھین کر بھاگ گیا۔ میاں جی نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ کون تھیلی چھین کر لے گیا، یہ سوچا کہ کون اس کے پیچھے بھاگے اور تحقیق کرے کہ کون لے گیا۔ بس ذکر کرتے ہوئے اپنے گھر کی طرف چل دیئے اور دل میں یہ نیت کر لی کہ اے اللہ! جس چور نے یہ پیسے لیے ہیں، وہ پیسے میں نے اس کو معاف کر دیئے اور اس کے لیے وہ پیسے ہبہ کر دیئے۔ اب وہ چور چوری کر کے مصیبت میں پھنس گیا، اور اپنے گھر کی طرف جانا چاہتا ہے لیکن ان گلیوں سے نکلنے کا راستہ نہیں پاتا، ایک گلی سے دوسری گلی میں، دوسری سے تیسری گلی میں آ جاتا، وہ گلیاں اس کے لیے بھول بھلیاں بن گئیں، جہاں سے چلتا، دوبارہ وہاں پہنچ جاتا، نکلنے کا راستہ ہی اس کو نہ ملتا، جب کئی گھنٹے گزر گئے اور چلتے چلتے تھک گیا تو اس کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ یہ بڑے میاں کی کوئی کرامت معلوم ہوتی ہے، میں نے ان کے پیسے چھینے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے میرا راستہ بند کر دیا۔ اب کیا کروں؟ اس نے سوچا کہ اب یہی راستہ ہے کہ ان بزرگ کے پاس دوبارہ واپس جاؤں اور ان سے درخواست کروں کہ خدا کے لیے یہ پیسے لے لو اور اللہ تعالیٰ سے دعا کر کے میری جان چھڑاؤ۔ چنانچہ میاں صاحب کے گھر کے دروازے پر پہنچا اور دستک دی، میاں صاحب نے پوچھا کہ کون ہے؟ اس نے کہا کہ حضور! میں نے آپ کے پیسے چھین لیے تھے، مجھ سے غلطی ہوگئی تھی، خدا کے لیے یہ پیسے واپس لے لو۔ میاں صاحب نے فرمایا کہ میں نے یہ پیسے تمہارے لیے حلال کر دیئے اور تمہیں ہبہ کر چکا، اب یہ پیسے میرے نہیں رہے، میں نے تمہیں دے دیئے، اب میں واپس نہیں لے سکتا۔ اس چور نے کہا کہ خدا کے لیے یہ پیسے واپس لے لو۔ اب دونوں کے درمیان بحث ہو رہی ہے، چور کہتا ہے کہ خدا کے لیے پیسے لے لو، وہ کہتے ہیں کہ میں نہیں لیتا، میں تو ہبہ کر چکا۔ آخر کار میاں جی نے پوچھا کہ کیوں واپس کرنا چاہتے ہو؟ اس نے کہا حضرت! بات یہ ہے کہ

میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں مگر راستہ نہیں مل رہا ہے، میں کئی گھنٹوں سے ان گلیوں میں بھٹک رہا ہوں۔ میاں جی نے فرمایا کہ اچھا میں دعا کر دیتا ہوں، تمہیں راستہ مل جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے دعا کی اور اس کو راستہ مل گیا۔

کسی سے ''بُغض'' نہ رکھو

بہرحال! ان اللہ والوں کو اگر کوئی تکلیف بھی پہنچائے تو یہ اللہ والے اس کے ساتھ بھی ''بُغض'' نہیں رکھتے، بُغض ان کی گلی میں گزرا ہی نہیں۔

کفر است در طریقت ما کینہ داشتن
آئین ما است سینہ چوں آئینہ داشتن

ہماری طریقت میں کسی شخص سے ''بغض'' رکھنا کفر کی طرح ہے۔ ہمارا آئین تو یہ ہے کہ ہمارا دل آئینہ کی طرح ہوتا ہے، اس پر کسی کے بغض، عناد اور دشمنی کا کوئی داغ نہیں ہے۔

بدلہ اللہ پر چھوڑ دیں

لہٰذا جو تمہیں تکلیف پہنچائے، اس کو اللہ کے لیے معاف کر دو، اور اگر بدلہ لینا ہی ہے تو اس بدلے کو اللہ پر چھوڑ دو۔ اس لیے کہ اگر خود بدلہ لو گے تو اس سے لڑائی جھگڑے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، کیونکہ یہ معلوم نہیں ہوگا کہ جتنا تمہیں بدلہ لینے کا حق تھا اتنا ہی بدلہ لیا یا اس سے زیادہ بدلہ لے لیا۔ اس لیے اگر زیادہ بدلہ لے لیا تو قیامت کے دن تمہاری گردن پکڑی جائے گی، اس لیے بدلہ اللہ پر چھوڑ دو۔

ہر انسان اپنے فرائض کو ادا کرے

البتہ یہاں ایک بات سمجھ لینی چاہیے، وہ یہ کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ ہمیشہ ہر انسان کو اس کے فرائض کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ تمہارا فریضہ یہ ہے، تمہارا یہ کام ہونا چاہیے، تمہارا طریقہ کار یہ ہونا چاہیے۔ لہٰذا جس شخص کو تکلیف پہنچی ہے اس کو تو آپ صبر کرنے کی تلقین فرما رہے ہیں کہ تم صبر کرو اور معاف کر دو، بدلہ نہ لو، اس سے بُغض اور عداوت نہ رکھو، اور اس تکلیف کو اختلاف اور انتشار کا ذریعہ نہ بناؤ۔ لیکن دوسری طرف حضور اقدس ﷺ نے تکلیف پہنچانے والے کو دوسرے انداز سے خطاب فرمایا تاکہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ جب حضور اقدس ﷺ جس شخص کو تکلیف پہنچی ہے، اس کو صبر کی تلقین فرما رہے ہیں تو پھر تکلیف پہنچانے میں بھی کوئی حرج نہیں، ایسا نہیں۔

دوسروں کو تکلیف مت دیں

بلکہ تکلیف پہنچانے والے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا تو یہ فرمان ہے کہ کسی بھی انسان کو اگر تمہاری ذات سے کوئی تکلیف پہنچی تو میں اس وقت تک معاف نہیں کروں گا جب تک وہ بندہ معاف نہ کر دے یا تم اس کے حق کی تلافی نہ کر دو۔ لہٰذا کسی بھی انسان کو تکلیف پہنچانے سے بچو، کسی بھی قیمت پر ایسا اقدام نہ کریں جس سے دوسرے کو تکلیف پہنچے۔

چیف جسٹس کا روزانہ دو سو رکعت نفل پڑھنا

حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں، اور بڑے درجے کے فقہاء میں سے ہیں، فقیہ ہونے کی حیثیت سے تو مشہور ہیں، البتہ ولی اللہ ہونے کی حیثیت سے معروف نہیں ہیں، لیکن ان کے واقعات میں لکھا ہے کہ جب ''قاضی القضاۃ'' (چیف جسٹس) بن گئے، تو اس کے بعد اپنی تمام مشغولیت کے باوجود دن بھر میں دو سو رکعت نفل پڑھا کرتے تھے۔ جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو کسی نے دیکھا کہ ان کے چہرے پر فکر اور تشویش کے آثار ہیں، ان سے پوچھا کہ آپ کو کس چیز کی فکر اور تشویش ہے؟ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا وقت قریب آ رہا ہے، اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہونا ہے، وہاں پر اپنی زندگی کے اعمال کا کیا جواب دوں گا۔ اور تمام واقعات کے بارے میں مجھے یاد ہے کہ میں ان سے توبہ کر چکا ہوں اور استغفار کر چکا ہوں، اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف فرما دیں گے۔

یہ ناانصافی مجھ سے ہو گئی

لیکن ایک واقعہ ایسا یاد آ رہا ہے جس کی وجہ سے مجھے بہت سخت تشویش ہے، وہ واقعہ یہ ہے کہ جس وقت میں ''قاضی'' کے عہدے پر تھا، اور لوگوں کے درمیان فیصلے کیا کرتا تھا، اس دوران ایک مرتبہ ایک مسلمان اور ایک غیر مسلم کا مقدمہ میرے پاس آیا، میں نے مقدمہ سنتے وقت مسلمان کو تو اچھی جگہ پر بٹھایا اور غیر مسلم کو اس سے کمتر جگہ پر بٹھایا، حالانکہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ جب تمہارے پاس مقدمہ کے دو فریق آئیں تو ان کے دریان مجلس بھی برابر ہونی چاہیے، جس جگہ پر مدعی کو بٹھایا ہے اسی جگہ پر مدعا علیہ کو بھی بٹھاؤ، ایسا نہ ہو کہ دونوں کے درمیان نشست کے اندر فرق کر کے ناانصافی کی جائے۔ مجھ سے یہ ناانصافی ہو گئی ہے، اگرچہ میں نے فیصلہ تو حق کے مطابق کیا الحمد للہ، لیکن بٹھانے

کی ترتیب میں شریعت کا جو حکم ہے اس میں رعایت نہ رہ سکی۔ مجھے اس کی تشویش ہو رہی ہے کہ اگر اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پوچھ لیا تو کیا جواب دوں گا، کیونکہ یہ ایسی چیز ہے جو کہ توبہ سے معاف نہیں ہو سکتی جب تک کہ صاحب حق معاف نہ کرے۔

حقیقی مسلمان کون؟

لہٰذا صرف مسلمان ہی نہیں، غیر مسلموں کے بھی شریعت نے حقوق بتائے ہیں، حتیٰ کہ جانوروں کے بھی حقوق شریعت نے بیان کیے ہیں، احادیث میں کئی واقعات آئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جانوروں کے ساتھ زیادتی کرنے کے نتیجے میں لوگوں پر کیسے عذاب آئے۔ بہر حال! ایک طرف تو یہ کہا جا رہا ہے کہ خبردار! اپنی ایک ایک نقل و حرکت میں اور اپنے ایک ایک انداز و ادا میں اس بات کا خیال رکھو کہ تمہاری ذات سے دوسرے کو ادنیٰ سی تکلیف بھی نہ پہنچے۔ ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے:

((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِہٖ وَیَدِہٖ))(۱)

''مسلمان وہی ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ اس کی ذات سے دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے''

یہ اتنی خطرناک چیز ہے کہ اس کی معافی کا کوئی راستہ نہیں، سوائے اس کے کہ صاحب حق معاف کرے۔ لہٰذا ایک طرف تو ہر ایک انسان کو یہ تنبیہ کر دی کہ تمہاری ذات سے دوسرے کو تکلیف نہیں پہنچنی چاہیے، اور دوسری طرف یہ کہہ دیا کہ اگر تمہیں دوسرے سے تکلیف پہنچے تو اس پر صبر کریں اور اس کو معاف کر دیں، اس کی وجہ سے اس سے بغض اور عداوت نہ رکھو اور اس کو افتراق کا ذریعہ نہ بناؤ۔ یہ وہ تعلیم ہے جو نبی کریم ﷺ نے تلقین فرمائی۔

حضور اقدس ﷺ کی تربیت کا انداز

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جس وقت حضور اقدس ﷺ نے دس ہزار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے

(۱) صحیح البخاری، کتاب الإیمان، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده، رقم: ۹، صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان تفاضل الإسلام وأی أموره أفضل، رقم: ۵۸، سنن الترمذی، کتاب الإیمان عَنْ رسول الله، باب ما جاء فی أن المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده، رقم: ۲۵۵۱، سنن النسائی، کتاب الإیمان وشرائعه، باب صفة المسلم، رقم: ۴۹۱۰، سنن أبی داؤد، کتاب الجهاد، باب فی الهجرة هل انقطعت، رقم: ۲۱۲۲

ساتھ مکہ مکرمہ فتح فرمالیا، ان صحابہ میں مہاجرین بھی تھے اور انصار بھی تھے، پھر فتح مکہ کے بعد حنین کی جنگ پیش آئی، وہاں بھی اللہ تعالیٰ نے بالآخر فتح عطا فرمائی، اس پورے سفر میں بڑی مقدار میں مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ میں آیا، اس زمانے میں گائے، بیل، بکری کی شکل میں مال ہوتا تھا، چنانچہ جس کے پاس جتنے زیادہ جانور ہوتے اتنا ہی بڑا مالدار سمجھا جاتا تھا، تو مال غنیمت کے اندر بڑی مقدار میں جانور مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔

نئے مسلمانوں کے درمیان مال غنیمت کی تقسیم

جب مال غنیمت کی تقسیم کا وقت آیا تو حضور اقدس ﷺ نے یہ محسوس فرمایا کہ وہ لوگ جو مکہ مکرمہ کے آس پاس رہنے والے ہیں، یہ ابھی تازہ مسلمان ہوئے ہیں، ابھی اسلام ان کے دلوں کے اندر راسخ نہیں ہوا، اور ان میں سے بعض تو ایسے ہیں کہ ابھی مسلمان بھی نہیں ہوئے بلکہ اسلام کی طرف تھوڑا سا میلان ہوا ہے، اس لیے آپ ﷺ نے یہ محسوس کیا کہ اگر ان کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے گا تو جو لوگ تازہ مسلمان ہوئے ہیں وہ اسلام پر پختہ ہو جائیں گے، اور جو لوگ اسلام کی طرف مائل ہوئے ہیں وہ بھی اس کے نتیجے میں مسلمان ہو جائیں گے، پھر یہ لوگ مسلمانوں کے خلاف سازش نہیں کریں گے، لہٰذا مال غنیمت آیا تھا حضور اقدس ﷺ نے وہ سارا کا سارا مال وہاں کے لوگوں کے درمیان تقسیم فرما دیا۔

منافقین کا کام لڑائی کرانا ہے

اس وقت کوئی منافق انصارِ صحابہ کے پاس چلا گیا اور ان سے جا کر کہا کہ دیکھو تمہارے ساتھ کیسا سلوک ہو رہا ہے، لڑنے کے لیے مدینہ منورہ سے تم چل کر آئے، اور حضور اقدس ﷺ کا ساتھ تم نے دیا، اور حضور ﷺ کے ساتھ جہاد کر کے تم نے اپنی جانیں دیں، لیکن مال غنیمت ان لوگوں میں تقسیم ہو گیا جو ابھی ابھی مسلمان ہوئے ہیں، اور جن کے خلاف تمہاری تلواریں چل رہی تھیں، اور جن کے خون سے تمہاری تلواریں اب بھی آلودہ ہیں، اور تمہیں مال غنیمت میں سے کچھ نہ ملا۔ چونکہ منافقین ہر جگہ ہوتے تھے، ان میں سے کسی نے صحابہ کے درمیان لڑائی کرانے کے لیے یہ بات چھیڑی تھی، اب انصار صحابہ میں جو عمر رسیدہ اور تجربہ کار حضرات تھے، ان کے دلوں میں کوئی خیال پیدا نہیں ہوا، وہ جانتے تھے کہ اس مال و دولت کی حقیقت کیا ہے؟

لیکن انصار صحابہ میں جو نوجوان تھے، ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ یہ عجیب

معاملہ ہوا کہ سارا مال غنیمت انہی میں تقسیم ہو گیا اور ہم لوگ جو جہاد میں شریک تھے، ہمیں کچھ نہ ملا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکیمانہ خطاب

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع ملی کہ بعض انصار صحابہ کو یہ خیال ہو رہا ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ تمام انصار صحابہ کو ایک جگہ جمع کیا جائے۔ جب سب جمع ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار صحابہ رضی اللہ عنہم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''اے گروہ انصار! تمہیں اللہ تعالیٰ نے ایمان کی دولت عطا فرمائی، تمہیں اللہ تعالیٰ نے نبی کی میزبانی کا شرف عطا فرمایا، اور میں نے یہ مال غنیمت ان لوگوں میں تقسیم کر دیا جو یہاں کے رہنے والے ہیں تاکہ یہ ایمان پر پختہ اور راسخ ہو جائیں، اور کتنی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ میں جس کو مال غنیمت نہیں دیتا ہوں وہ زیادہ معزز اور محبوب ہوتا ہے اس کے مقابلے میں جس کو میں مال غنیمت دیتا ہوں، لیکن میں نے سنا ہے کہ بعض لوگوں کے دلوں میں اس قسم کا خیال پیدا ہوا ہے۔ پھر فرمایا: اے گروہ انصار! کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ جب یہ لوگ اپنے گھروں کو واپس جائیں تو ان کے ساتھ گائے، بیل، بکریاں ہوں، اور جب تم اپنے گھروں کی طرف واپس جاؤ تو تمہارے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں۔ بتاؤ ان میں سے کون افضل ہے؟''

جس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی، اس وقت تمام لوگوں کے دلوں میں ٹھنڈک پڑ گئی، انصاری صحابہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہمارے لیے تو اس سے بڑا اعزاز کوئی نہیں ہے، یہ بات صرف چند نوجوانوں نے کہہ دی تھی ورنہ ہمارے جو بڑے ہیں ان میں سے کسی کے دل میں کوئی خیال پیدا نہیں ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا فیصلہ فرمائیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا فیصلہ برحق ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص الخاص کون تھے؟

جب یہ سارا قصہ ختم ہو گیا تو اس کے بعد پھر انصار صحابہ رضی اللہ عنہم سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

اے انصار خوب سن لو! تم میرے خاص الخاص لوگ ہو:

((لَوْ سَلَكَ النَّاسُ وَادِياً لَسَلَكْتُ شِعْبَ الْاَنْصَارِ))

''اگر لوگ ایک راستے پر جائیں اور انصار دوسرے راستے پر جائیں تو میں انصار

والا راستہ اختیار کروں گا''

انصار صحابہ رضی اللہ عنہم کو صبر کرنے کی وصیت

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اے انصار! ابھی تک تو تمہارے ساتھ ناانصافی نہیں ہوئی، اور مجھے تمہارے ساتھ جو محبت اور تعلق ہے وہ ان شاء اللہ برقرار رہے گا، لیکن میں تمہیں پہلے سے بتا دیتا ہوں کہ میرے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد تمہیں اس بات سے واسطہ پیش آئے گا کہ تمہارے مقابلے میں دوسروں کو زیادہ ترجیح دی جائے گی۔ یعنی جو امراء اور حکام بعد میں آنے والے ہیں، وہ تمہارے ساتھ اتنا اچھا سلوک نہیں کریں گے، جتنا اچھا سلوک مہاجرین اور دوسروں کے ساتھ کریں گے۔

اے گروہ انصار! میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ اگر تمہارے ساتھ ایسا سلوک ہو تو اس وقت تم صبر کرنا یہاں تک کہ حوض کوثر پر تم مجھ سے آملو''(۱)

اس ارشاد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے سے یہ بتا دیا کہ آج تو تمہارے ساتھ ناانصافی نہیں ہوئی، لیکن آئندہ تمہارے ساتھ ناانصافی ہوگی اور میں تمہیں وصیت کرتا ہو کہ اس ناانصافی کے موقع پر صبر کرنا۔

انصار صحابہ رضی اللہ عنہم کا اس وصیت پر عمل

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان انصار صحابہ رضی اللہ عنہم سے یہ نہیں فرمایا کہ اس موقع پر ''تحفظ حقوق انصار'' کی ایک انجمن بنا لینا، پھر اپنے حقوق طلب کرنے کے لیے جھنڈا لے کر کھڑے ہو جانا اور بغاوت کا علم بلند کر دینا، بلکہ یہ فرمایا کہ اس وقت تم صبر کرنا یہاں تک کہ تم مجھ سے حوض کوثر پر آ کر مل جاؤ۔ چنانچہ انصار صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم پر ایسا عمل کر کے دکھایا کہ پوری تاریخ اسلام میں انصار کی طرف سے کوئی لڑائی اور جھگڑا آپ کو نہیں ملے گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان مشاجرات ہوئے اور اس کے نتیجے میں جنگ جمل اور جنگ صفین بھی ہوئیں، لیکن انصار صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف سے امراء اور حکام کے خلاف کوئی بات پیش نہیں آئی۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوة الطائف فی شوال سنة ثمان، رقم: ۳۹۸۵،
• صحیح مسلم، کتاب الزکاة، باب إعطاء المؤلفة قلوبهم علی الإسلام وتصبر من قوی، رقم: ۱۷۵۸، مسند أحمد، رقم: ۱۱۱۲۲

انصار کے حقوق کا خیال رکھنا

ایک طرف تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ وصیت فرمائی، دوسری طرف حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الوفات میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں نماز کے لیے بھی تشریف نہیں لا رہے تھے، اس وقت لوگوں کو جو وصیتیں فرمائیں، ان وصیتوں میں ایک یہ تھی کہ یہ انصار صحابہ رضی اللہ عنہم انہوں نے میری مدد کی ہے اور انہوں نے قدم قدم پر ایمان کا مظاہرہ کیا ہے، لہٰذا ان کے حقوق کا خیال رکھنا، ایسا نہ ہو کہ ان انصار کے دل میں ناانصافی کا خیال پیدا ہو جائے۔ لہٰذا ایک طرف تو صحابہ کرام کو آپ نے یہ تلقین فرمائی کہ ان انصار کے حقوق کا خیال رکھنا، اور دوسری طرف انصار کو یہ تلقین کی کہ اگر کبھی تمہارے ساتھ ناانصافی ہو تو صبر کا معاملہ کرنا۔

ہر شخص اپنے حقوق بجالائے

لہٰذا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور تلقین یہ ہے کہ ہر شخص اپنے فریضے کو دیکھے کہ میرے ذمہ کیا فریضہ عائد ہوتا ہے؟ مجھ سے کیا مطالبہ ہے؟ اور میں اس فریضے کو اور اس مطالبے کو پورا کر رہا ہوں یا نہیں؟ اور جب ہر انسان کو یہ دھن لگ جاتی ہے کہ میں اپنا فریضہ صحیح طور پر ادا کروں اور میرے ذمے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو مطالبہ ہے وہ پورا کروں تو اس صورت میں سب کے حقوق ادا ہو جاتے ہیں۔

آج ہر شخص اپنے حقوق کا مطالبہ کر رہا ہے

آج دنیا میں اُلٹی گنگا بہہ رہی ہے، اور آج یہ سبق قوم کو پڑھایا جا رہا ہے کہ ہر شخص اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے کے لیے جھنڈا لے کر کھڑا ہو جائے کہ مجھے میرے حقوق ملنے چاہئیں، اس کے نتیجے میں وہ اس بات سے بے پرواہ ہے کہ میرے ذمے کیا فرائض اور حقوق عائد ہوتے ہیں؟ مجھ سے کیا مطالبات ہیں؟ مزدور یہ نعرہ لگا رہا ہے کہ میرے حقوق مجھے ملنے چاہئیں، آجر کہہ رہا ہے کہ مجھے میرے حقوق ملنے چاہئیں، لیکن نہ مزدور کو اپنے فرائض کی پرواہ ہے اور نہ آجر کو اپنے فرائض کی پرواہ ہے، آج مزدور کو یہ حدیث تو خوب یاد ہے کہ مزدور کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دو، لیکن اس کی فکر نہیں کہ جو کام اس نے کیا ہے اس میں پسینہ بھی نکلا یا نہیں؟ اس کو اس کی فکر نہیں کہ میں نے جو کام کیا ہے، وہ واقعۃً اس لائق ہے کہ اس پر مزدوری دی جائے؟

ہر انسان اپنا جائزہ لے

لہٰذا ہر انسان اپنا جائزہ لے، اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھے کہ میں جو کام کر رہا ہوں، وہ درست ہے یا نہیں؟ اگر ایک شخص دفتر میں کام کر رہا ہے اس کو اس کی فکر تو ہوتی ہے کہ میری تنخواہ بڑھنی چاہیے، میرا فلاں گریڈ ہونا چاہیے، مجھے اتنی ترقیاں ملنی چاہئیں، لیکن کیا اس ملازم نے کبھی یہ بھی سوچا کہ دفتر کے اندر جو فرائض میرے ذمے عائد ہیں، وہ فرائض میں ٹھیک طریقے پر ادا کر رہا ہوں یا نہیں؟ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج لوگوں کے حقوق پامال ہو رہے ہیں، آج کسی کو اپنا حق نہیں مل رہا ہے، جبکہ حضور اقدس ﷺ کا طریقہ ہے کہ ہر ایک کو اس کے فرائض سے باخبر فرماتے ہیں کہ تمہارا یہ فریضہ ہے، لہٰذا تم اپنے اس فریضے کو ادا کرو۔ صرف یہی طریقہ ہے جو معاشرے کو اصلاح کی طرف لا سکتا ہے۔

بہر حال! حضور اقدس ﷺ نے اس حدیث میں ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ حلیم اور بردبار کوئی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ لوگوں کی نافرمانیاں اور ان کے کفر و شرک کو دیکھ رہے ہیں، لیکن پھر بھی صبر کرتے ہیں اور ان کو عافیت اور رزق دیتے ہیں۔ لہٰذا تم بھی اللہ تعالیٰ کے ان اخلاق کو اپنے اندر پیدا کریں اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

☆☆

خاندانی اختلافات کا چوتھا حل
معاملات کی صفائی ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

گزشتہ چند ہفتوں سے خاندانی اختلافات کے مختلف اسباب کا بیان چل رہا ہے۔ ہمارے خاندانوں میں جو اختلافات اور جھگڑے پھیلے ہوئے ہیں ان کی ایک بہت بڑی وجہ شریعت کے ایک اور حکم کا لحاظ نہ رکھنا ہے۔ شریعت کا وہ حکم یہ ہے:

"تَعَاشَرُوْا كَالْاَخْوَانِ، تَعَامَلُوْا كَالْاَجَانِبِ"

تم آپس میں تو بھائیوں کی طرح رہو اور ایک دوسرے کے ساتھ بھائیوں جیسا برتاؤ کرو، اخوت اور محبت کا برتاؤ کرو، لیکن جب لین دین کے معاملات پیش آئیں، اور خرید وفروخت اور کاروباری معاملات آپس میں پیش آئیں تو اس وقت اجنبیوں کی طرح معاملہ کریں، اور معاملہ بالکل صاف ہونا چاہیے، اس میں کوئی اجمال، ابہام اور پیچیدگی نہ ہو، بلکہ جو بات ہو، وہ صاف ہو۔ یہ نبی کریم ﷺ کی بڑی زبردست تعلیم ہے۔

ملکیت ممتاز ہونی چاہیے

اور نبی کریم ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ مسلمانوں کی ایک ایک بات واضح اور صاف ہونی چاہیے۔ ملکیتیں الگ الگ ہونی چاہئیں، اور کون سی چیز کس کی ملکیت ہے، یہ واضح ہونا چاہیے۔ شریعت کے اس حکم کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے آج ہمارا معاشرہ فسادات اور جھگڑوں سے بھرا ہوا ہے۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۱/ ۲۶۷ تا ۲۷۸) بعد از نماز عصر، جامع دار العلوم، کراچی

باپ بیٹے کا مشترک کاروبار

مثلاً ایک کاروبار باپ نے شروع کیا، اب بیٹوں نے بھی اس کاروبار میں کام شروع کر دیا، اب یہ متعین نہیں ہے کہ بیٹا جو باپ کے کاروبار میں کام کر رہا ہے، وہ بحیثیت پارٹنر اور شریک کے کام کر رہا ہے، یا ویسے ہی باپ کی مدد کر رہا ہے، یا بیٹا بحیثیت ملازم کے باپ کے ساتھ کام کر رہا ہے اور اس کی تنخواہ مقرر ہے۔ ان میں سے کوئی بات طے نہیں ہوئی اور معاملہ اندھیرے میں ہے۔ اب دن رات باپ بیٹے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں، باپ کو جتنے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے، وہ کاروبار میں سے اتنے پیسے نکال لیتا ہے اور جب بیٹے کو ضرورت ہوتی ہے وہ نکال لیتا ہے، اب اسی طرح کام کرتے ہوئے سالہا سال گزر گئے اور رفتہ رفتہ دوسرے بیٹے بھی اس کاروبار میں آ کر شامل ہوتے رہے، اب کوئی بیٹا پہلے آیا، کوئی بعد میں آیا، کسی بیٹے نے زیادہ کام کیا اور کسی بیٹے نے کم کام کیا۔

اب حساب کتاب آپس میں کچھ نہیں رکھا، بس جس کو جتنی رقم کی ضرورت ہوتی وہ اتنی رقم کاروبار میں سے نکال لیتا، اور یہ بھی متعین نہیں کیا کہ اس کاروبار کا مالک کون ہے اور کس کی کتنی ملکیت ہے؟ اور نہ یہ معلوم کہ کاروبار میں کس کا کتنا حصہ ہے؟ نہ یہ معلوم کہ کس کی تنخواہ کتنی ہے؟ اب اگر دوسرا ان سے کہے کہ آپس میں حساب و کتاب رکھو، تو جواب یہ دیا جاتا ہے کہ بھائیوں کے درمیان کیا حساب و کتاب، باپ بیٹے میں کیا حساب و کتاب، یہ تو دوئی کی اور عیب کی بات ہے کہ باپ بیٹے یا بھائی بھائی آپس میں حساب و کتاب کریں، ایک طرف ایسی محبت کا اظہار ہے۔

بعد میں جھگڑے کھڑے ہو گئے

لیکن جب دس بارہ سال گزر گئے، شادیاں ہو گئیں، بچے ہو گئے، یا باپ جنہوں نے کاروبار شروع کیا تھا، دنیا سے چل بسے، تو اب بھائیوں کے درمیان لڑائی جھگڑے کھڑے ہو گئے اور اب ساری محبت ختم ہو گئی اور ایک دوسرے پر الزام عائد کرنے شروع کر دیئے کہ اس نے زیادہ لے لیا، میں نے کم لیا، فلاں بھائی زیادہ کھا گیا، میں نے کم کھایا، اب یہ جھگڑے ایسے شروع ہوئے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتے، اور ایسے پیچیدہ ہو گئے کہ اصل حقیقت کا پتہ ہی نہیں چلتا، آخر میں جب معاملہ تناؤ پر آ گیا اور ایک دوسرے سے بات چیت کرنے اور شکل وصورت دیکھنے کے بھی روادار نہیں رہے، اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے، تو آخر میں مفتی صاحب کے پاس آ گئے کہ اب آپ مسئلہ بتائیں کہ کیا کریں؟ اب مفتی صاحب مصیبت میں پھنس گئے۔ بھائی! جب کاروبار شروع کیا

تھا، اس وقت تو ایک دن بھی بیٹھ کر یہ نہیں سوچا کہ تم کس حیثیت میں کاروبار کر رہے ہو؟ اب جب معاملہ الجھ گیا تو مفتی بیچارہ کیا بتائے کہ کیا کریں۔

معاملات صاف ہونے چاہئیں

یہ سارے جھگڑے اس لیے کھڑے ہوئے کہ شریعت کے اس حکم پر عمل نہیں کیا کہ معاملات صاف ہونے چاہئیں۔ چاہے کاروبار باپ بیٹے کے درمیان ہو یا بھائی بھائی کے درمیان ہو یا شوہر اور بیوی کے درمیان ہو، لیکن ہر ایک کی ملکیت دوسرے سے ممتاز ہونی چاہیے، کس کا کتنا حق ہے؟ وہ معلوم ہونا چاہیے۔ یاد رکھئے! بغیر حساب و کتاب کے جو زندگی گزر رہی ہے، وہ گناہ کی زندگی گزر رہی ہے، اس لیے کہ یہ معلوم ہی نہیں کہ جو کھا رہے ہو وہ اپنا حق کھا رہے ہو یا دوسرے کا حق کھا رہے ہو۔

میراث فوراً تقسیم کر دیں

شریعت کا حکم یہ ہے کہ جونہی کسی کا انتقال ہو جائے، فوراً اس کی میراث تقسیم کریں، اور شریعت نے جس کا جتنا حق رکھا ہے وہ ادا کریں۔ مجھے یاد ہے کہ جب میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا تو میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تعزیت کے لیے تشریف لائے، ابھی تدفین نہیں ہوئی تھی، جنازہ رکھا ہوا تھا، اس وقت حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت ناساز تھی، کمزوری تھی، اور ساتھ میں حضرت والد صاحب کی وفات کے صدمے کا بھی طبیعت پر بڑا اثر تھا، حضرت والد صاحب کا خمیرہ رکھا ہوا تھا ہم وہ خمیرہ حضرت ڈاکٹر صاحب کے پاس لے گئے کہ حضرت تھوڑا سا کھا لیں تاکہ کمزوری دور ہو جائے۔

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خمیرہ ہاتھ میں لینے سے پہلے فرمایا کہ بھائی! اب اس خمیرہ کا کھانا میرے لیے جائز نہیں، کیونکہ یہ خمیرہ اب ورثاء کی ملکیت ہو گیا اور جب تک سارے ورثاء اجازت نہ دیں اس وقت تک میرے لیے اس کا کھانا جائز نہیں ہے۔ ہم نے عرض کیا کہ حضرت! سارے ورثاء بالغ ہیں اور سب یہاں موجود ہیں، اور سب بخوشی اجازت دے رہے ہیں، لہٰذا آپ تناول فرمالیں، تب جا کر آپ نے وہ خمیرہ تناول فرمایا۔ بہر حال! اللہ تعالیٰ نے میراث تقسیم کرنے کی تاکید فرمائی کہ کسی کے انتقال پر فوراً اس کی میراث وارثین کے درمیان تقسیم کریں تاکہ بعد میں کوئی جھگڑا پیدا نہ ہو۔

میراث جلد تقسیم نہ کرنے کا نتیجہ

لیکن آج ہمارے معاشرے میں جہالت اور نادانی کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کسی کے مرنے پر اس کے وارثین سے یہ کہا جائے کہ بھائی میراث تقسیم کریں، تو جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ توبہ، توبہ، ابھی تو مرنے والے کا کفن بھی میلا نہیں ہوا اور تم نے میراث کی تقسیم کی بات شروع کر دی۔ چنانچہ میراث کی تقسیم کو دنیاوی کام قرار دے کر اس کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اب ایک طرف تو اتنا تقویٰ ہے کہ یہ کہہ دیا کہ ابھی تو مرنے والے کا کفن بھی میلا نہیں ہوا، اس لیے مال و دولت کی بات ہی نہ کریں، اور دوسری طرف یہ حال ہے کہ جب میراث تقسیم نہیں ہوئی اور مشترکہ طور پر استعمال کرتے رہے تو سال کے بعد وہی لوگ جو مال و دولت کی تقسیم سے بہت اعراض برت رہے تھے، وہی لوگ اسی مال و دولت کے لیے ایک دوسرے کا خون پینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، اور ایک دوسرے پر الزام تراشی کرنے لگتے ہیں کہ فلاں زیادہ کھا گیا، فلاں نے کم کھایا۔

گھر کے سامان میں ملکیتوں کا امتیاز

لہٰذا شریعت نے میراث کی تقسیم کا فوری حکم اس لیے دیا تاکہ ملکیتیں ممتاز ہو جائیں، اور ہر شخص کی ملکیت واضح ہو کہ کون سی چیز کس کی ملکیت ہے۔ آج ہمارے معاشرے کا یہ حال ہے کہ میاں بیوی کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ گھر کا کون سا سامان میاں کا ہے اور کون سا بیوی کا ہے، زیور میاں کا ہے یا بیوی کا ہے، جس گھر میں مقیم ہیں، اس کا مالک کون ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعد میں جھگڑے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی احتیاط

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی بات یاد آ گئی، آخر زمانے میں وفات سے کچھ عرصہ پہلے بیمار تھے، اور بستر پر تھے، اور اپنے کمرے ہی کے اندر محدود ہو کر رہ گئے تھے، اس کمرے میں ایک چارپائی ہوتی تھی، اسی چارپائی پر سارے کام انجام دیتے تھے، والد صاحب کے کمرے کے برابر میں میرا ایک چھوٹا سا کمرہ ہوتا تھا، میں اس میں بیٹھا رہتا تھا۔ کھانے کے وقت جب والد صاحب کے لیے ٹرے میں کھانا لایا جاتا، تو آپ کھانا تناول فرماتے اور کھانے کے بعد فرماتے کہ یہ برتن جلدی سے واپس اندر لے جاؤ، یا مدرسہ سے کوئی کتاب یا کوئی چیز منگوائی تو فارغ ہوتے ہی فرماتے کہ اس کو جلدی سے

واپس کر دو، یہاں مت رکھو۔ بعض اوقات ہمیں وہ برتن یا کتاب وغیرہ واپس لے جانے میں تاخیر ہو جاتی تو ناراضگی کا اظہار فرماتے کہ دیر کیوں کی، جلدی لے جاؤ۔

ہمارے دل میں بعض اوقات یہ خیال آتا کہ والد صاحب برتن اور کتاب واپس کرنے میں بہت جلدی کرتے ہیں، اگر پانچ سات منٹ تاخیر ہو جائے گی تو کون سی قیامت آ جائے گی۔ اس دن یہ عُقدہ کھلا جب آپ نے ایک دن ہم سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں نے اپنے وصیت نامے میں یہ بات لکھی ہوئی ہے کہ یہ میرا کمرہ جس میں میری چارپائی ہے، اس کمرے کے اندر جو اشیاء ہیں، صرف یہ اشیاء میری ملکیت ہیں، اور گھر کی باقی سب اشیاء میں اپنی اہلیہ کی ملکیت کر چکا ہوں۔ اب اگر میرا انتقال اس حالت میں ہو جائے کہ میرے کمرے میں باہر کی کوئی چیز پڑی ہوئی ہو تو اس وصیت نامے کے مطابق لوگ یہ سمجھیں گے کہ یہ میری ملکیت ہے، اور پھر اس چیز کے ساتھ میری ملکیت جیسا معاملہ کریں گے۔ اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ میرے اس کمرے میں کوئی باہر کی چیز دیر تک پڑی نہ رہے، جو چیز بھی آئے وہ جلدی واپس چلی جائے۔

بہر حال! ملکیت واضح کرنے کا اس درجہ اہتمام تھا کہ بیٹوں کی ملکیت سے، بیوی کی ملکیت سے، ملنے جلنے والوں کی ملکیت سے بھی اپنی ملکیت ممتاز تھی، الحمدللہ، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ کبھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔

بھائیوں کے درمیان بھی حساب صاف ہو

لہٰذا شریعت نے ہمیں یہ حکم دیا کہ اپنی ملکیت واضح ہونی چاہیے۔ جب یہ مسئلہ ہم اپنے ملنے جلنے والوں کو بتاتے ہیں کہ بھائی! اپنا حساب کتاب صاف کر لو اور بات واضح کر لو، تو جواب میں کہتے ہیں کہ یہ حساب کتاب کرنا دوئی اور غیریت کی بات ہے۔ لیکن چند ہی سالوں کے بعد یہ ہوتا ہے کہ وہی لوگ جو اس وقت اپنائیت کا مظاہرہ کر رہے تھے، ایک دوسرے کے خلاف تلوار لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا آپس کے اختلافات اور جھگڑوں کا ایک بہت بڑا سبب ملکیتوں کو صاف نہ رکھنا ہے۔

مکان کی تعمیر اور حساب کی صفائی

یا مثلاً ایک مکان تعمیر ہو رہا ہے، اس ایک مکان میں کچھ پیسے باپ نے لگائے، کچھ پیسے ایک بیٹے نے لگائے، کچھ پیسے دوسرے بیٹے نے لگائے، کچھ پیسے کہیں سے قرض لے لیے، اور اس طرح وہ مکان تعمیر ہو گیا، اس وقت آپس میں کچھ طے نہیں کیا کہ بیٹے اس تعمیر میں جو پیسے لگا رہے ہیں، وہ

قرض کے طور پر لگا رہے ہیں؟ یا باپ کی مدد کر رہے ہیں؟ یا وہ بیٹے اس مکان میں اپنا حصہ لگا کر پارٹنر بننا چاہتے ہیں؟ اس کا کچھ پتہ نہیں، اور پیسے سب کے لگ رہے ہیں، لیکن کوئی بات واضح نہیں ہے۔ جب ان میں سے ایک کا انتقال ہوا تو اب جھگڑا کھڑا ہو گیا کہ یہ مکان کس کا ہے؟ ایک کہتا ہے کہ میں نے اس مکان میں اتنے پیسے لگائے ہیں، دوسرا کہتا ہے کہ میں نے اتنے پیسے لگائے ہیں، تیسرا کہتا ہے کہ زمین تو میں نے خریدی تھی، اور اس جھگڑے کے نتیجے میں ایک فساد برپا ہو گیا۔ اس وقت فیصلے کے لیے مفتی کے پاس پہنچتے ہیں کہ اب آپ بتائیں کہ اس کا کیا حل ہے؟ ایسے وقت میں فیصلہ کرتے وقت بعض اوقات ناانصافی ہو جاتی ہے۔

لہٰذا یہ مسئلہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ شریعت کا قاعدہ یہ ہے کہ باپ کے کاروبار میں بیٹا کام کر رہا ہے، اور بات واضح ہوئی نہیں کہ وہ بیٹا کس حیثیت میں کام کر رہا ہے؟ آیا وہ باپ کا شریک ہے یا باپ کا ملازم ہے، تو اگر بیٹا ساری عمر بھی اس طرح کام کرتا رہے تو یہ سمجھا جائے گا کہ اس نے للہ فی اللہ باپ کی مدد کی ہے، کاروبار میں اس کا کچھ حصہ نہیں ہے۔ لہٰذا پہلے سے بات واضح کرنی چاہیے۔

دوسرے کو مکان دینے کا صحیح طریقہ

اور اگر وضاحت کرتے ہوئے تقسیم کا معاملہ کرنا ہے تو تقسیم کرنے کے لیے بھی شریعت نے طریقہ بتایا ہے کہ تقسیم کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ محض یہ کہہ دینے سے نہیں ہوتا کہ میں نے تو اپنا مکان بیوی کے نام کر دیا تھا، یعنی اس کے نام مکان رجسٹری کرا دیا تھا، اب رجسٹری کرا دینے سے وہ یہ سمجھے کہ وہ مکان بیوی کے نام ہو گیا، حالانکہ شرعی اعتبار سے کوئی مکان کسی کے نام رجسٹری کرانے سے اس کی طرف منتقل نہیں ہوتا، جب تک اس پر اس کا قبضہ نہ کرا دیا جائے، اور اس سے یہ نہ کہا جائے کہ میں نے یہ مکان تمہاری ملکیت کر دیا، اب تم اس کے مالک ہو۔ اس کے بغیر دوسرے کی ملکیت اس پر نہیں آتی۔

تمام مسائل کا حل، شریعت پر عمل

ان سارے مسائل کا آج لوگوں کو علم نہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ الل ٹپ معاملہ چل رہا ہے اور اس کے نتیجے میں لڑائی جھگڑے ہو رہے ہیں، فتنہ اور فساد پھیل رہا ہے، اور معاشرے میں بگاڑ پیدا ہو رہا ہے، آپس میں مقدمہ بازیاں چل رہی ہیں۔ اگر آج لوگ شریعت پر ٹھیک ٹھیک عمل کر لیں تو

آدھے سے زیادہ مقدمات تو خود بخود ختم ہو جائیں۔

یہ خرابیاں اور جھگڑے تو ان لوگوں کے معاملات میں ہیں جن کی نیت خراب نہیں ہے، وہ لوگ جان بوجھ کر دوسروں کا مال دبانا نہیں چاہتے، البتہ جہالت کی وجہ سے انہوں نے ایسا طریقہ اختیار کیا کہ اس کے نتیجے میں لڑائی جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ لیکن جو لوگ بددیانت ہیں، جن کی نیت ہی خراب ہے، جو دوسروں کا مال ہڑپ کرنا چاہتے ہیں، ان کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہیں۔

خلاصہ

بہرحال! یہ بہت بڑا فساد ہے جو آج ہمارے معاشرے میں پھیلا ہوا ہے۔ اس مسئلے کو خود بھی اچھی طرح سمجھنا چاہیے اور اپنے تمام ملنے جلنے والوں اور اعزہ رشتہ داروں کو یہ مسئلہ بتانا چاہیے کہ ایک مرتبہ حساب صاف کرلیں اور پھر آپس میں محبت کے ساتھ معاملات کریں، لیکن حساب صاف ہونا چاہیے اور ہر بات واضح ہونی چاہیے، کوئی بات مجمل اور مبہم نہ رہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

☆☆☆

خاندانی اختلافات کا پانچواں حل
جھگڑے اور بے تکلفی سے اجتناب ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

گزشتہ چند ہفتوں سے خاندانی اختلافات کے مختلف اسباب کا بیان چل رہا ہے، ان اسباب میں سے ایک سبب وہ ہے جو حضور اقدس ﷺ نے اس حدیث میں بیان فرمایا ہے، وہ حدیث یہ ہے:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا تُمَارِ اَخَاكَ وَلَا تُمَازِحْهُ وَلَا تَعِدْهُ مَوْعِداً فَتُخْلِفَهُ))(۱)

اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے تین حکم ارشاد فرمائے، پہلا حکم یہ دیا کہ اپنے کسی بھائی سے جھگڑا مت کر۔ دوسرا حکم یہ دیا کہ اس کے ساتھ نامناسب مذاق مت کریں۔ تیسرا حکم یہ دیا کہ اس کے ساتھ کوئی ایسا وعدہ نہ کریں جس کو پورا نہ کرسکو، یعنی وعدہ خلافی نہ کریں۔

اپنے بھائی سے جھگڑا نہ کریں

پہلا حکم یہ دیا کہ

((لَا تُمَارِ أَخَاكَ))

''اپنے بھائی سے جھگڑا نہ کریں''

یہ ہماری اردو زبان بہت تنگ زبان ہے، جب ہم عربی سے اردو میں ترجمہ کرتے ہیں تو ہمارے پاس بہت محدود الفاظ ہوتے ہیں، اس لیے ہمیں اس تنگ دائرے میں رہ کر ہی ترجمہ کرنا پڑتا

☆ اصلاحی خطبات (۱۱/۲۸۰ تا ۲۹۹) بعد از نمازِ عصر، جامع دار العلوم، کراچی

(۱) سنن الترمذی، کتاب البر والصلة، عن رسول الله، باب ماجاء فی المراء، رقم: ۱۹۱۸

ہے، لہٰذا اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے یہ لفظ ''لاتمار'' ارشاد فرمایا، اس کے ترجمہ کے لیے ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی لفظ نہیں ہے کہ ''جھگڑا نہ کریں۔'' لیکن عربی زبان میں یہ لفظ ''مراء'' سے نکلا ہے جو اس کا مصدر ہے، اور ''مراء'' کا لفظ بہت وسیع معنی رکھتا ہے، اس کے اندر ''بحث و مباحثہ کرنا'' مجادلہ کرنا، جسمانی لڑائی لڑنا، زبانی تو تکار کرنا، یہ سب اس کے مفہوم کے اندر داخل ہیں، لہٰذا چاہے جسمانی جھگڑا ہو، یا زبانی جھگڑا ہو، یا بحث و مباحثہ ہو، یہ تینوں چیزیں مسلمانوں کے درمیان باہمی اتفاق و اتحاد، محبت اور ملاپ پیدا کرنے میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ لہٰذا حتیٰ الامکان اس بات کی کوشش کریں کہ جھگڑا کرنے کی نوبت نہ آئے۔

ہاں! بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ ایک موقع پر انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا حق پامال ہو گیا ہے، اگر وہ عدالت میں اس کے خلاف مقدمہ نہیں کرے گا تو صحیح طور پر زندگی نہیں گزار سکے گا، اس کے ساتھ ناانصافی ہوگی اور اس کے ساتھ ظلم ہوگا، تو اس ظلم اور زیادتی کی وجہ سے مجبوراً اس کو عدالت میں جانا پڑے تو یہ اور بات ہے، ورنہ حتیٰ الامکان جھگڑا چکاؤ، جھگڑے میں پڑنے سے پرہیز کریں۔

بحث ومباحثہ سے اجتناب کیجئے

یہ ہدایت خاص طور پر ان لوگوں کو دی جا رہی ہے جو دوسروں کی ہر بات میں کجی نکالتے ہیں، اور دوسروں کی ہر بات کو رد کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ چیز ان کے مزاج کا ایک حصہ بن جاتی ہے کہ دوسرے سے ضرور بحث کرنی ہے، ذرا سی بات لے کر بیٹھ گئے، اور اس پر بحث و مباحثہ کا ایک محل تعمیر کر لیا۔ ہمارے معاشرے میں یہ جو فضول بحثوں کا رواج چل پڑا ہے، نہ ان کا دین سے کوئی تعلق، نہ دنیا سے کوئی تعلق، جن کے بارے میں نہ قبر میں سوال ہوگا، نہ حشر میں سوال ہوگا، نہ آخرت میں سوال ہوگا، لیکن ان کے بارے میں لمبی لمبی بحثیں ہو رہی ہے، یہ سب فضول کام ہے، اس کے نتیجے میں لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں اور فرقے بن جاتے ہیں اور آپس میں منافرت بڑھتی ہے۔

جھگڑے سے علم کا نور چلا جاتا ہے

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ ہے:

''اَلْمِرَاءُ وَالْجِدَالُ فِي الْعِلْمِ يُذْهِبُ بِنُوْرِ الْعِلْمِ''(۱)

یعنی یہ بحث و مباحثہ علم کے نور کو غارت کر دیتا ہے، علم کا نور اس کے ساتھ موجود نہیں رہتا۔

---

(۱) ترتيب المدارك وتقريب المسالك(۵۱/۱)

بس جس بات کو تم حق سمجھتے ہو، اس کو حق طریقے سے اور حق نیت سے دوسرے کو بتا دو کہ میرے نزدیک یہ حق ہے، اب دوسرا شخص اگر مانتا ہے تو مان لے، نہیں مانتا تو وہ جانے اس کا اللہ جانے، کیونکہ تم داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے کہ لوگوں کی اصلاح تمہارے ذمے فرض ہو، کہ اگر ان کی اصلاح نہیں ہوگی تو تم سے پوچھا جائے گا، ایسا نہیں ہے۔

تمہاری ذمہ داری بات پہنچا دینا ہے

ارے جب اللہ تعالیٰ نے یہ فرما دیا:

﴿مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغ﴾(۱)

رسول پر صرف بات پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے، زبردستی کرنا انبیاء علیہم السلام کا کام نہیں، تو تم کیوں زبردستی کرتے ہو، لہٰذا ایک حد تک سوال و جواب کریں، اور جب یہ دیکھو کہ بات بحث ومباحثہ کے حدود میں داخل ہو رہی ہے اور سامنے والا شخص حق کو قبول کرنے والا نہیں ہے تو اس کے بعد خاموش ہو جاؤ اور بحث ومباحثہ کا دروازہ بند کر دو۔

شکوہ وشکایت نہ کریں

بعض لوگوں کو ہر بات میں شکوہ اور شکایت کرنے کی عادت ہوتی ہے، جہاں کسی جاننے والے سے ملاقات ہوئی تو فوراً کوئی شکایت جڑ دیں گے کہ تم نے فلاں وقت یہ کیا تھا، تم نے فلاں وقت یہ نہیں کیا تھا، اور بسا اوقات یہ کام محبت کے نام پر کیا جاتا ہے، اور یہ جملہ ایسے لوگوں کو بہت یاد ہوتا ہے کہ ''شکایت محبت ہی سے پیدا ہوتی ہے'' جس سے محبت ہوتی ہے اس سے شکوہ بھی ہوتا ہے۔ یہ بات تو درست ہے، لیکن اس شکایت کی بھی ایک حد ہوتی ہے، جب کوئی اہم بات ہوئی تو اس پر شکوہ کر لیا، لیکن ذرا ذرا سی بات لے کر بیٹھ جانا کہ فلاں تقریب میں تم نے فلاں کو دعوت دی اور ہمیں دعوت نہیں دی۔ ارے بھائی! دعوت دینے والے کو شریعت نے یہ حق دیا ہے کہ جس کو چاہے دعوت دے اور جس کو چاہے دعوت نہ دے، ہمارے پاس شکایت کرنے کا کیا جواز ہے کہ تم یہ کہو کہ ہمیں دعوت میں کیوں نہیں بلایا تھا؟ بھائی تمہیں اس لیے نہیں بلایا تھا کہ تمہیں بلانے کا دل نہیں چاہا، اس وقت تمہیں بلانے کے حالات نہیں تھے، لیکن تم اس شکایت کو لیے بیٹھے ہو۔ آج ہم لوگ ذرا ذرا سی بات پر دوسرے کی شکایت کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، اس کے نتیجے میں سامنے والے اس سے

---

(۱) المائدۃ: ۹۹

شکایت کرتے ہیں کہ فلاں موقع پر تم نے بھی ہمیں نہیں بلایا تھا، چنانچہ شکوہ اور جواب شکوہ کا ایک سلسلہ چل پڑتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دلوں میں محبت پیدا ہونے کے بجائے عداوت پیدا ہو رہی ہے اور آپس میں نفرت پیدا ہو رہی ہے۔

اپنے بھائی کے عمل کی تاویل کرلیں

آج میں تجربہ کی بات کہہ رہا ہوں کہ اس کے نتیجے میں گھرانے کے گھرانے اجڑ گئے، ذرا ذرا سی بات لیئے بیٹھے ہیں۔ ارے بھائی! اگر کسی سے غلطی ہوگئی ہے تو اس کو معاف کر دو اور اس کو اللہ کے حوالے کر دو۔

جناب رسول اللہ ﷺ نے معاف کرنے کی کتنی تلقین فرمائی ہے، لہٰذا اگر تم معاف کر دو گے تو تمہارا کیا بگڑ جائے گا، تمہارا کیا نقصان ہو جائے گا، کون سا پہاڑ تم پر ٹوٹ پڑے گا، کون سی قیامت تم پر آ جائے گی؟ لہٰذا چشم پوشی کر جاؤ، اور اس کے عمل کی کوئی تاویل تلاش کرلو کہ شاید اس وجہ سے دعوت نہیں دی ہوگی وغیرہ۔

مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا طرز عمل

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ تھے حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، جو دارالعلوم دیوبند کے مفتی اعظم تھے۔ جن کے فتاویٰ کا مجموعہ ''فتاویٰ دارالعلوم دیوبند'' کے نام سے دس جلدوں میں چھپ گیا ہے، جس میں علوم کے دریا بہا دیئے، یہ عجیب وغریب بزرگ تھے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے ان کو ہمیشہ اس طرح دیکھا کہ کبھی کسی آدمی کی منہ پر تردید نہیں کرتے تھے کہ تم نے یہ بات غلط کہی، بلکہ اگر کسی نے غلط بات بھی کہہ دی تو آپ سن کر فرماتے کہ اچھا گویا کہ آپ کا مطلب یہ ہوگا، اس طرح اس کی تاویل کر کے اس کا صحیح مطلب اس کے سامنے بیان کر دیتے۔ اس کے ذریعے اس کو تنبیہ بھی فرما دیتے کہ تم نے جو بات کہی ہے وہ صحیح نہیں ہے، لیکن اگر یہ بات اس طرح کہی جائے تو صحیح ہو جائے گی۔ ساری عمر کبھی کسی کے منہ پر تردید نہیں فرمائی۔

اپنا دل صاف کرلیں

اس لیے اگر تمہارا کوئی مسلمان بھائی ہے، دوست ہے، یا عزیز وقریب ہے، یا رشتہ دار ہے، اگر اس سے کوئی غلط معاملہ سرزد ہوا ہے تو تم بھی اس کی کوئی تاویل تلاش کرلو کہ شاید فلاں مجبوری پیدا

ہوگئی ہوگی، تاویل کر کے اپنا دل صاف کرلو۔ اور اگر شکایت کرنی ہی ہے تو نرم لفظوں میں اس سے شکایت کرلو کہ فلاں وقت تمہاری بات مجھے ناگوار گزری، اگر کوئی وضاحت پیش کرے تو اس کو قبول کر لو، یہ نہ کریں کہ اس شکایت کو لے کر بیٹھ جاؤ اور اس کی بنیاد پر جھگڑا کھڑا کردو۔ اسی لیے جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ((لَا تُمَارِ اَخَاكَ)) اپنے بھائی سے جھگڑا نہ کریں۔

یہ زندگی چند روزہ ہے!

میاں! یہ دنیا کتنے دن کی ہے، چند دن کی دنیا ہے، کتنے دن کی گارنٹی لے کر آئے کہ اتنے دن زندہ رہو گے، اور عام طور پر شکایتیں دنیا کی باتوں پر ہوتی ہیں کہ فلاں نے مجھے دعوت میں نہیں بلایا، فلاں نے میری عزت نہیں کی، فلاں نے میرا احترام نہیں کیا، یہ سب دنیا کی باتیں ہیں۔ یہ دنیا کا مال و دولت، دنیا کے اسباب، دنیا کی وجاہت، دنیا کی شہرت، دنیا کا منصب، ان سب کی کوئی حقیقت نہیں ہے، نہ جانے کب فنا ہو جائیں، کب یہ چیزیں چھن جائیں۔ اس کے بجائے وہاں کے بارے میں سوچو جہاں ہمیشہ رہنا ہے، جہاں ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی گزارنی ہے، وہاں کیا حال ہوگا؟ وہاں کس طرح زندگی بسر کریں گے؟ وہاں پر اللہ تعالیٰ کے سامنے کیا جواب دو گے؟ اس کی فکر کریں۔ حدیث شریف میں جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِعْمَلْ لِدُنْيَاكَ بِقَدْرِ مَقَامِكَ فِيْهَا وَاعْمَلْ لِآخِرَتِكَ بِقَدْرِ بَقَائِكَ فِيْهَا))(۱)

''یعنی دنیا کے لیے اتنا کام کریں جتنا دنیا میں رہنا ہے اور آخرت کے لیے اتنا کام کریں جتنا آخرت میں رہنا ہے''

یاد رکھئے! یہ مال و دولت، یہ شہرت، یہ عزت، سب آنی جانی چیزیں ہیں، آج ہیں کل نہیں رہیں گی۔

زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے

وہ لوگ جن کا دنیا میں ڈنکا بج رہا تھا، جن کا طوطی بول رہا تھا، جن کا اقتدار تھا، جن کے نام سے لوگ لرزتے تھے، آج جیل خانوں میں پڑے سڑ رہے ہیں، اور جن لوگوں کے ناموں کے ساتھ عزت و شرف کے القاب لگائے جاتے تھے، آج ان پر جرائم کی فہرستوں کے انبار لگے ہوئے ہیں کہ انہوں نے چوری کی، انہوں نے ڈاکہ ڈالا، انہوں نے رشوت لی، انہوں نے خیانت کی۔ ارے! کس

(۱) بريقة محمودية في شرح طريقة محمدية وشريعة نبوية (۲۸۳/۴)، تفسير حقي (۱۴۹/۱۲)

عزت پر، کس شہرت پر، کس پیسے پر لڑتے ہو، نہ جانے کس دن اور کس وقت اللہ تعالیٰ یہ چیزیں تم سے چھین لے، ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر تم نے جھگڑے کھڑے کیے ہوئے ہیں، ان باتوں پر تم نے خاندان اجاڑے ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((لَا تُمَارِ اَخَاكَ))

''اپنے بھائی سے جھگڑا مت کریں''

کون سا مذاق جائز ہے؟

اس حدیث میں سرکار دو عالم ﷺ نے دوسرا حکم یہ دیا:

((وَلَا تُمَازِحْهُ))

''اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ دل لگی اور مذاق نہ کریں''

اس حدیث میں ''مذاق'' سے مراد وہ مذاق ہے جو دوسرے کی گرانی کا سبب ہو، اگر ایسا مذاق ہے جو حدود شریعت کے اندر ہے اور خوش طبعی کے لیے کیا جا رہا ہے، سننے والے کو بھی اس سے کوئی گرانی نہیں ہے تو ایسے مذاق میں کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ اگر وہ مذاق حق ہے اور اس مذاق میں دوسرے کو خوش کرنے کی نیت ہے تو اس پر ثواب بھی ملے گا۔

مذاق اڑانا اور تمسخر کرنا جائز نہیں

ایک ہوتا ہے مذاق کرنا، ایک ہوتا ہے مذاق اڑانا، مذاق کرنا تو درست ہے، لیکن کسی کا مذاق اڑانا کہ اس کے ذریعہ اس کا استہزاء کیا جائے اور اس کے ساتھ ایسا مذاق اور ایسی دل لگی کی جائے جو اس کے لیے ناگوار ہو اور اس کی دل شکنی کا سبب ہو، ایسا مذاق حرام اور ناجائز ہے۔ بعض لوگ دوسرے کی چھیڑ بنا لیتے ہیں، اور یہ سوچتے ہیں کہ جب اس کے سامنے یہ بات کریں گے تو وہ غصہ ہوگا اور اس کے نتیجے میں ہم ذرا مزہ لیں گے، یہ وہ مذاق ہے جس کو حضور اقدس ﷺ منع فرما رہے ہیں۔ اتنا مذاق کریں جس کو دوسرا آدمی برداشت کر سکے، اب آپ نے دوسرے کے ساتھ اتنا مذاق کیا کہ اس کے نتیجے میں اس کو زچ کر دیا، اب وہ اپنے دل میں تنگی محسوس کر رہا ہے، تو یاد رکھئے! اگرچہ اس مذاق کے نتیجے میں دنیا میں تمہیں تھوڑا بہت مزہ آ رہا ہے، لیکن آخرت میں اس کا عذاب بڑا شدید ہے، العیاذ باللہ۔ کیونکہ اس کے ذریعہ سے تم نے ایک مسلمان کا دل دکھایا اور مسلمان کا دل دکھانا بڑا سخت گناہ ہے۔

مسلمان کی عزت ”بیت اللہ“ سے زیادہ

ابن ماجہ میں ایک حدیث ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ بیت اللہ شریف کا طواف فرما رہے تھے، طواف کرتے ہوئے آپ ﷺ نے بیت اللہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ

”اے بیت اللہ! تو کتنا عظیم ہے، تیری قدر و منزلت کتنی عظیم ہے کہ اس روئے زمین پر اللہ تعالیٰ نے تجھے اپنا گھر قرار دیا، تیری حرمت کتنی عظیم ہے۔ لیکن اے بیت اللہ! ایک چیز ایسی ہے جس کی حرمت تیری حرمت سے بھی زیادہ ہے، وہ ہے مسلمان کی جان، اس کا مال، اس کی آبرو“(۱)

اگر کوئی شخص ایسا سنگدل اور شقی القلب ہو کہ وہ بیت اللہ کو ڈھادے، العیاذ باللہ، تو ساری دنیا اس کو برا کہے گی کہ اس نے اللہ کے گھر کی کتنی بے حرمتی کی یہ، مگر سرکار دو عالم ﷺ فرما رہے ہیں کہ اگر کسی نے کسی مسلمان کی جان، مال، آبرو پر حملہ کر دیا، یا اس کا دل دکھایا دیا تو بیت اللہ کو ڈھانے سے زیادہ سنگین گناہ ہے۔ لیکن تم نے اس کو معمولی سمجھا ہوا ہے اور تم دوسرے کا مذاق اڑا رہے ہو، اور اس کی وجہ سے اس کا دل دکھا رہے ہو اور تم مزے لے رہے ہو؟ ارے یہ تم بیت اللہ کو ڈھا رہے ہو، اس کی حرمت کو پامال کر رہے ہو۔ لہٰذا کسی کو مذاق کا نشانہ بنا لینا اور اس کا استہزاء کرنا حرام ہے۔

بے جا مذاق نفرتیں پیدا کرتا ہے

اور یہ مذاق بھی ان چیزوں میں سے ہے جو دلوں کے اندر گرہیں ڈالنے والی ہیں اور دلوں کے اندر عداوتیں اور نفرتیں پیدا کر دیتی ہیں۔ اگر دوسرا تمہارے بارے میں یہ محسوس کرے کہ یہ میرا مذاق اڑاتا ہے، میری توہین کرتا ہے، تو بتاؤ کیا کبھی اس کے دل میں تمہاری محبت پیدا ہوگی؟ کبھی بھی محبت پیدا نہیں ہوگی، بلکہ اس کے دل میں تمہاری طرف سے نفرت پیدا ہوگی کہ یہ آدمی میرے ساتھ ایسا برتاؤ کرتا ہے اور پھر اس نفرت کے نتیجے میں آپس میں جھگڑا اور فساد پھیلے گا۔ البتہ اگر دوست واحباب یا عزیز و اقارب آپس میں ایسا مذاق کر رہے ہیں جس میں کسی کی دل آزاری نہیں ہے، جس میں جھوٹ نہیں ہے، تو شرعاً ایسے مذاق کی اجازت ہے، شریعت نے ایسے مذاق پر پابندی نہیں لگائی۔

---

(۱) شعب الإيمان، رقم: ٦٧٠٦ (٥/٢٩٦)، مصنف ابن ابی شيبة (٦/٤٠١)، مجمع الزوائد ومنبع الفوائد (١/٤٤)

وعدہ نبھانے کی عادت اپنائیں

اس حدیث میں تیسرا حکم یہ دیا کہ

((وَلَا تَعِدْهُ مَوْعِداً فَتُخْلِفَهُ))

''یعنی کوئی ایسا وعدہ نہ کریں جس کو تم پورا نہ کرسکو''

بلکہ جس سے جو وعدہ کیا ہے اس وعدہ کو پورا کریں، اس وعدہ کا ایفاء کریں، وعدہ کر کے پورا نہ کرنے کو حضور اقدس ﷺ نے نِفاق کی علامت قرار دیا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ فَهُوَ مُنَافِقٌ إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ))(۱)

منافق کی تین نشانیاں

تین باتیں جس شخص میں پائی جائیں، وہ خالص منافق ہے، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو وعدہ کی خلاف ورزی کرے، اور جب اس کے پاس امانت رکھوائی جائے تو وہ اس امانت میں خیانت کرے۔ یہ تین باتیں جس شخص میں پائی جائیں، وہ پکا منافق ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وعدہ کی خلاف ورزی نفاق کی علامت ہے، لہٰذا اگر تمہیں بھروسہ نہ ہو کہ میں وعدہ پورا کرسکوں گا، تو وعدہ مت کریں، لیکن جب ایک مرتبہ وعدہ کرلیں تو جب تک کوئی عذر شدید پیش نہ آجائے، اس وقت تک اس کی پابندی لازم ہے۔

بچوں سے کیا ہوا وعدہ بھی پورا کریں

حضور اقدس ﷺ نے یہاں تک فرمایا کہ بچوں سے بھی جو وعدہ کریں اس کو پورا کریں۔ روایت میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے ایک بچے کو بلاتے ہوئے کہا کہ میرے پاس آؤ، ہم تمہیں چیز دیں گے، حضور اقدس ﷺ نے ان سے پوچھا کہ کیا تمہارا واقعی اس کو کچھ دینے کا ارادہ تھا یا ویسے ہی اس کو بہلانے کے لیے کہہ دیا، ان صحابی نے فرمایا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میرے پاس کھجور ہے، وہ

(۱) سنن النسائی، کتاب الإیمان وشرائعه، باب علامة النفاق، رقم: ۴۹۳۷، مسند أحمد، رقم: ۱۰۵۰۴

دینے کا ارادہ تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تم ویسے ہی وعدہ کر لیتے اور کچھ دینے کا ارادہ نہ ہوتا تو تمہیں اس بچے کے ساتھ وعدہ خلافی کرنے کا گناہ ہوتا۔(۱)

اور بچے کے ساتھ وعدہ خلافی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تم نے بچے کو شروع سے یہ تعلیم دے دی کہ وعدہ خلافی کرنا کوئی بری بات نہیں ہے، اور تم نے پہلے دن سے ہی اس کی تربیت خراب کر دی۔ لہٰذا بچوں کے ساتھ وعدہ خلافی نہیں کرنی چاہیے، بچوں کے ساتھ بھی جو وعدہ کیا ہے، اس کو پورا کریں۔

اور بعض وعدہ خلافیاں تو ایسی ہوتی ہیں کہ آدمی یہ سمجھتا ہے کہ میں نے فلاں کے ساتھ وعدہ کیا ہوا ہے، مجھے اس کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن بعض وعدہ خلافیاں ایسی ہوتی ہیں جن کی طرف ہم لوگوں کا دھیان ہی نہیں جاتا کہ وہ بھی کوئی وعدہ خلافی ہے۔

اصول وضوابط کی پابندی نہ کرنا وعدہ خلافی ہے

مثلاً ہر ادارے کے اپنے کچھ قواعد وضوابط ہوتے ہیں، چنانچہ جب ہم کسی ادارے میں ملازمت اختیار کرتے ہیں تو اس ادارے کے ساتھ منسلک ہوتے وقت ہم عملاً یہ وعدہ کرتے ہیں کہ اس ادارے کے قواعد وضوابط کی پابندی کریں گے۔ یا مثلاً آپ نے پڑھنے کے لیے دارالعلوم میں داخلہ لے لیا، تو داخلہ لیتے وقت طالب علم سے ایک تحریری وعدہ بھی لیا جاتا ہے کہ میں یہ یہ کام نہیں کروں گا اور یہ یہ کام کروں گا اور اگر کسی طالب علم سے تحریر وعدہ نہ بھی لیا جائے تب بھی داخل ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ یہ اقرار کر رہا ہے کہ دارالعلوم کے جو قواعد وضوابط ہیں میں ان کی پابندی کروں گا اب اگر کوئی طالب علم ان قواعد وضوابط کی خلاف ورزی کرے گا تو یہ اس وعدہ کی خلاف ورزی ہوگی اور یہ عمل ناجائز اور گناہ ہوگا۔

جو قوانین شریعت کے خلاف نہ ہوں ان کی پابندی لازم ہے

اسی طرح جو آدمی کسی ملک کی شہریت اختیار کرتا ہے تو وہ شخص عملاً اس ملک کے ساتھ یہ معاہدہ کرتا ہے کہ میں اس ملک کے قوانین کی پابندی کروں گا تاوقتیکہ کوئی قانون مجھے کسی خلاف شرع امر پر مجبور نہ کرے۔ اگر کوئی قانون ایسا ہے جو شریعت کے خلاف کام کرنے پر مجبور کرتا ہے تو اس کے

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في التشديد في الكذب، رقم: ٤٣٣٩، مسند أحمد، رقم: ١٥١٤٧

بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمادیا:

((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ))(۱)

''یعنی خالق کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت نہیں ہے''

اگر کسی کام سے شریعت تمہیں روک دے تو پھر اس کام کے کرنے کو خواہ کوئی بادشاہ کہے، یا کوئی صدر یا وزیر اعظم کہے، یا کوئی قانون اس کام کا حکم دے، لیکن تم اس حکم کے ماننے کے پابند نہیں ہو، بلکہ تم اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے کے پابند ہو۔

قوانین کی خلاف ورزی وعدہ خلافی ہے

لہٰذا اگر کوئی آپ کو گناہ پر مجبور نہیں کر رہا ہے، بلکہ مباحات سے متعلق کوئی قانون بنا ہوا ہے تو اس صورت میں ہر شہری چاہے وہ مسلمان ہو، یا غیر مسلم ہو، اپنی حکومت سے یہ معاہدہ کرتا ہے کہ میں قوانین کی پابندی کروں گا، اب اگر کوئی شخص بلا عذر قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے تو یہ بھی وعدہ خلافی میں داخل ہے۔

ٹریفک کے قوانین کی پابندی کریں

مثلاً ٹریفک کے قوانین ہیں کہ جب سرخ بتی جلے تو رک جاؤ اور جب سبز بتی جلے تو چل پڑو۔ اس قانون کی پابندی شرعاً بھی ضروری ہے، اس لیے کہ تم نے وعدہ کیا ہوا ہے کہ میں اس ملک کے قوانین کی پابندی کروں گا۔ اگر تم اس قانون کو روندتے ہوئے گزر جاتے ہو تو اس صورت میں وعدہ خلافی کے گناہ کے مرتکب ہوتے ہو اور عہد شکنی کے گناہ کے مرتکب ہوتے ہو، چاہے وہ مسلم ملک ہو یا غیر مسلم ملک ہو۔

بے روزگاری الاؤنس وصول کرنا

برطانیہ کی حکومت ایک بے روزگاری الاؤنس جاری کرتی ہے، یعنی جو لوگ بے روزگار ہوتے ہیں ان کو ایک الاؤنس دیا جاتا ہے، گویا کہ روزگار ملنے تک حکومت ان کی کفالت کرتی ہے۔ یہ ایک اچھا طریقہ ہے۔ لیکن ہمارے بعض بھائی جو یہاں سے وہاں گئے ہیں، انہوں نے اس بے روزگاری کو اپنا پیشہ بنا رکھا ہے، اب ایسے لوگ رات کو چوری چھپے نوکری کر لیتے ہیں اور ساتھ میں بے

---

(۱) مسند أحمد بن حنبل، رقم: ۱۰۴۱

روزگاری الاؤنس بھی وصول کرتے ہیں، اچھے خاصے نمازی اور دیندار لوگ یہ دھندا کر رہے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے مجھ سے اس کے بارے میں مسئلہ پوچھا تو میں نے بتایا کہ یہ عمل تو بالکل ناجائز اور گناہ ہے اول تو یہ جھوٹ ہے کہ بے روزگار نہیں ہو لیکن اپنے کو بے روزگار ظاہر کر رہے ہو، دوسرے یہ کہ تم حکومت کے قانون کی خلاف ورزی کر رہے ہو، کیونکہ جب تم اس ملک میں داخل ہو گئے تو اب اس ملک کے جائز قانون کی پابندی لازم ہے۔ ان صاحب نے جواب میں کہا کہ یہ تو غیر مسلم حکومت ہے اور غیر مسلم حکومت کا پیسہ جس طرح بھی حاصل ہو، اس کو لے کر خرچ کرنا جائز ہے۔ العیاذ باللہ۔ ارے بھائی! جب تم اس ملک میں داخل ہوئے تھے اس وقت تم نے یہ وعدہ کیا تھا کہ ہم اس ملک کے قوانین کی پابندی کریں گے، لہٰذا اب اس ملک کے قانون کی خلاف ورزی کرنا جائز نہیں، اور جس طرح مسلمان کے ساتھ خلاف ورزی جائز نہیں، کافروں کے ساتھ بھی وعدہ خلافی جائز نہیں، اور اس خلاف ورزی کے نتیجے میں جو پیسہ حاصل ہوگا وہ بھی ناجائز اور حرام ہوگا۔

خلاصہ

بہرحال جھگڑے کا ایک بہت بڑا سبب یہ وعدہ خلافی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو سرکار دو عالم ﷺ کے ان احکام پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

☆☆☆

خاندانی اختلافات کا چھٹا حل

جھوٹ سے پرہیز ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

گزشتہ چند ہفتوں سے خاندانی اختلافات کے مختلف اسباب کا بیان چل رہا ہے، ان اسباب میں سے ایک سبب وہ ہے جو حضور اقدس ﷺ نے اس حدیث میں بیان فرمایا ہے، وہ حدیث یہ ہے:

حضرت سفیان بن اُسید حضرمی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے حضرت اقدس ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((کَبُرَتْ خِیَانَۃً اَنْ تُحَدِّثَ أَخَاکَ حَدِیْثًا ھُوَ لَکَ بِہٖ مُصَدِّقٌ وَاَنْتَ لَہٗ بِہٖ کَاذِبٌ))(۱)

یہ بڑی ہی خیانت کی بات ہے کہ تم اپنے بھائی کو کوئی ایسی بات سناؤ جس کو وہ سمجھ رہا ہو کہ تم اس کو سچی بات بتا رہے ہو لیکن حقیقت میں تم اس کے سامنے جھوٹ بول رہے ہو۔ یہ وہ عمل ہے جس سے دلوں میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں، دلوں میں شگاف پڑ جاتے ہیں، اور عداوتیں کھڑی ہو جاتی ہیں، دشمنیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جھوٹ بولنا تو ہر حال میں بڑا زبردست گناہ ہے، لیکن اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ خاص طور پر اس جھوٹ کو بیان فرما رہے ہیں جہاں تمہارا مخاطب تم پر اعتماد کر رہا ہے، اور وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ یہ شخص جو بات مجھ سے کہے گا وہ سیدھی اور سچی بات کہے گا، لیکن تم الٹا اس کے اعتماد کو مجروح کرتے ہوئے اس کے ساتھ جھوٹ بولو۔ تمہارے اس عمل میں جھوٹ کا گناہ تو ہے ہی، ساتھ ہی اس میں خیانت کا بھی گناہ ہے۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۱/۳۰۳ تا ۳۲۰) بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد دار العلوم، کراچی

(۱) سنن أبي داؤد، کتاب الأدب، باب في المعاریض، رقم: ٤٣٣٠

وہ امانت دار ہے

اس لیے کہ جو شخص تم سے رجوع کر رہا ہے، وہ تمہیں امین اور سچا سمجھ کر رجوع کر رہا ہے، حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ))(۱)

''جس شخص سے مشورہ طلب کیا جائے وہ امانت دار ہوتا ہے''

گویا کہ مشورہ طلب کرنے والا اس کے پاس امانت رکھوائے ہوئے ہے کہ تم صحیح بات مجھے بتانا، اور اس پر اعتماد اور بھروسہ بھی کر رہا ہے، لیکن تم نے اس کے ساتھ جھوٹ بولا اور غلط بات بتائی، لہٰذا تم خیانت کے گناہ کے بھی مرتکب ہوئے۔

جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ

آج ہمارے معاشرے میں جتنی تصدیقات اور سرٹیفکیٹ جاری ہوتے ہیں، وہ سب اس حدیث کے تحت آتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص بیمار ہے اور اس کو اپنے محکمے سے چھٹی لینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس بات کا میڈیکل سرٹیفکیٹ پیش کرے کہ وہ واقعتاً بیمار ہے۔ تو اب جس ڈاکٹر سے سرٹیفکیٹ طلب کیا جائے گا، وہ امانت دار ہے کیونکہ وہ محکمہ اس ڈاکٹر پر بھروسہ اور اعتماد کر رہا ہے کہ یہ جو سرٹیفکیٹ جاری کرے گا، وہ سچا سرٹیفکیٹ جاری کرے گا، وہ شخص واقعی بیمار ہوگا تب ہی وہ سرٹیفکیٹ جاری کرے گا ورنہ جاری نہیں کرے گا۔ اب اگر وہ ڈاکٹر پیسے لے کر یا پیسے لیے بغیر صرف دوستی کی مد میں اس خیال سے کہ اس سرٹیفکیٹ کے ذریعہ اس کو چھٹی مل جائے، جھوٹا سرٹیفکیٹ جاری کر دے گا تو یہ ڈاکٹر جھوٹ کے گناہ کے ساتھ بڑی خیانت کا بھی مرتکب ہوگا۔ اور جو شخص ایسا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لیے ڈاکٹر کو مجبور کرے کہ وہ ایسا جھوٹا سرٹیفکیٹ جاری کر دے، ایسا شخص بے شمار گناہوں کا ارتکاب کر رہا ہے، ایک یہ کہ خود جھوٹ بھول رہا ہے اور دوسرے ڈاکٹر کو جھوٹ بولنے پر مجبور کر رہا ہے اور اگر پیسے دے کر یہ سرٹیفکیٹ حاصل کر رہا ہے تو رشوت دینے کے گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے، اور پھر جھوٹ بول کر جو چھٹی لے رہا ہے، وہ چھٹی بھی حرام ہے اور اس چھٹی کی جو تنخواہ لی ہے وہ تنخواہ بھی حرام ہے، اور اس تنخواہ سے جو کھانا کھایا وہ بھی حرام ہے، لہٰذا ایک جھوٹا

(۱) سنن الترمذي، كتاب الأدب عن رسول الله، باب إن المستشار مؤتمن، رقم: ٢٧٤٧، سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في المشورة، رقم: ٤٤٦٣، سنن ابن ماجه، كتاب الأدب، باب المستشار مؤتمن، رقم: ٣٧٣٥، مسند أحمد، رقم: ٢١٣٢٦

میڈیکل سرٹیفکیٹ جاری کرانے میں اتنے بے شمار گناہ جمع ہیں۔ العیاذ باللہ العظیم۔

آج ہمارا معاشرہ ان چیزوں سے بھرا ہوا ہے، اچھے خاصے پڑھے لکھے، دیندار، نمازی، متشرع لوگوں کو بھی جب ضرورت پڑتی ہے تو وہ بھی جھوٹا سرٹیفکیٹ نکلوانے میں کوئی شرم اور عار محسوس نہیں کرتے، اور اس چیز کو دین سے خارج ہی کر دیا ہے۔

مدارس کی بلا تحقیق تصدیق کرنا

اسی طرح مدرسوں کی تصدیق ہے، بہت سے مدارس کے حضرات میرے پاس بھی آتے ہیں کہ آپ ہمارے مدرسے کی تصدیق کر دیجیے کہ یہ مدرسہ قائم ہے اور ٹھیک کام کر رہا ہے، اگر اس میں چندہ دیا جائے گا تو چندہ صحیح مصرف میں استعمال ہوگا۔ یہ تصدیق ایک گواہی ہے، اب اگر کسی شخص نے یہ کہا کہ فلاں سے تصدیق کرا کر لاؤ، تب ہم تمہیں چندہ دیں گے، گویا کہ اس نے مجھ پر بھروسہ کیا، اب میرا یہ فرض ہے کہ میں اس وقت تک تصدیق جاری نہ کروں جب تک مجھے واقعتاً اس بات کا یقین نہ ہو کہ واقعتاً یہ مدرسہ اس چندہ کا مستحق ہے۔ اگر ایک شخص میرے پاس آئے اور میں محض دوستی یا مروت میں آکر تصدیق کر دوں، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ لوگ تو میرے اوپر بھروسہ کر رہے ہیں اور میں ان کے ساتھ جھوٹ بول رہا ہوں، کیونکہ میں نے اس مدرسہ کو دیکھا نہیں، میں اس کے حالات سے واقف نہیں، اس کے طریقہ کار سے میں باخبر نہیں، لیکن اس کے باوجود میں نے تصدیق نامہ جاری کر دیا، تو میں اس بدترین خیانت کا مرتکب ہوں گا۔ اب مدرسہ کے حضرات تصدیق کے لیے میرے پاس آتے ہیں، جب میں ان سے معذرت کرتا ہوں تو کہتے ہیں کہ ان سے اتنا چھوٹا سا کام نہیں کیا جاتا، وہ سمجھتے ہیں کہ انکار کرنا مروت کے خلاف ہے، حالانکہ حقیقت میں یہ شہادت ہے، اور حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ یہ بدترین خیانت ہے کہ لوگ تم پر بھروسہ کر کے تمہیں سچا سمجھ رہے ہیں اور تم ان کے سامنے جھوٹ بول رہے ہو۔

جھوٹا کیریکٹر سرٹیفکیٹ

آج کل مورل سرٹیفکیٹ اور کیریکٹر سرٹیفکیٹ بنوائے جاتے ہیں، اور سرٹیفکیٹ جاری کرنے والا اس میں لکھتا ہے کہ میں اس شخص کو پانچ سال سے جانتا ہوں یا دس سال سے جانتا ہوں، حالانکہ وہ اس کو صرف دو دن سے جانتا ہے، میں اس کے حالات سے واقف ہوں، یہ بہت اچھے اخلاق اور کردار کا مالک ہے۔ اب سرٹیفکیٹ جاری کرنے والا یہ سمجھ رہا ہے کہ میں اس شخص کے ساتھ بھلائی کر

رہا ہوں، لیکن اس کو یہ معلوم نہیں کہ اس بھلائی کے نتیجے میں قیامت کے روز گردن پکڑی جائے گی کہ تم نے تو یہ لکھا تھا کہ میں اس کو پانچ سال سے یا دس سال سے جانتا ہوں، حالانکہ تم اس کو نہیں جانتے تھے۔ یہ بدترین خیانت کے اندر داخل ہے، کیونکہ لوگ تم پر بھروسہ کر رہے ہیں اور تم لوگوں کے ساتھ جھوٹ بول رہے ہو۔

آج سرٹیفکیٹ کی کوئی قیمت نہیں

آج معاشرہ ان باتوں سے بھر گیا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج سرٹیفکیٹ کی بھی کوئی قیمت نہیں رہی، کیونکہ لوگ جانتے ہیں کہ یہ سب جھوٹے اور مصنوعی سرٹیفکیٹ ہیں۔ آج ہم نے سرکار دو عالم ﷺ کے ان ارشادات کو زندگی سے خارج ہی کر دیا ہے، اور صرف نماز روزے اور تسبیح کا نام دین رکھ دیا ہے، لیکن دنیا کی زندگی میں ہم لوگوں کے ساتھ کس طرح پیش آ رہے ہیں، اس طرف دھیان ہی نہیں ہے۔

جھوٹ نفرت پیدا کرتا ہے

یہ چیز بھی ہمارے آپس کے اختلافات اور جھگڑوں کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔ اس لیے کہ جب تم ایک آدمی پر بھروسہ اور اعتماد کر رہے ہو کہ یہ شخص تمہیں سچ بات بتائے گا، لیکن وہ شخص تم سے جھوٹ بولے، تو اس جھوٹ کے نتیجے میں اس کے دل میں تمہارے خلاف گرہ پڑ جائے گی کہ میں نے تو اس پر بھروسہ کیا، لیکن اس نے میرے ساتھ جھوٹ بولا، مجھے دھوکہ دیا اور مجھے غلط راستہ دکھایا۔ لہٰذا اس کے دل میں تمہارے خلاف عداوت پیدا ہوگی۔

بہرحال! باہمی اختلافات اور نااتفاقی کا ایک بہت بڑا سبب "جھوٹ" ہے، اگر اس جھوٹ کو ختم نہیں کریں گے تو آپس کی ناچاقیاں اور اختلافات کیسے ختم ہوں گے؟ اس لیے اس جھوٹ کو ختم کریں۔ ویسے تو ہر جھوٹ حرام ہے، لیکن خاص طور پر وہ جھوٹ جہاں پر دوسرا شخص تم پر بھروسہ کر رہا ہو اور تم اس کے ساتھ جھوٹ بولو، یہ بڑا خطرناک جھوٹ ہے۔

گزشتہ کی تلافی کیسے کریں؟

اب ایک سوال ذہنوں میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے آپس کے اختلافات اور نااتفاقی کے جو اسباب بیان فرمائے ہیں، اگر ہم آج ان سے پرہیز کرنے کا ارادہ کر لیں اور محنت کر

کے اپنے آپ کو اس کا پابند بنالیں تو ان شاء اللہ آئندہ کی زندگی تو درست ہو جائے گی، لیکن گزشتہ زمانہ میں اب تک ہم سے حضور اقدس ﷺ کی ان تعلیمات کی خلاف ورزی ہوئی، مثلاً کسی کی غیبت کرلی، کسی کو برا کہا، کسی کو دکھ پہنچایا، کسی کو تکلیف پہنچائی، کسی کی دل آزاری کی، اور ان خلاف ورزیوں کے نتیجے میں اور حقوق العباد کو ضائع کرنے کے نتیجے میں ہمارا نامہ اعمال سیاہ ہوگیا ہے، اس کا کیا حل ہے؟ اگر ہم اپنی پچھلی زندگی کی طرف نظر دوڑائیں تو یہ نظر آئے گا کہ سالہا سال میں نہ جانے کتنے انسانوں سے رابطہ ہوا، کتنے انسانوں سے تعلقات ہوئے، ہم نے کس کی کتنی حق تلفی کی؟ اس کا ہمارے پاس نہ کوئی حساب ہے، نہ پیمانہ ہے، اور نہ ان سے معافی مانگنے کی کوئی صورت ہے۔ لہٰذا اگر ہم آج سے اپنی اصلاح شروع کر بھی دیں تو پچھلے معاملات کا اور پچھلی زندگی کا کیا بنے گا؟ اور پچھلا حساب کتاب صاف کرنے کا کیا راستہ ہے؟ یہ بڑا اہم سوال ہے اور ہم سب کو اس کی فکر کرنے کی ضرورت ہے۔

حضور ﷺ کا معافی مانگنا

لیکن نبی کریم ﷺ پر قربان جایئے کہ آپ نے ہماری ہر مشکل کا حل اپنے اسوۂ حسنہ میں تجویز فرما دیا ہے۔ جو آدمی اپنی پچھلی زندگی کی اصلاح کرنا چاہتا ہو، اس کو خیال ہو کہ میں نے بہت سے اللہ کے بندوں کے حقوق ضائع کر دیئے ہیں، تو اس کا راستہ بھی نبی کریم ﷺ نے بتایا اور خود اس پر اس طرح عمل کر کے دکھایا کہ ایک دن آپ نے مسجد نبوی ﷺ میں کھڑے ہو کر عام صحابہ کے مجمع کے سامنے فرمایا:

> ’’میری ذات سے کبھی کسی انسان کو کوئی تکلیف پہنچی ہو، یا کبھی مجھ سے کوئی زیادتی ہوئی ہو، تو میں آج اپنے آپ کو اس کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ اگر وہ اس زیادتی کا بدلہ لینا چاہتا ہے تو میں بدلہ دینے کو تیار ہوں، اور اگر وہ مجھ سے کوئی صلہ طلب کرنا چاہتا ہے تو میں وہ دینے کے لیے تیار ہوں، اور اگر وہ معاف کرنا چاہتا ہے تو میری درخواست ہے کہ وہ معاف کر دے‘‘

حضور ﷺ کا اعلیٰ مقام

یہ اعلان اس ذات نے فرمایا جن کے بارے میں قرآن کریم نے فرمادیا:

﴿لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ﴾(۱)

---

(۱) الفتح: ۲

''تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کی سب اگلی پچھلی خطائیں معاف فرمادے''

اور جن کے بارے میں یہ فرمادیا:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾(۱)

''یعنی پروردگار کی قسم! لوگ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوسکتے جب تک وہ اپنے باہمی اختلافات میں آپ کو فیصل نہ بنائیں، اور پھر جو کچھ آپ فیصلہ کریں اس کے بارے میں وہ اپنے دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور سر تسلیم خم نہ کریں''

لہٰذا جس ذات کے بارے میں قرآن کریم میں یہ ارشادات نازل ہوئے ہوں اور جن کے بارے میں اس بات کی وضاحت آگئی ہو کہ آپ کی ذات سے کسی کو ظلم اور زیادتی پہنچ سکتی ہی نہیں، ان سب باتوں کے باوجود آپ ﷺ نے مسجد نبوی میں کھڑے ہو کر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے مندرجہ بالا اعلان فرمایا۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا انوکھا بدلہ

روایات میں آتا ہے کہ آپ ﷺ کا یہ اعلان سن کر ایک صحابی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوگئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں بدلہ لینا چاہتا ہوں، آپ ﷺ نے پوچھا کہ کیسا بدلہ؟ انہوں نے عرض کیا کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے میری کمر پر مارا تھا، میں اس کا بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ مجھے تو مارنا یاد نہیں ہے، لیکن اگر تمہیں یاد ہے تو آجاؤ اور بدلہ لے لو، چنانچہ وہ صحابی کمر کے پیچھے آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! جس وقت آپ ﷺ نے مجھے مارا تھا اس وقت میری کمر پر کپڑا نہیں تھا، بلکہ میری کمر ننگی تھی۔ سرکار دو عالم ﷺ نے اپنی چادر کمر سے ہٹ دی، تو مہر نبوت نظر آنے لگی، وہ صحابی آگے بڑھے اور مہر نبوت کو بوسہ دیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں نے مہر نبوت کو بوسہ دینے کے لیے یہ حیلہ اختیار کیا تھا۔ بہر حال! حضور اقدس ﷺ نے اپنے آپ کو پیش کر دیا کہ جو بدلہ لینا چاہے تو میں اس کو بدلہ دینے کو تیار ہوں۔

سب سے معافی تلافی کرالیں

اس عمل کے ذریعے حضور اقدس ﷺ نے امت کو سکھا دیا کہ جب میں یہ عمل کر رہا ہوں تو تم

---

(۱) النسآء: ٦٥

بھی اگر اپنی پچھلی زندگی کے داغ دھونا چاہتے ہو تو اپنے ملنے جلنے والوں، اپنے عزیز و اقارب، اپنے دوست احباب سے یہی پیش کش کریں کہ نہ جانے پچھلی زندگی میں مجھ سے آپ کی کیا حق تلفی ہوئی ہو، آج میں اس کا بدلہ دینے کو تیار ہوں، اور اگر آپ معاف کر دیں تو آپ کی مہربانی۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا معافی مانگنا

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے خاص طور پر ایک رسالہ اس موضوع پر لکھا اور اس رسالے کو شائع کیا اور پھر اپنے تمام ملنے جلنے والوں میں وہ رسالہ تقسیم کیا۔ اس رسالے کا نام ہے "العذر والنذر" اس رسالے میں یہی مضمون لکھا ہے کہ چونکہ میرے بہت سے لوگوں سے تعلقات رہے ہیں، نہ جانے مجھ پر کس کا حق ہو اور وہ حق مجھ سے پامال ہو گیا ہو، یا مجھ سے کوئی زیادتی ہوئی ہو، آج میں اپنے آپ کو پیش کرتا ہوں، اگر مجھ سے اس حق کا بدلہ لینا چاہتا ہے تو بدلہ لے لے، اگر کوئی مالی حق میرے ذمے واجب ہے وہ مجھے مالی حق یاد دلا دے، میں بدلہ دے دوں گا، یا کسی کو جانی تکلیف پہنچائی ہے تو اس کا بدلہ دینے کو تیار ہوں، ورنہ میں معافی کی درخواست پیش کرتا ہوں۔ اور ساتھ میں یہ حدیث بھی لکھ دی:

> "ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کوئی مسلمان دوسرے مسلمان سے سچے دل سے معافی مانگتا ہے کہ مجھے معاف کر دیجئے، مجھ سے غلطی ہو گئی، تو دوسرے مسلمان بھائی کا یہ فریضہ ہے کہ اس کو معاف کر دے، اگر وہ معاف نہیں کرے گا تو وہ آخرت میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے معافی کی امید نہ رکھے" (۱)

روپے پیسے کا معاملہ علیحدہ ہے، اگر دوسرے کے ذمہ روپے پیسے واجب ہیں تو اس کو حق ہے کہ اس کو وصول کر لے۔ لیکن دوسرے قسم کے حقوق، مثلاً کسی کی غیبت کر لی تھی، یا دل آزاری کر لی تھی، یا کوئی اور تکلیف پہنچائی تھی، اور تکلیف پہنچانے والا اب معافی مانگ رہا ہے تو دوسرے مسلمان کو چاہیے کہ وہ معاف کر دے۔

حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا معافی مانگنا

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ نے وفات سے تین سال پہلے جب پہلی مرتبہ دل کا دورہ پڑا، تو ہسپتال ہی میں مجھے بلا کر فرمایا کہ تم میری طرف سے ایسا ہی ایک

---

(۱) سنن أبي داؤد، باب في النهي عن البغي، رقم: ٤٩٠١

مضمون لکھ دو جیسے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے "العذر والنذر" میں اپنے اہل تعلق کو لکھا تھا، اور اس کا نام یہ رکھنا "کچھ تلافی مافات" اس میں لفظ "کچھ" سے اس طرف اشارہ فرمایا کہ اس کے ذریعہ یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں اپنے پچھلے سارے معاملات کی تلافی کر رہا ہوں، بلکہ یہ "کچھ" تلافی کر رہا ہوں۔ یہ مضمون لکھوانے کے بعد شائع فرمایا، اور اپنے تمام اہل تعلق کو خط کے ذریعے بھیجا تاکہ ان کی طرف سے معافی ہو جائے۔

اپنا کہا سنا معاف کرالیں

ہمارے بزرگوں نے ایک جملہ سکھایا ہے جو اکثر و بیشتر لوگوں کی زبان پر ہوتا ہے، یہ بڑا اچھا جملہ ہے، وہ یہ کہ جب کسی سے جدا ہوتے ہیں تو اس سے کہتے ہیں:

"بھائی! ہمارا کہا سنا معاف کر دینا"

یہ بڑا کام کا جملہ ہے اور اس میں بڑی عظیم حکمت کی بات ہے، اگرچہ لوگ اس کو بغیر سوچے سمجھے کہہ لیتے ہیں، لیکن حقیقت میں اس جملے میں اسی طرف اشارہ ہے کہ اس وقت ہم تم سے جدا ہو رہے ہیں، اب دوبارہ معلوم نہیں کہ ملاقات ہو یا نہ ہو، موقع ملے یا نہ ملے، لہٰذا میں نے تمہارے بارے میں کچھ کہا سنا ہو، یا تم پر کوئی زیادتی کی ہو، تو آج میں تم سے اس کی معافی مانگتا ہوں۔ لہٰذا سفر میں جاتے ہوئے اس کی عادت ڈالنی چاہیے کہ جن سے میل ملاقات رہتی ہو، ان سے یہ جملہ کہہ دینا چاہیے، جب دو سامنے والا! جواب میں یہ کہہ دے کہ میں نے معاف کر دیا تو ان شاء اللہ معافی ہو جائے گی۔

جن تک رسائی نہیں ان سے معافی کا طریقہ

معاف کرانے کا یہ طریقہ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے بارے میں بتایا جن تک رسائی ہو سکتی ہے، لیکن بہت سے اہل تعلقات ایسے ہوتے ہیں کہ ان تک رسائی ممکن نہیں، مثلاً ہم لوگ اکثر بسوں میں، ریلوں میں، ہوائی جہازوں میں سفر کرتے ہیں، اور ان سفروں میں نہ جانے کتنے لوگوں کو ہم سے تکلیف پہنچ گئی ہوگی، اب ہمیں نہ ان کا نام معلوم ہے اور نہ ہی ان کا پتہ معلوم ہے، اور اب ان تک پہنچ کر ان سے معافی مانگنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، ایسے لوگوں سے معافی مانگنے کا بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طریقہ بتا دیا جو انتہائی آسان ہے۔

ان کے لیے یہ دعا کریں

وہ یہ کہ حضور اقدس ﷺ نے ایسے لوگوں کے حق میں یہ دعا فرمادی:

((اَيُّمَا مُؤْمِنٍ اَوْ مُؤْمِنَةٍ آذَيْتُهُ اَوْشَتَمْتُهُ اَوْجَلَدْتُهُ اَوْلَعَنْتُهُ فَاجْعَلْهَا لَهُ صَلَاةً وَزَكٰوةً وَقُرْبَةً تُقَرِّبُهُ بِهَا اِلَيْكَ))(۱)

''یعنی اے اللہ! میری ذات سے کسی مؤمن مرد یا عورت کو کبھی کوئی تکلیف پہنچی ہو، یا میں نے کبھی کسی کو برا بھلا کہا ہو، یا میں نے کبھی کسی کو مارا ہو، یا کبھی کسی کو لعنت کی ہو، یا کبھی اس کے حق میں بددعا کی ہو، تو اے اللہ! میرے ان سارے اعمال کو اس شخص کے حق میں رحمت بنا دیجیے، اور اس کو اس کے پاک ہونے کا ذریعہ بنا دیجیے اور میرے اس عمل کے نتیجے میں اس کو اپنا قرب عطا فرما دیجیے''

لہٰذا بزرگوں نے فرمایا کہ جن تک آپ نہیں پہنچ سکتے اور جن سے معافی مانگنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، ان کے حق میں یہ دعا کر دیں۔ کیونکہ جب آپ کی پہنچائی ہوئی تکلیف ان کے حق میں رحمت بن جائے گی تو ان شاء اللہ خود ہی معاف کر دیں گے۔ اور ان کے حق میں ایصال ثواب کریں۔

زندہ کو ایصال ثواب

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ایصال ثواب صرف مردوں کو ہو سکتا ہے جو دنیا سے جا چکے، زندوں کو نہیں ہو سکتا، یہ خیال غلط ہے، ایصال ثواب تو زندہ آدمی کو بھی کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا عبادت کر کے، تلاوت کر کے اس کا ثواب ایسے لوگوں کو پہنچا دو جن کو آپ کی ذات سے کبھی کوئی تکلیف پہنچی ہو، اس کے نتیجے میں تم نے اس کے ساتھ جو زیادتی کی ہے ان شاء اللہ اس کی تلافی ہو جائے گی۔

عمومی دعا کر لیں

اس کے علاوہ ایک عمومی دعا یہ کر لو کہ یا اللہ! جس جس شخص کو مجھ سے تکلیف پہنچی ہو، اور جس جس شخص کی مجھ سے حق تلفی ہوئی ہو، اے اللہ! اپنے فضل سے اس پر اپنی رحمتیں نازل فرمائیے اور میرے اس عمل کو اس کے لیے رحمت کا ذریعہ بنا دیجیے اور اس کو مجھ سے راضی کر دیجیے، اور اس کے دل کو میری طرف سے صاف کر دیجیے تاکہ وہ مجھے معاف کر دے۔

(۱) سنن الدارمی، کتاب الرقاق، باب فی قول النبی أیما رجل لعنته أوسببته، رقم: ۲٦٤٧، مسند أحمد، رقم: ۷۸٥۲

ایک غلط خیال کی تردید

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک وعظ میں یہ دعا والی حدیث بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا کہ اس سے کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے گناہ کرنے والوں کو لعنت کی ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا:

((لَعَنَ اللّٰهُ الرَّاشِيَ وَالْمُرْتَشِيَ))(۱)

''اللہ تعالیٰ رشوت لینے والے اور رشوت دینے والے پر لعنت کرے''

اب یہ حدیث سن کر رشوت دینے والا یا لینے والا اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ لعنت میرے حق میں دعا بن جائے گی، اس لیے کہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمادی ہے کہ اے اللہ! میں نے جس جس کو لعنت کی ہے وہ لعنت اس کو دعا بن کر لگے۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ دعا کی حدیث کے شروع میں یہ الفاظ بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے:

((اِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ أَغْضِبُ كَمَا يَغْضِبُ الْبَشَرُ))(۲)

''اے اللہ! میں تو ایک انسان ہوں اور جس طرح اور انسانوں کو غصہ آجاتا ہے اسی طرح مجھے بھی غصہ آجاتا ہے''

اس غصے کے نتیجے میں اگر کبھی میں نے کسی کو کوئی تکلیف پہنچائی ہو یا لعنت کی ہو یا برا بھلا کہا ہو، تو اس کو اس کے حق میں دعا بنا کر لگا دیجئے۔

لہٰذا یہ حدیث اس لعنت کے بارے میں ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ کی حالت میں بشری تقاضے سے کسی پر لعنت کی ہو، ایسی لعنت اس کے حق میں دعا بن کر لگے۔ لیکن اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی شخص پر گناہ کی وجہ سے لعنت کی ہو، یا دین اور شریعت کے تقاضے سے لعنت کی ہو، تو یہ دعا والی حدیث اس لعنت کے بارے میں نہیں ہے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

☆☆☆

---

(۱) مسند أحمد، رقم: ٨٦٦٢

(۲) صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب من لعنه النبيُّ أوسبه أودعاعليه......، رقم: ٤٧٠٨، مسند أحمد، رقم: ٧٠١٠

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کرسکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خُطبات وتحریرات

جلد ۱

اسلامی عقائد

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور
فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۴۷۸۵

★ ۱۹۰، انار کلی، لاہور، پاکستان
فون ۳۷۲۲۳۹۹۱، ۳۷۳۵۳۲۵۵

★ موہن روڈ، چوک اُردو بازار، کراچی
فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

ہماری روز مرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خُطبات وتحریرات

جلد ٦

اصلاح وتصوّف

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا مُحمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز بک سیلرز ایکسپورٹرز

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور
فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۴۷۸۵

★ ۱۹۰ انارکلی، لاہور پاکستان
فون ۳۷۲۲۳۹۹۱، ۳۷۳۵۳۲۵۵

★ موہن روڈ چوک اُردو بازار، کراچی
فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خُطبات وتحریرات

جلد ۷

اسلامی زندگی کے سنہری آداب

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا مُحمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور
فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۴۷۸۵

★ ۱۹۰، انار کلی، لاہور، پاکستان
فون ۳۷۲۴۳۹۹۱، ۳۷۳۵۳۲۵۵

★ موہن روڈ، چوک اُردو بازار، کراچی
فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کرسکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات وتحریرات

جلد ۸

اخلاق سیئہ اور ان کی اصلاح

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور
فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۴۲۸۵

★ ۱۹۰ انارکلی، لاہور پاکستان
فون ۳۷۲۴۳۹۹۱، ۳۷۳۵۳۲۵۵

★ موہن روڈ چوک اُردو بازار، کراچی
فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات وتحریرات

جلد ۹

اخلاق حسنہ اور ان کے فضائل

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات پبلشرز، بکسیلرز، ایکسپورٹرز

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور ★ ۱۹۰، انار کلی، لاہور، پاکستان ★ موہن روڈ، چوک اُردو بازار، کراچی

فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۴۷۸۵ فون ۳۷۲۴۳۹۹۱، ۳۷۳۵۳۲۵۵ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خُطبات وتحریرات

جلد ۱۰

روزمرہ کی سُنتیں اور اعمال

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور
فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۴۷۸۵

★ ۱۹۰ انارکلی، لاہور پاکستان
فون ۳۷۲۲۳۹۹۱، ۳۷۳۵۳۲۵۵

★ موہن روڈ چوک اردو بازار، کراچی
فون ۳۲۷۲۲۴۰۱